

سفر کی شام

فرحت اشتیاق

افتساب!

اپنی مرحومہ نانی قمر النساء کے نام!

جو مجھے لکھتا دیکھ کر، میری تحریریں، میری کتابیں
شائع ہوتی دیکھ کر بے انتہا خوش ہوا کرتی تھیں۔
فخریہ ہر ایک کو بتایا کرتی تھیں کہ اُن کی نواسی ایک
مصنفہ ہے۔

Nani! I miss you a lot.

پیش لفظ

کہانیاں سوچنا اور لکھنا میرے لیے ایسا ہی ہے جیسے سانس لینا، بھوک لگنا، پیاس لگنا..... میں نے پہلی کہانی کب سوچی تھی مجھے یاد نہیں، ہاں اپنا بچپن جہاں سے یاد ہے وہاں پر میں خود کو کہانیاں سوچتا، کہانیاں بچپانی پاتی ہوں۔ اندر سے ایک شدید خواہش ابھرتی ہے لکھنے کی۔ کردار، مکالمے، منظر، کہانی یہ سب میرے پاس آ کر شور مچاتے ہیں، مجھ سے خود کو نکھواتے ہیں۔ تخلیق کے عمل کے دوران میرے کردار مجھ سے اتنے نزدیک ہو جاتے ہیں کہ میں اُن کے غم پر روتی بھی ہوں اور اُن کی خوشیوں پر بے ساختہ ہنسی بھی ہوں۔ اور پھر جب آپ قارئین میرے لکھے ہوئے لفظوں کو سراہتے ہیں تو میں اندر تک سرشار ہو جاتی ہوں، خود کو بہت امیر محسوس کرتی ہوں۔ آپ کی یہ قدر افزائی اور محبت میرے لیے بے حد قیمتی ہے۔ جن محبتوں سے آپ قارئین نے مجھے مالا مال کر رکھا ہے اُن کے لیے میں آپ سب کا تہہ دل سے شکر یہ ادا کرتی ہوں۔

کسی بھی کتاب کو کامیاب بنانے کے لئے جتنی کوشش رائٹر کو کرنی پڑتی ہے۔ اتنی ہی کوشش پبلشر کو کرنی پڑتی ہے۔ میری کتابوں کے حقوق اشاعت حاصل کرنے کے بعد علم و عرفان پبلشرز نے اس ذمہ داری کو میری توقعات سے زیادہ بہتر طور پر ادا کیا ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قارئین میری اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

فرحت اشتیاق

سفر کی شام

وہ سولہ فروری کی ایک خوبصورت دوپہر تھی اور اس دوپہر وہ آفس سے تلخ نام ہی میں نکل آئی تھی۔ اس کی پہلی منزل بیوٹی پارک تھی، جہاں اسے اپنے بالوں کی کٹنگ کروانی تھی۔ پارک میں زیادہ دیر نہ رکھنے کا اس کے پاس وقت نہیں تھا، اسی لئے فیض کے ارادے کو اس نے ملتوی کر کے گھر پر خود ہی کٹیرنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بال بچھلے دو ماہ سے توجہ چاہ رہے تھے اور وہ وقت نہ ملنے کے سبب اسے ٹالے چلی جا رہی تھی۔ حیرت بھی دو تین بار اسے ٹوک چکا تھا۔ سولہ فروری کا دن اس کی زندگی کا سب سے اہم ترین دن تھا اور اس دن وہ بہت اچھی لگنا چاہتی تھی، اسی لئے بیوٹی پارک جانے کے ارادے کو وہ اس دن تک مانتی رہی تھی۔

پارک سے فارغ ہونے کے بعد اسے کچھ خریداری کرنا تھی، چند ایک تو گھر کے روزمرہ استعمال کی اشیاء تھیں، خاص طور پر اسے پائین اپنی کاٹن پیک اور فریش کریم خریدنی تھی۔ باقی کیک بنانے کے تمام لوازمات گھر پر موجود تھے۔ سرخ گلابوں کا ایک خوبصورت سا گلہ مست خرید کر اس نے اپنی خریداری مکمل کی اور پھر اپنے اپارٹمنٹ کا رخ کیا۔ ان کا اپارٹمنٹ تیسری منزل پر تھا۔ اس پش علاقے میں دو کمروں کے اس اپارٹمنٹ کا انہیں اتنا کرایہ دینا پڑ رہا تھا جتنا کسی ٹیڈ کلاس علاقے میں چار پانچ کمروں کے مکان کا بھی نہیں ہوگا۔ لفٹ میں اس کی مسز پائین سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے ہائے ہیلو کے فوراً بعد بے ساختہ اس کے مہر سائل کی تعریف کی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ان کی تعریف کا شکر یہ ادا کیا اور لفٹ سے نکل آئی۔ اپنی تعریف انسان کو ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہے۔ اسے بھی لگی تھی مگر یہ وہ تعریف نہیں تھی جس کا اسے بے چینی و بے صبری سے انتظار تھا، جس کے لئے آج وہ بہت اچھی لگن چاہتی تھی، اسی کے منہ سے اپنی بے تحاشا تعریفیں بھی سننا چاہتی تھی۔

اپارٹمنٹ کے اندر آتے ہی اس نے شبی رفقار سے اپنا کام شروع کیا۔ جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر کیک بنانے کی تیاری شروع کی۔ کیک کی تیاری کے دوران ہی اس نے اپنے لئے ایک چیز سینڈویچ بنایا اور پختہ پھرے اسے کھا کر بچ کر لیا۔ کیک اودن میں رکھنے کے بعد اس نے پہلے ہی سے صاف کمر کو مزید صاف کرنا شروع کیا۔ اس کے گھر کی صفائی، نظافت اور سجاوٹ کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ اس گھر کی مالکن ایک ورگن و من ہے جو صبح

آٹھ بجے گھر سے نکل کر شام چھ بجے گھر واپس آتی ہے۔ اس کام کو نفا کر وہ ایک مرتبہ پھر پورے انتہاک سے ٹیک کی جانب متوجہ ہوئی۔

حمبر کی دایب کا کچھ چا نہیں تھا۔ اگر کسی مینٹک میں یا کسی اور جگہ مصروف نہ ہو گیا تو وہ آٹھ بجے گھر واپس آ جاتا تھا مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ اور اگر آج کا دن اسے یاد نہیں تھا تو پھر جو جلدی دایب کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ پچھلے سال کے تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے قوی امید یہی تھی کہ اسے یاد نہیں ہوگا، اگرچہ کچھ اس نے تصدا حمبر سے ”آج کیا تاریخ ہے؟“ پوچھا تھا اور اس نے اپنی شرت کے نشی بند کرتے ہوئے فوراً جواب میں اسے تاریخ بتادی تھی۔ اسے یاد تھا یا نہیں، وہ وقت پر گھر واپس آ رہا تھا یا نہیں، بہر حال اسے تو اپنی تیار کی مکمل کھانجھی۔

ڈانک نیبل پر رکے گھلان میں اس نے اپنے خریہ کر لائے ہوئے تازہ سرخ گلاب سجاے۔ پورے اپارٹمنٹ میں ایئر فریئر پھرے کیا۔

حمبر کے لئے تختہ اس نے کافی دن پہلے ہی خرید لیا تھا۔ وہ کوئی بھی معمولی چیز استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس کے معیار کے حساب سے یہ اپنا جتنی قیمتی رستہ واضح خریدنے میں اس کی تمام تر بچت اور اس جیبے کی پوری خواہ ٹھکانے لگ گئی تھی مگر پھر بھی وہ بہت خوش تھی۔ اگر وہ کوئی کام ہی گھڑی اپنے ختے میں دیتی تو بخوشی قبول تو وہ اسے بھی کر لیتا، اس کا دل رکھنے کی خاطر دو تین بار پہن بھی لیتا اور پھر اس کے بعد واپس اپنی پرانی جینز گھڑی آ جاتا اور وہ اپنی امیدیں چاہتی تھی۔ کہ ریٹنگ کارڈ لکھنے کے بعد اس نے گھڑی کا کپس اور کارڈ اپنی ڈریسنگ نیبل پر بھی رکھ دیا اور پھر اپنی تیار کی خوراک کی۔

سباز رنگ کی ٹیڈ کی ساڑھی اس کے نازک سراپے پر بہت سج رہی تھی۔ ساڑھی کے پلو پر سلور رنگن اور موتیرن کا پائیز کام بنایا ہوا تھا۔ اس کام کی مناسبت سے اس نے حمبر کی بھاری سلور پہلی۔ خوب اہتمام سے بھر پور میک اپ کیا، بیکر ڈوٹس اور بھگتے دوڑے لپ اسٹک لگائے ہی کاؤت مل پاتا تھا۔ آئی لائزر، سکرا اور آئی شیڈ کے بعد اس کی خوبصورت براؤن آنکھیں مزید خوبصورت اور دلکش لگنے لگی تھیں۔ پروف لگائے کے بعد اس نے خود پر ایک آخری نگہ ڈالی اور پھر مطمئن ہوتے ہوئے ڈریسنگ نیبل کے سامنے سے مٹ گئی۔ وہ آج اسے اس روپ میں دیکھ کر کیا کہے گا؟ کتنے دنوں بعد وہ اسے انجام سے تیار ہوئی ہے۔

”حوی! جلدی گھر آ جاؤ۔“ اس کی تشریفیں سننے کی اسے بہت چٹائی تھی وقت گزرتا رہا مشکل ہوا تھا۔ اپنے بیلہ روم میں بیٹنی سے ادھر سے ادھر ٹپتے ہوئے وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ساڑھے سات بجے ہی اس کے صبر کا پتا نہ لہر بڑھ گیا اور اس نے اس کے موہاں پر کال کر ڈالی۔

”حوی! آتم کہاں ہو؟“ اس کی کال رسیڈر کرتی ہی وہ سلام دعا کے بغیر بے صبری سے ہوئی۔

”مائی سوپٹ وانک! میں اس وقت اورسلان صاحب کے ساتھ اسکوٹش کھیل رہا ہوں اور آج انہیں ہراے بغیر گھر واپس نہیں آؤں گا۔“ وہ ہنستے ہوئے جواب دیا پھر جیسے ایک دم ہی اس کے بے صبری سے پھر پورے ہٹلے پر دھیان گیا تو چونک کر پوچھنے لگا۔

”خبر خیرت تو ہے، کوئی پارلمنٹ ہے کیا؟“

”میری سب سے بڑی پارلمنٹ ہے کہ اس وقت میرے شوہر صاحب کو گھر سے پاس موجود ہونا چاہیے اور وہ نہیں ہیں۔ میں تمہارے اسکوٹش و سکوٹش کو بالکل نہیں جانتی، بس تم فوراً گھر واپس آ رہے ہو۔“ وہ انیسویں صدی کی ایک ماڈرن لڑکی ہونے کے باوجود اندر سے ایک مکمل مشرقی بیوی تھی۔ شوہر کی ہاں میں ہاں ملانے والی، اس کے کئے کئے فیصلوں کو بغیر کسی اعتراض کے قبول کرنے اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے والی۔ پر آج کی اپنی ایاگرا کو شام کو وہ ضائع ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی، اسی لیے پل من مانی کرنے والے انداز میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

”ماہا! میں اس طرح مکمل ادھر اورا چھوڑ کر واپس نہیں آ سکتا۔ یہ غم ختم کرلوں پھر میں فوراً گھر آ جاتا ہوں، اوکے۔“ اس کے غیر معمولی مندی لیے نے اس سے مکمل جلدی غم کر لینے اور گھر واپس آنے کا وعدہ کر دیا تھا، درود وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ ارسلان ایاز سے دوستی حمبر کے لئے نکلتی اہم ہے۔ وہ ایک بے مثال اور شاندار کیئر تیار رکھنے والے سینئر ڈکٹر تھے۔ اسکوٹش کے حوالے سے ہی حمبر کی ان سے دوستی ہوئی تھی اور حمبر اس دوستی کو برکمن حد تک آگے لے جاتا جاتا تھا۔ انٹر نیٹس میں تین یا چار مرتبہ اورسلان ایاز کے ساتھ اسکوٹش کھیلنے چلا جاتا تھا۔ فون پر بات کر لینے کے بعد جہاں یہ ٹیلی فون تھی کہ وہ مکمل غم کر کے جلدی گھر واپس آ رہا ہے، وہیں یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ مسٹر ہلکو ایک مرتبہ پھر اپنی ویڈیو انڈریس ہو چول گئے ہیں۔ بجائے اس سے تھا ہونے کے اس کے لوں پر شکراہٹ دوڑ گئی۔

وہ دونوں بعض معاملات میں ایک دوسرے سے کتنے مختلف تھے۔ وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں، چھوٹی چھوٹی باتوں کو یاد رکھنے والی اور وہ اس سب کو قبول جاتے والا، لیکن جب درمیان میں محبت ہوتی ہے پھر کسی بھی فرق کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ وہ دونوں کو یاد نہیں رکھتا تو کیا ہوا، وہ اس سے محبت تو بے پناہ کرتا ہے۔ اس کا لگہ دیوار پر فریم میں جڑی اپنی شادی کے دن کی تصویر پر لگی۔ وہ اور حمبر دونوں ساتھ، سگماتے ہوئے۔ سولہ فروری کے دن ٹھیک دو سال پہلے حمبر رضا اس کی زندگی میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوش اور بھی ختم نہ ہونے والی ہنس کی بردار دل ہوا تھا۔ وہ اس کی زندگی کا سب سے اہم شخص تھا، جس کے بغیر زندگی نہ رہنے کا وہ تصور تک نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنے ختے سے سوتے جاتے ہر مل اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے خوابوں پر وہ بول بھلیا تھا کہ اسے اس کے سوادنا میں کسی اور شے کی کوئی کمی محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے سر پر باپ کی محبت و شفقت پھر ہی چھاؤں نہیں، بہن، بھائیوں کا بیچارا ساتھ نہیں اور ماں..... وہ ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس نہیں۔ تو کیا ہوا، وہ ایک غم خیز حمبر رضا تو تھا تاں اس کے پاس، ہر دم اس کے ساتھ۔ زندگی سے کبھی کوئی شکوے اگر رہے بھی تھے تو وہ سال پہلے حمبر رضا کے ساتھ اس پیار بھری جڑی زندگی کی شروعات کرنے کے بعد ہمیشہ ہیٹھ کے لئے ختم ہو گئے تھے۔

☆☆☆

وہ حمبر رضا سے پہلی بار ڈاکٹر اجازت شد کے آفس میں ملی تھی۔ پہلی بار یوں کہ اس روز پہلی مرتبہ اس کی اس سے گفتگو ہوئی تھی، ورنہ سرسری سا چاٹ تو وہ اسے پہلے ہی تھی۔ جب وہ ایم این اے کرنے کے لئے آئی لی اسے میں داخل ہوئی حمبر رضا وہاں سے پاس آؤت کرنے والا تھا۔ وہ اپنے سچ کے ٹاپ فٹری سلوڈن میں سے ایک تھا اور ان دنوں وہ انٹیلیٹ میں اس حوالے سے کافی مشہور ہو گیا تھا کہ اس نے آخری سیکٹر کے دوران ہی اسے تین بہت

نے چونک کر اسے دیکھا، وہ اس کی فائل پر کچھ لکھتے ہیں اس طرح مصروف تھا جیسے یہ سوال پوچھی سرسری سے انداز میں بنگلوں کے برائے بنگلوں کے طور پر پوچھا ہوا۔

"اپنے گھر میں..." اس کا دل بھی جواب دینے کو چاہا تھا۔ اس نے سنجیدگی سے اپنی رہائش کے حلقے بتا دیے۔ وہ اب وہاں سے اٹھنا چاہ رہی تھی۔

"آپ کے والد کی بات کرتے ہیں؟" کچھ دیر کام کی بات کرنے کے بعد پھر ایک غیر متعلقہ سوال اس سے پوچھا گیا تھا۔ وہ ہانکے نہیں تھی جو ان سوالات کا مقصد سمجھ پاتی۔ اسے اندر ہی اندر اس بندے کا خود اعتمادی سے بھرپور ذاتیات کی طرف اسے والا یہ انداز بہت برا بھی لگا تھا مگر وہ براہ راست اپنی ناگواری کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔

"ان کی ڈیوٹی ہو چکی ہے۔"

"اور..." وہ ایک لمبی لمبا ہانکے کاغذ پوچھا اس کی طرف دیکھ کر یوں "آتم دیری سواری..." اب اس سے پہلے کہ وہ اس کی کی اور بین بھائیوں کی طرف آتا وہ وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی۔

"آپ کا بہت شکر ہے آپ نے بہت ساری انعامیں مجھے دیں..." اسے مزید کوئی فقرہ بولنے کا موقع دینے بغیر وہ "اللہ حافظ" کہتی ڈاکٹر اعجاز کے آفس سے باہر نکل آئی تھی۔ اس واقعہ کا ذکر کسی اور سے تو کیا، اس نے کلثوم عدنان بھی اپنی خرمی دوست تک سے نہیں کیا تھا۔

گھر کے روز جیسے ہی وہ انٹینیٹیٹ پہنچی وہ بندہ ایک مرتبہ پھر اس کے سامنے آ گیا اور تب کو بڑے در میں طوٹی وغیرہ کے گروپ کے ساتھ کڑی کلثوم اور مرنے سے بھی اسے اس سے بات کرتے دیکھ گیا تھا۔

"السلام علیکم..." اس نے اپنے لیے بھی سہل کے برخلاف حتیٰ اور دکھائی مثال کر لیا تھا۔

"نیکس ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں، آپ صرف میری خبریت معلوم کرنے میں صبح کیسے آئے ہیں؟" اس کے قدرے بدلی ہوئی کے منظر سے ہونے جواب پر وہ موقوف ہوا جانے والے انداز میں بے ساختہ چلا۔

"بینک اسٹوڈنٹ فورم نے آج یہاں ایک سیمینار ارجٹ کیا ہے میں وہ اینڈ کرنے آ گیا ہوں..." وہ جلد بازی میں منہ سے نکل جانے والے اس فقرے پر دل ہی دل میں بری طرح شرمندہ ہوئی اور وہ اس کی شرمندگی کو محسوس کرتے ہوئے کچھ دقتی لیے میں سرسرا کر بولا۔

"ویسے سیمینار میں بے شروع ہو گا، میں واقعی جلدی آ گیا ہوں۔"

یہ آپ کا آخری سسٹر ہے؟" وہ سامنے سے ہٹنے کے سڑ میں نہیں تھا۔

اس نے صرف انہماک میں گردن ہلا دی۔ وہ اس کی ناگواری، اس کی جلالت اور بیزارگی کو جیسے کچھ ہی نہیں رہا تھا اور اگر کچھ بھی رہا تھا تو اسے ابھی نہیں دے رہا تھا۔

"اس کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے آپ کا؟"

"ظاہر ہے جاہ کس کی..." وہ اس راز پر ناگواری کو ہانکے میں نہیں چھپا پاتی تھی۔ بھٹا زیادہ فور سے اس کی سہیلیاں اسے دیکھ رہی تھیں اتنی ہی اس کی ناگواری بھی بدلتی جا رہی تھی۔

بہترین جہدوں سے جا بک آفرز آچکی تھیں۔ ان آفرز میں سے ایک آفر اس غیر ملکی ادارے سے بھی تھی، جہاں سے اس نے انٹرن شپ کی تھی۔ کچھ لوگ اس سے حیرت کرتے تھے اور کچھ ملکہ۔ یہاں اس کا ذکر اکثر سٹوڈنٹس کرتے تھے مگر ڈاکٹر اعجاز ارشد کا خاص طور پر بہت پسند ہوا تھا۔ تو وہ سسٹر میں اب جب ڈاکٹر اعجاز ان لوگوں کو پڑھا رہے تھے، وہ اس کی کسی نہ کسی خوبی کا ذکر ضرور ہی کیا کرتے تھے۔ اسے انٹینیٹیٹ سے مجھے زیادہ سال ہو چکا تھا اور وہ کہتے تھے کہ وہ ان سٹوڈنٹس میں سے تھا، جنہیں کچھ تیس سال بعد بھی بھلا جائیں جا سکتا۔ یوں ڈاکٹر اعجاز ارشد نے ان لوگوں کو زیادہ، پورے دو سال بعد بھی اس بندے کو بھلائے نہیں دیا تھا۔

اس گرم ترین دور میں جب وہ ڈاکٹر اعجاز ارشد کے پرسکون ماحول والے انٹر کنٹریٹ آفس میں داخل ہوئی تو وہ ان کی میز کے سامنے رہی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے کاش کا بلیک راکڈر اور بلیو بلیک اسٹراپس کی ہاف سیلوز کی قمیض کے ساتھ بلیو ٹری کی ٹائی بین کر رکھی تھی اور مابا محکمہ کے تسلیم کر لینے میں قطعاً کوئی تاخیر نہیں تھا کہ وہ بندہ واقعی بہت چلیم تھا۔ اس کی ڈریسنگ اس کے جینس اور بولنے کا انداز سب شاندار تھے۔ وہ ڈاکٹر اعجاز سے اپنی ریسرچ رپورٹ کے حلقے کچھ باتیں پوچھنے آئی تھی مگر وہ اپنی اعلیٰ مصروف نظر آ رہے تھے۔

"سرا" میں بعد میں آ جاؤ گی۔" مگر ڈاکٹر اعجاز نے اسے روک لیا تھا۔ لہذا وہ صبر کے برابر والی کرسی چھوڑ کر اس سے اٹھ کر کوئی کرسی پر بیٹھی۔ ڈاکٹر اعجاز اس کی محنت اور لگن سے بہت خوش تھے، اس لئے وہ جس وقت بھی کچھ پوچھنے ان کے پاس آتی وہ بخوشی اسے وقت دیتے۔ اسے ان سے جو کچھ پوچھنا تھا وہ پوچھ رہی تھی، اس دوران وہ بندہ اس سے اور ڈاکٹر اعجاز سے قطعاً نا اعلق سامنے سیٹ میں کئی کئی گھنٹوں پر نظر پڑ جاتا تھا۔ اس کے کئی بھی انداز سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس کے سوالات اور ڈاکٹر اعجاز کے جوابات میں ذرا سی بھی دلچسپی لے رہا ہے۔ اس کا نا اعلق سے پھر یہ انداز کسی حد تک مفرد و متحرک کا حال تھا۔ مگر پھر جانے کیوں اس نے سامنے سیٹ اور کئی کئی گھنٹوں سے پھر یہ انداز اور اسے دیکھنا شروع کر دیا اور پھر محسوس انداز میں وہ ان کی ڈسکشن میں شریک ہو گیا۔ وہ بڑی روانی اور دلچسپی سے ان موضوعات پر بول رہا تھا، بلکہ ڈاکٹر اعجاز کو بھی وہ زیادہ بولنے نہیں دے رہا تھا۔

ابھی وہ چند ہی سوالات ڈاکٹر اعجاز سے کر چکا تھا جی کڑی ڈاکٹر اعجاز کے آفس سے ان کا جلاوا آ گیا۔

"آتم سواری..." وہ ان دونوں سے حیرت کرتے ہوئے اٹھ کر تیسرے کمرے کی طرف بھاگ گیا۔

"مہرا خیال ہے ان کے ان سوالات کے جواب تو میں بھی دے سکتا ہوں..." وہ جواب کھل کر سرسرا گئے۔

"ہاں کل دے سکتے ہو۔ ایک فنکار ان سوالات کے تسلی بخش جواب نہ دے سکے تو کون دے گا۔ ہاں آپ

صبر سے پوچھ لیجئے جو پوچھتا ہے، میں ابھی آ جا ہوں..." وہ اپنے آفس سے نکل گئے تھے اور وہ ڈاکٹر اعجاز کو اٹھاتا دیکھ کر خود بھی فوراً اٹھنا چاہتی تھی مگر وہاں وہیں بیٹھی رہی۔ جو باتیں اس نے ڈاکٹر اعجاز کے اٹھ کر جانے سے پہلے ان سے پوچھی تھیں ان کے وہ بڑے تفصیلی جوابات دے رہا تھا۔ وہ تفصیلی اس کے لئے فائدہ مند تھے، لیکن وہ دل ہی دل میں مسلسل بے سوچے چلی جا رہی تھی کہ کیا اس بندے کو اپنا کچھ کام دیا نہیں ہے جو اتنی فرصت سے بیٹھا ہو اسے سمجھا رہا ہے۔

"آپ کہاں رہتی ہیں کس ماہ؟" اس نے اچانک وہی سنجیدگی و بردباری سے اس سے یہ سوال پوچھا۔ اس

”اور شادی؟“

”جی؟“ اس براہ راست سوال پر اس نے اس بندے کی جرأت کو ملاحظہ نہ کیا۔
”مجھ سے شادی کریں گی؟“ وہ اب ناگواری اور غصے کو فراموش کر کے تجھ سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔

اس کے مردوبیات اور غیر دوستانہ انداز کے باوجود بھی کسی کوئی شخص اتنی بڑی بات اس سے کرنے کی ہمت کر سکتا تھا؟
”آپ مجھ سے شادی کریں گی؟“ اس کا ہوا اصل؟“ اس نے اس کی حیرت بھری نگاہوں کو اپنی نگاہوں کی گرفت میں لیتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔ وہ کہنے کو جواب میں بہت کچھ کہہ سکتی تھی مگر پھر اسے خیال آیا کہ مزے کچھ بھی کہہ کر بات بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

”اگر کسی لڑکی سے واقعی شادی کرنا ہوتی ہے تو پھر اسے کیسے میں راستہ روک کر نہیں بلکہ اپنے جوش کو اس کے گھر پہنچ کر پورے کر دیتا ہوتا ہے۔ آپ مجھے ایک مسز انڈا نظر آتے ہیں، آپ کو بھی میرا خیال ہے جیسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اور اگر یومی وقت گزاری کا آپ کا ارادہ ہے تو آرم حویلی میں اس طرح کی لڑکی نہیں ہوں، آپ کیسے اور رانی کیسے۔“ وہ سر اٹھا کر باقاعدہ مسز انڈا میں چلے ہوئے اس کے پاس سے گزر کر اپنی دوستوں کے پاس آگئی جہاں وہ سب اس سے بھی زیادہ بے چینی اور بے مبری سے اس کی منتظر تھیں۔

طولی سے اس کی اتنی دقت نہیں تھی کہ وہ بے تکلفانہ انداز میں ”میرے رضا کیا کہہ رہا تھا اور کیوں کہہ رہا تھا“ جیسا کوئی احتیاط کر پاتی، مگر یہ سوال کرنے کی خواہش اس کے چہرے پر بڑی واضح نظر آرہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر اس بارے میں اس کوئی سوال کرتی وہ ان لوگوں سے معذرت کر کے کلثوم اور منم کو ساتھ لے کر وہاں سے لائبریری کی طرف نکل گئی اور جب راستے میں ہی اس نے کلثوم اور منم کو میرے رضا کی کل کی اور آج کی ساری بات بتا دی تھی۔

”ایک اسٹے ویٹمنڈ بندے نے مجھیں پر پڑا ہے اور تم نے شکل پر بارہ بھار کئے ہیں؟“ منم نے شوخی و شرارت سے اپنی ایکساٹمنٹ کا اظہار کیا جبکہ کلثوم جو اس کی زیادہ پرانی اور زیادہ گہری کنبلی تھی، اپنی عادت کے مطابق تنبیہ کی کہ بونی۔

”نیک جواب دیا تم نے۔ اب بتا چل جائے گا موصوف کتنے پانی میں ہے۔“ اور موصوف کتنے پانی میں تھے یہ اسے اسی بات پر چل گیا تھا۔ رات کوئی اس کے کمرے سے آئیں اور اسے بتایا کہ کسی حیرت رشا کے بھائی کا اگلی کچھوہ پہلے ان کے پاس فون آیا تھا۔

”وہ لوگ ہم شام سے گھر آتا جا رہے ہیں۔ یہی پوچھ رہے تھے کہ شام کو ہم مصروف تو نہیں۔“ وہ بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ شاید یہ سمجھ رہی تھیں کہ میرے رضا اس کا گلاس فیلوہ اور کوئی بہت ہی زبردست قسم کا اغیر اس کا اس بندے کے ساتھ چل رہا ہے۔

اس کا چینی ماں سے بھی بھی دیا تعلق نہیں تھا جیسا ایک ماں اور بیٹی کے درمیان ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اسے خود سے دور اور بہت انجکھی کرتی تھیں۔ شروع شروع میں اس نے اپنے اور اپنی ماں کے درمیان حائل فاصلوں کو کم کرنے کی بہت کوششیں کی تھیں، مگر پھر گزرتے وقت نے اسے آہستہ آہستہ اس پر اس تکلیف و حقیقت کا انکشاف کر دیا تھا کہ وہ

اب اس کی نہیں صرف عبد اللہ اور مومہ کی ماں ہیں۔ اس کے پاپا جسدانی طور پر اس سے جدا ہو چکے تھے مگر وہ پھر بھی ان کا احساس اپنے گروہ محسوس کیا کرتی تھی مگر جی جسدانی طور پر اس سے ہونے لگی تھی قریب محسوس ہوتی تھیں۔

وہ فقط چھ سال کی تھی جب ایک ایکسپنڈنٹ اس کے پاپا سے اور مکی کو چھوڑ کر اپنے ابدی سطر پر روانہ ہو گئے تھے۔ اس کے پاپا کی بہت لمبی چوڑی کاغیداد تو نہیں تھی، البتہ اتنا پیرہ چھوڑ کر ضرور گئے تھے کہ وہ دونوں ماں بیٹی عزت کی زندگی جی سکیں۔ پھر بھی تنہا تو وہ نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس کی مکی اسے لے کر واپس اپنے سیکے آگئی تھیں۔ مکی صرف چھ ماہ تھیں، بیٹھے وہاں اس کے ساتھ رہی تھیں پھر ماں اور باپ نے ان کی دوسری شادی کرادی تھی۔ مکی رخصت ہو کر مظہر آصف جوان کے فرسٹ کمرہ میں تھے، ان کے گھر چل گئیں اور وہ اپنے خیمال میں رہ گئی۔

مظہر انکل کی بھلی بیوی کا دوسرے بچے کا پیش قدمی کے وقت انتقال ہو گیا تھا۔ وہ بہت چھوٹی تھی اس کے لئے اس بات پر کھنکھارنا مشکل تھا کہ اس کا پاپا سا گھر اور اس کے پاپا اس سے چھن گئے ہیں اور مکی بھی اسے چھوڑ گئیں۔ شروع شروع میں وہ بہت روٹی، اس نے ماں کے پاس جانے کی ہمت نہ کی مگر پھر گزرتا وقت اس میں مبر پیدا کرنا چل گیا۔ مکی سیکے آگئی تھیں اسے بہت پیار کرتیں، اس کے لئے کھلوئے اور چاہئیں لائیں اور اگر مظہر انکل بھی ساتھ ہوتے تو اسے بھی مکی اس طرح پیار نہ کرتیں جس طرح انکیلیہ آنے پر کرتی تھیں۔ اس سے زیادہ چاہتا وہ مومہ جو ان کی کنبلی بیٹی تھی نہیں مکی اس سے کئی نظر آتی تھیں۔ بھران کی گود میں عبد اللہ آگیا۔ مومہ سے اگر وہ صرف مظہر انکل کی خاطر دکھاوے کا پیار کرتی تھیں تو عبد اللہ تو ان کا چچا تھا جس سے وہ دوا لہانہ پیار کرتیں۔

اس کے دل میں ماں کے خلاف بہت سا بغاوت اور غلط فہمیاں چلتی چلی گئیں۔ یہ غلط فہمیاں اور بدگمانیاں اس وقت مزید شدت اختیار کر گئیں جب ممانی پاپا ان کا کوئی بچہ اسے احساس دلانا کہ اس کا گھر نہیں۔ وہ چودہ سال کی تھی جب آگے پیچھے ماں اور باپ دونوں کا انتقال ہو گیا اور ماموں ممانی سے صاف صاف یہ بات کی کہ پرانی اولاد وہ بھی لڑکی کی ذمہ دار لی اٹھانے کو وہ نہیں تھیں، لہذا وہ اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جائیں گی کہ چہرے پر یہ بات سننے پر بیٹھانے کیلئے لگ گئی۔ اسے اس وقت اپنا بڑا اختیار اور بے متعلقہ قیادہ۔ وہ یہ حالت مجبوری اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لائے تھیں اور اسے دیکھنے کی مظہر انکل کا سہنہ ہو گیا تھا۔ وہ کیوں تک مکی سے بھی اس بات پر ناراض رہے تھے اور مکی ان کے آگے پیچھے نہیں اٹھنے کے جتن کر پاتی تھی شرمندگی اور خدمت کو وہ چن کر دیا کرتیں۔ ماں کے خلاف جو وہ دل میں غلط فہمیاں، نفرتیں اور بدگمانیاں رکھتی تھی انچاک ہی ان سب کی جگہ ترس اور دھردلی نے لے لی۔ اسے اس عورت پر ترس آنے لگا اور خود پر غصہ۔ وہ اپنی ماں کی پرسکون اور خوشگوار ازدواجی زندگی میں زہر چھلنے کا باعث بن رہی تھی۔ چاہے یہ حقیقت جتنی بھی تلخ اور قابل قبول تھی لیکن اپنی مکی اس کے گھر میں آنے کے صرف ایک گھنٹے کے اندر ہی اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اس کی ماں کی زندگی میں اب اس کی کوئی جگہ نہیں۔

مظہر انکل، مومہ اور عبد اللہ تینوں میں سے کوئی اس سے بات نہیں کرتا تھا اور مکی صرف اس وقت بات کرتیں جب مظہر انکل آفس گئے ہوتے۔ اس کے تعلیمی اخراجات، اس کے لباس اور دیگر بنیادی ضرورتیں ابھی بھی اس کے پاپا ہی کے جیبوں سے پوری ہوتی تھیں پھر بھی مظہر انکل کو ایسا لگتا تھا کہ وہ ان کے بچوں کا حق چھین کر رکھا رہی ہے۔ وہ

اسکول سے دیر سے آئی تھی جب تک وہ سب کھانا کھا چکے ہوتے تھے۔ مونا بچن میں اس کے کھانے کے لئے کوئی چیز نہیں چھوڑتی تھی۔ وہ بچا ہوا کھانا خریدتیں ڈال دیتی، ماسی کو دے دیتی اور کچھ نہ ہوتا تو اپنی پانچولی کے آگے ڈال دیتی۔ یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ جو وہ اس نا انصافی پر کبھی سے احتجاج کرتی۔ وہ لباس تبدیل کر کے خاموشی سے نیک کے پاس والی جگہ پر اسکول کا کام کرنے بیٹھ جاتی اور وہیں پر پڑھنے پڑھنے سے موندھ جاتی۔

یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ اس کی طرف سے یا کسی بھی طرف سے کسی بھی قوت کے بغیر اس کے اختیاری نتائج ہمیشہ شاندار ہوتے۔ مونا کو تو پر حاشا کا زیادہ شوق تھا ہی نہیں۔ مگر عبداللہ جس پر کسی اور منظر اگلے دنوں بھر پور توجہ دیتے۔ وہ بھی کسی غیر معمولی کارکردگی کا مظاہر نہیں کر پاتا تھا۔ منظر اگلے کو اس کی اعلیٰ تعلیمی کارکردگی بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ مونا کی پر حاشی سے اتنی نا اتفاقی اور غیر دلچسپی کو دیکھتے ہوئے منظر اگلے نے انزور کرتے ہی اس کی شادی کر دی تھی۔ مونا کی شادی سے اسے یہ فائدہ ہوا تھا کہ لاؤنج میں سوئے اور گھر کے پچھلے کمرے میں یکسوئی سے پڑھنے کے بجائے اب اسے ایک کمرہ مل گیا تھا لیکن وہ اندر سے جانتی تھی کہ نہ یہ کمرہ اس کا ہے نہ وہ یہ کمرہ۔

☆☆☆☆

حمبر کے بھائی اور بھالی اگلے روز شام کو ان کے گھر آئے تھے۔ وہی کو تو جانتی تھی کہ وہ اس کا کلاس فیلو نہیں بلکہ اس سے سینئر تھا چھٹی کا دن تھا، منظر اگلے گھر پر ہی موجود تھے مگر انہوں نے دروازے روم میں آکر مہمانوں سے ملنا پسند نہیں کیا تھا، وہ کونسا ان کی سچی سچی جی جی اس کے لئے آئے وہ کسی رشتے میں وہ دلچسپی لیتے۔ حمبر کے بھائی اور بھالی اس کے قصور کے بالکل عکس تھے۔ اس کے بھائی صرف شکل میں اس سے ملتے تھے ورنہ ان کی کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو یہ ظاہر کرتی کہ وہ حمبر کے بھائی ہیں۔ وہ اپنی اننگھو سے وہاں سے پڑھے ہوئے معلوم ہو رہے تھے اور ان کی بیگم ان سے بھی زیادہ کہ تعلیم یافتہ اور عام میں تھیں۔ اس کے بھائی کی مراد ان پڑے کی دکان تھی۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اگے رہتے تھے، ان کے والدہ تین کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ بس وہی رہتی تھیں۔ وہ حمبر سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ مگر یہ اس کے چہرے پر انہیں دیکھ کر تو کوئی متاثر نہ ہونے والے تاثرات انہیں سننے سے محروم نہ تو جانتی تھیں کہ جس کے لئے وہ آئے ہیں وہ IBA میں ان کی بیٹی سے سینئر تھا۔ اپنے بھائی کے متعلق حیرت انگیز قصیدات جب حمبر کے بھائی نے می کے گوش گزار کیں تو ان کے چہرے کے تاثرات ہی تبدیل ہو گئے۔ وہ ہلکا کی شادی جلد از جلد کر دینا چاہتی تھیں اور اس کے لئے انہیں رشتے کی بھی تلاش ہی۔ مگر وہ ان کی اولاد تو تھی، جلد ہی خواہش رکھنے کے ساتھ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ اس کی شادی کسی اچھی جگہ ہو اور یہ تو واقعی ایک بہترین مشورہ نظر آ رہا تھا۔

جواد رضا، حمبر کی تصویر اور اس کا وزنیٹنگ کارڈ انہیں دے گئے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ گئے تھے کہ وہ یہ رشتہ جلد ہی لئے کر دینا چاہئے۔

منظر اگلے انہیں نے اس کے رشتے کے لئے آئے والوں سے ملنا پسند نہیں کیا تھا انہوں نے رات کے کھانے پر کسی سے اس بارے میں پوچھا ضرور تھا۔ اور می نے جیسے ہی انہیں حمبر کے متعلق تمام تفصیلات سنیں اس نے ان کے چہرے پر عین اور حد جیسے تاثرات دیکھے۔ اسے ان کے چہرے پر دکھائی ہی جاتی تھی۔ اسے دیکھ بھانپتا تھا جیسے برسوں میں انہیں اس سے اتنی سی اچھی تعلیم نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کی خوشی پر خوش ہو سکیں؟

می تو اس کی شادی کل کی کرتی آج کر دیتی تھی مگر یہ تو ایک بہترین رشتہ تھا۔ انہوں نے حمبر کے بارے میں کسی بھی طرح کی کوئی انکوائری یا معلومات کراوئے بغیر بس ایک وعدہ اس کے گھر کا اس کے لئے کے بعد اس رشتے کے لئے ہلے کہہ دی۔

باقاعدہ کوئی گھنٹی نہیں ہوئی تھی۔ بس بات بک کر کے شادی کی تاریخ طے کر لی گئی تھی۔ اسے بہت عجیب عجیب سے خیال آتے۔ اسے آئے والے وقت سے بہت ڈر لگا، وہ کیا تھا، وہ کسی طرح کی باتوں کا مالک تھا، وہ کچھ بھی تو نہیں جانتی تھی۔ ڈاکٹر اعجاز جس لڑکے کی ذہانت کے قصے بہت مدت سے جانتے تھے کیا ضروری تھا کہ وہ باتوں اور مزاح میں بھی اچھا ہوتا؟

بات طے ہو جانے کے بعد حمبر نے صرف ایک مرتبہ اس سے فون پر رابطہ کیا تھا اور اس میں بھی ان دونوں کی بہت مختصر بات ہوئی تھی۔

"اب تو یقین آگیا کہ جس لڑکی کا رستہ میں نے کیسپس میں روکا تھا میں اس کے ساتھ وقت نہیں لگاؤں گی۔"

پوری زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔

"آپ نے مجھے، میرا مطلب اتنا بڑا فیصلہ آپ میرے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتے بھر یہ سب۔"

اس کی شہنی کے جواب میں بیٹھ گئی۔

"اس سوال کا جواب دینے کے لئے مجھے جو کچھ کہنا پڑے گا، وہ ابھی کہنا مناسب نہیں۔ اس سوال کا جواب میں تمہیں 16 فروری کا اپنے گھر میں۔ سوری ہو تو وہ ہمارا گھر ہو چکا ہو گا تو میں ہمارے گھر میں 16 فروری کو تمہیں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔" وہ بے تکلفانہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا اور وہ اس مختصر سی بے تکلفانہ گفتگو کے بعد بھی اپنے اندر کے زوار خوف کو دھکیں کر پاتی تھی۔

وہ زندگی میں تیسری بار ایک گھر چھوڑنے والی تھی جس گھر میں اب وہ جا رہی تھی کیا وہ گھر واقعی اس کا گھر ہوگا؟ کیا وہ فیض واقعی دیا ہو گیا جیسا کہتے؟ آگے کیا ہوئے والا تھا اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ بس ایک جوا بھیل رہی تھی اور اگر وہ سب کچھ باگنی تو اس کے پاس تو بیچے پلٹ کر کھینچے پائے تاکہ اس آسرا بھی نہیں ہوگا۔

اس کی شادی کی تقریبات میں مہندی، میاں کچھ نہیں ہوا تھا۔ اگر دہلی حمبر ان رسومات کے خلاف تھا تو یہاں اتفاقاً تو یہ کسی کے پاس نہیں تھا کہ ان اٹلن تلوں میں خرچ کرتا۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے ای پی پی پی کے پاس کی اس کا عام سے انداز میں شادی ہو سکے۔ بہت عام سا ہی اس کا بھتیجہ تھا۔ شادی ہو جانے کے بعد اب بیچھے گراں اور اس کا گھر نہیں تھا تو باپ کا ترکہ بھی سب تمام ہو گیا تھا۔ شادی کے دن وہ اپنے باپ کو یاد کر کے بہت روئی تھی۔ اگر وہ ہوتے تو اس کی ذہانت اور اس کی تعلیم پر کتنا خوش ہوتے، اس پر فخر کرتے، آج اس کی شادی کے دن اسے ایسی کے روپ میں دیکھ کر کبھی سوچتا کہ اس کی جدائی پر افسوس ہوتا ہے۔

وہ رخصت ہو کر حمبر رضا کے ساتھ اس نے گھر میں آگئی۔ حمبر کے بھائی، بھالی، ان کے بیچے اور اس کے چند قریبی دوست رخصتی کے بعد اس کے پارٹنٹ میں ان دونوں کے ساتھ موجود تھے۔ وہ سب کچھ دہلی ان دونوں کے

ساتھ رہتے تھے۔ پھر ایک ایک کر کے وہ سب جانے لے گئے۔ پہلے حیدر کے دوست رخصت ہوئے اور پھر رات دو بجے بھائی، بھائی اور ان کے پانچ بچے بھی جانے لے گئے۔ حیدر نے رسامی جواد بھائی اور ان کی ٹیلی کورات میں رکنے کی دعوت نہیں دی۔ دوسرے جگہ کے خاوش بنی تھی، پھر کبھی اسے حیدر کے غیر بند بانی پر تلفظ اور رکی انداز گفتگو پر حیرت ہوئی۔ اتنے دنوں کی اعصاب جن کو سوزنا، خوف، اندیشے، ذرہ دانہ سب سے مدد حال ہو چکی تھی اور اب جب وہ اس بیڑہ میں اس کی بچی بھی تھی تو اسے ایسا کہ کراہ ڈالنے اور اندیشے پالنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے خود کو پر سکون اور مطمئن کرنے کی کوشش کرنی شروع کی۔ حیدر چند گھنٹوں ہی میں جواد بھائی اور ان کی شیلی کو خدا حافظ کہہ آیا تھا۔

آج سب لوگوں نے اس کی بہت تعریفیں کی تھیں، کلثوم اور صنم نے خاص طور پر دلہن بنے اس کے اس روپ کو دل کھول کر سراہا تھا۔ اس کے چہرے میں کچھ ایسا غیر معمولی کشش اور جاذبیت تھی جو اس پر نگاہ ڈالنے والے کسی بھی شخص کو دوسری نگاہ ڈالنے پر مجبور کیا کرتی تھی۔ صنم کو یقین تھا کہ آج حیدر اس کے حسن کی شان میں ایک آدھ غزل نہیں بلکہ پورا دیوان کہہ ڈالے گا۔ اور حیدر نے غزل لکھی تھی نہ دیوان۔ اس نے اس کی تعریف سے ٹک بہت کی تھی، یہ بھی کیا تھا کہ وہ پندرہویں میں جیسی خوبصورت لکھی تھی آج اس سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت اور بالکل مختلف لگ رہی ہے۔ مگر اس کی ماہ سے شادی کی وجہ اس کی خوبصورتی سے زیادہ اس کی ذہانت تھی۔ وہ اس کی ذہانت سے متاثر ہوا تھا۔ اسے اس کے بات کرنے کا انداز اچھا لگتا تھا۔

”میں کبھی کسی ایسی لڑکی سے متاثر نہیں ہو سکتا تھا جس کے پاس حسن تو ہر ذہانت نہ ہو۔ ہر ناول انسان کی طرح خوبصورتی مجھے بھی متاثر کرتی ہے مگر صرف اسے بنیاد بنا کر میں کسی لڑکی کو شادی کے لئے پسند نہیں کر سکتا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ اللہ نے میرے نصیب میں دونوں ایک ساتھ لکھ دی تھیں۔ مجھے ایسی لڑکی مل گئی جو بے تحاشا خوب صورت بھی ہے اور بے انتہا ذہین بھی۔“ اس کی اگلی میں ڈائننگ روم پہناتے ہوئے حیدر نے کہا تھا۔

”جب تم ڈائننگ روم آؤ گے آؤ گے تو میں نے تمہیں ڈائننگ روم میں اہمیت نہیں دی تھی۔ میں ان سے جوابات کرنے گیا تھا کہ وہ کر چکا تھا اور جب تم آئیں تو وہاں سے اٹھنا چاہ رہا تھا مگر پھر میں ہوا کر میں وہاں سے اٹھ نہیں پایا۔ تم نے کھل پانچ منٹ میں ہی مجھے اپنی جانب اس طرح متوجہ کر لیا کہ میں وہاں بیٹھا رہنے کے سوا اور کچھ نہیں پایا۔ تمہارے بولنے کا خوبصورت انداز۔ ایک تو آواز اتنی پیاری اور بے لہجہ ایسا دلنشین۔ مجھے کبھی کسی لڑکی نے اس طرح متاثر نہیں کیا تھا۔ میں وہیں بیٹھنے بیٹھنے تم سے شادی کو فیصلہ کر چکا تھا۔ جب ہی تم سے ذاتی نوعیت کے دو سوالات پوچھے تھے جنہیں میں کہ تمہارے چہرے پر تاگواری تھیں مگر تھی اور پھر اپنی تاگواری کے ساتھ تم گفتگو اور میری چھوڑ کر جب ایک دم ہی وہاں سے اٹھیں تو میرا دل چاہا تھا میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں روک لوں۔“ ماہا تم کہیں مت جاؤ۔ میں میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرنا کہو۔ میں تمہیں دیکھتے رہنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں سنتے رہنا چاہتا ہوں۔ اس وقت اگر میں واقعی ایسا کر جاتا تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کر تیں؟“ متنبہ کلاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ لیکن اس کے شرارت سے تاہی تھی کہ وہ اس کے متنبہ رد عمل کو قصور کی آنکھ سے دیکھ کر انجانے کر رہا ہے۔ جو وہ کرتی اسے سوچ کر اب اس وقت، اس جگہ بیٹھ کر اسے خود بھی انی لگنے لگی تھی، جسے اس نے بشکل

کنٹرول کیا تھا۔ اگلے روز بھی اتنی ٹیوٹ میں دیکھ کر جو تاثرات تمہارے چہرے پر آئے تھے انہیں دیکھ کر مجھے واقعی ایسا لگا تھا جیسے میں کوئی سڑک چھاپ افتک ہوں، جو خواہوا ایک شریف لڑکی کو تنگ کئے چلا جا رہا ہے۔ ویسے اس روز میں کسی سیدنا میں نہیں، صرف تمہاری خیریت ہی پوچھنے آیا تھا۔“ وہ جپتے ہوئے بولا اور اس بار وہ اپنی سرکراہٹ اس سے چھپائیں پائی تھی۔

ایک انجانے سے خوف کی جس مسلسل کیفیت میں وہ مگر ہی تھی دھیرے دھیرے اس سے نجات پانے لگی تھی۔ اگلے روز ان کا ویرہ ہوا تھا۔ ویسے کی تقریب میں گو کہ مہمانوں کی تعداد بہت کم تھی مگر وہ تقریب بھی بہت شاندار۔ جواد بھائی اور ان کی شیلی کے سوا حیدر کے خاندان کا کوئی فرد اس تقریب میں موجود نہیں تھا۔ مہمانوں میں سب اس کے کوٹنگز، اس کے قریبی دوست اور دیگر نے ملنے والے شامل تھے۔ اسے یہ بات بہت عجیب لگی۔ مگر صرف ایک دن میں وہ حیدر سے اتنی بے تکلف نہیں ہوئی تھی کہ اس بارے میں کچھ پوچھ پائی۔

اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو حیدر اسے ڈرینگ ٹیبل کے آگے کھڑا تھا بائیں نظر کیا۔ وہ چونک جانے والے انداز میں یک دم اٹھ بیٹھی۔ اپنی شادی کے تیسرے دن وہ صبح اٹتے انتہام سے تیار ہو کر بالکل جادہ رہا تھا؟

”آپ کہیں جا رہے ہیں؟“

”تم یہ آپ آپ کر کے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دو۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میری بیوی نہیں، بلکہ میری کوئی کونیک۔ مجھ سے مخاطب ہے۔“ اسے اٹھ کر بیٹھا دیکھ کر فوراً ڈرینگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹا اور پھر اس کے پاس آتے ہوئے اس طرح مخاطب پر اپنے اعتراض کا برا بھلا بھلا کر لیا۔

”وہیے میں چیک جا رہا ہوں۔ یعنی اپنے آفس۔“

”آفس؟“ اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

”نہیں جاؤں؟“ وہ سکرٹاتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”نہیں، میں نے ایسا تو نہیں کیا۔“ وہ اسے اتنا قریب بیٹھے دیکھ کر تھوڑا اور بلی۔ وہ اگر قریبی دوستوں کے سوا دوسرے لوگوں سے بے تکلف طریقے سے اور فاصلے کا لحاظ کرتی تھی تو یہاں گڑبڑ پر کبیر رضا ”لوگ“ نہیں اس کا شوہر تھا اور وہ اس کے بے تکلف انداز کا بہت دینے کو تیار نہیں تھا، اس لیے جیسے ہی وہ دروازے سے اسے اٹھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے دوبارہ اپنے اتنا قریب کر لیا تھی وہ پہلے تھی۔

”خاتون! آپ کس ماہا امرتھی نہیں کر مجھ سے ایک کری چھوڑ کر نہیں اور میں دیکھتا رہوں، اب آپ سزا ماہا حیدر رضا بن چکی ہیں اور یہ بات آپ کو یاد دلانی چاہئے۔“

☆☆☆

وہ دن اور اس سے اگلے دن بھی اس طرح گزر گیا تھا۔ دو صبح تیار ہو کر آفس چلا جاتا اور پھر شام ساڑھے چھ اور سات کے درمیان اس کی دکان ہوئی اور دن بھر میں صرف ایک بار اس نے ماہا کو فون کیا۔ تیسرے دن وہ اسے اپنے ساتھ لے کر اسلام آباد آ گیا۔ یہاں اسے کوئی میٹنگ اینڈ کرنا تھی اور غالباً اس کی وہک شاپ یا سیدنا میں بھی شرکت کرنی تھی۔ یہی مومن کی کوئی قسم تھی وہ جانتی نہیں تھی۔ پورے تین دن وہ بھل میں سارا سارا دن اکیلا رہ کر

اپنی سون منائی رہی۔ اور چھ دن جب اسے لگا رہا وہ اس بندے کی ان ذبحہ میں آنے والی باتوں کو مزید برداشت نہیں کر سکتی، تب وہ صبح سویرے اسے سامان بیک کرنے کا کہنے لگا۔

”ہم ایبٹ آباد، سوات اور گلگت جا رہے ہیں۔“

”ہاں پر بھی کوئی سینگلر ہیں کیا؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ غریب ہو گیا تھا اور وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

”ہاں، ایک لڑکی ہے مہاجر رضا اس کے ساتھ اگلے دس دنوں تک، چوبیس گھنٹے میری سینگلر رہیں گی۔ ان تمام جگہوں پر۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولا۔

☆☆☆☆

”میں نے اپنی زندگی کے اگلے سات آٹھ سالوں تک کی جو منصوبہ بندی کر رکھی تھی اس میں شادی کی کسی چیز کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اگلے آٹھ سالوں تک میرا شادی کرنے کا سرے سے کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ پھر آٹھ سالوں بعد جب میں شادی کرنے کا سوچتا ہوں، مہاجر میں بھی پانی، اس کی کیا گمان تھی؟ جو لڑکی مجھے دیکھتے ہی آنکھیں ماتھے پر چڑھا لے، تیوریوں پر بل ڈال لے۔ کیا اس سے میں کیسے نہ ہلاکتا تھا۔“

”سنو ہاں! میں تم سے شادی کرتا ہوں تو مگر ایسا نہیں، آٹھ سال بعد۔ کیا تم آٹھ سالوں تک میرا انتظار کر سکتی ہو؟“ سوات میں اس کے ساتھ کھڑے ہوئے میرے اس سے باتیں کر رہا تھا۔ ”میں تم سے شادی کرتا ہوں۔ مگر ابھی نہیں، سات آٹھ سال بعد۔ یہ میرے کیریئر کی ضرورت ہے۔ میں اس وقت شادی کا سوچتا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مگر مجھے یہ لگا کہ جب میں شادی کرنے کی پوزیشن میں آ جاؤں گا تب یہ لڑکی مجھے کہاں کھینچے گی۔ مجھے جیسے خود ہیے کا ذرا لائق تھا اور اس نے میری ساری پانچھڑا پیرا فرق کر کے مجھے سے قبل اس وقت شادی کا فیصلہ کر دیا۔“

”مجھے ان پانچھڑے کا نام ہو جانے پر خوشی کا اظہار نہ کرنا چاہیے یا ضروری؟“

”تمہاری مرضی سے۔ ویسے تم اس بات پر اگر چاہو تو پھر بھی مجھوں کو سکتی ہو کہ ایک ایسا شخص جو زندگی میں شادی سے ہٹ کر ایسا اور بہت سے کام کر چاہتا تھا، تم نے اس سے باقی سب کاموں سے پہلے شادی کا فیصلہ کر دیا اور وہ بھی بالکل آغا فانا۔“ اس کے شوخی بھرے سوال کے جواب میں وہ معنوی تنبیہ کی، اسے مسکراہٹ لبوں پر روکتے ہوئے بولا۔

”چاہئیں بغیر کرنے والی ہے بھی انہیں۔ دنیا میں ایک میں ایسی ڈین لڑکی تو نہیں۔ اگر کسی کو ان مجھ سے زیادہ ڈین لڑکی لگتی تو میں اور میرا خرف تو مند دیکھتے ہو کہ میں گئے۔“ اپنی شادی شدہ زندگی کے ان چند دنوں میں ان کے درمیان بہت سے موضوعات پر بہت ساری باتیں ہوئیں تھیں، مگر وہ ایک لفظ جو اس کے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا ایک بار بھی درمیان میں نہیں آیا تھا۔ وہ خوبصورتی سے سناتا نہیں ہوا تھا تو ذہانت سے دیکھتا تھا اور بہت ہی آہستہ لفظ وہ بڑی شدت سے اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔ اور وہ اس کے جواب میں پیچھے منہ نہیں دیکھتی تھی۔

”کیا یہ بہت ضروری ہے کہ میں تم سے بہت کرتا ہوں؟“

”ہاں۔ ورنہ مجھے کیسے پتا چلے گا کہ جس بندے کو میں آفس، آفس، آفس اور کام، کام اور کام میں مصروف

دیکھ رہی ہوں اس کی زندگی میں میری کیا اہمیت ہے؟“ ابتدا میں جبکہ اور کھٹک رہی تھی اب آہستہ آہستہ اس کے حصار سے نفقہ جاری تھی۔ اس کی وہ تنہائی جسے وہ بچپن سے سنی آئی تھی کم ہی کہیں غائب ہو گئی تھی۔ اس کی تنہائیاں بڑھتی ہوئی اس کے ساتھ تھا اور اس کے لئے یہ بڑا اٹھنا اور دلچسپ احساس تھا کہ جو شخص اس کے ساتھ ہے، وہ اس پر بلا شرکت غیر سے پورا حق رکھتی ہے اور حق رکھنے والا یہ احساس اس کے لئے اور زیادہ چلا جا رہا تھا۔

اپنی زندگی کے اتنے برس تک رشتوں اور محبتوں کی محرومیاں سہتی رہنے والی لڑکی کو اپنا ایک ہی ایسا گھٹنے کا تھا جیسے اسے سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا ایک مضبوط رشتہ اور پورا حق رکھنے والی ایک بھرپور محبت مل گئی ہے۔ اور زندگی سے کیا چاہتا ہوں؟

”میری زندگی میں تمہاری بہت اہمیت ہے مہاجر اگر محبت کا اظہار لفظوں سے کرنا ضروری ہوتا ہے تو میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں مہاجر! تم میری زندگی کا سب سے خوبصورت احساس ہو۔“ اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس نے محبت اور چاہت سے بھر پور لہجے میں کہا تھا۔

☆☆☆☆

وہ گھٹاتے تھے اور سخت ترین سردی میں وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر آنے کے کپڑے میں گھس کر بیٹھے ہوئے ذرا سی فرس کھاتے۔ اور باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ آج وہ قدرے عجیب و غریب موضوعات پر اس سے باتیں کر رہا تھا۔

”تمہیں میرے ساتھ بہت تیز رفتار اور بہت بھاری ہوئی زندگی گزارنی پڑے گی۔ میں زندگی کو پیسے ہے اور جہاں ہے کی بنیاد پر نہیں گزیر سکتا۔ میں ابھی زندگی میں بہت کچھ حاصل کر چاہتا ہوں۔ یہ میرے کیریئر کی ابتداء ہے ابھی مجھے بہت آگے جانا ہے۔ کیا تم میری رفتار کا ساتھ دے سکتی؟“ اس نے ایک لمحہ کی بھی دوڑ گئے بغیر سرائیات میں بلاؤ تھا کیسی عجیب سی بات تھی جس شخص کے سنگ زندگی کا نیا سفر شروع کرتے ہوئے وہ بے شمار آئینوں اور دوسروں کا شکار تھی اب اس کی محبت میں جتا ہو کر اپنے ان آئینوں اور دوسروں پر ہنس رہی تھی۔ اسی رات میرے اسے اپنے لمبی بیک کراؤٹر کے متعلق کسی سب کچھ بہت چائی اور ایماندار سے بتایا تھا۔ اپنے خاندانی پس منظر اور اپنے بچپن کی کوئی بات اس نے کہا نہیں چھپائی تھی۔ اسے میری صاف گوئی اور سچائی نے بے انتہا حیرت کیا تھا۔

اسی میں مذہب بندے کے بارے میں کوئی سوچ بھی سکتا تھا کہ وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جہاں اعلیٰ تعلیم تو کیا عام تعلیم حاصل کرنے کا بھی رواج نہیں تھا۔ اس کی والدہ کا کھانا پڑھنا کچھ نہیں جانتی تھی اور والد بھی بس اور ابھی سے تعلیم یافتہ تھے۔ اس کے والد کیسے میں ایک معمولی سے ملازم تھے۔ اس نے اپنے چھوٹے سے گھر میں غربت اور کمزوری والے حالات دیکھے تھے۔ ایسے حالات کہ جہاں سفید پوش کا بھرم رکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ جواد بھائی اس سے سولہ سال بڑے تھے اور صرف اپنے دو بچوں کا خرچ اٹھاتا ہی اس کے والد کے لئے اپنی حدود آمدنی کے تحت سخت دکھاتا تھا۔ انہوں نے اسے ایک سرکاری اسکول میں داخل کر دیا تھا مگر سرکاری اسکول میں اسے تعلیم دلانا بھی ان کی استطاعت سے باہر ہو کر تھا۔ اس نے اپنی والدہ کو اپنے بچپن ہی سے بنیاد دیکھا تھا مگر اس ماحول اور ان حالات میں وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر وظیفہ حاصل کرتے رہنے کے سبب اپنی تعلیم کا سلسلہ کامیابی کے ساتھ

جاری رکھا رہا۔ وہ اس ماحول میں اتنا مختلف کیسے پیدا ہو گیا تھا، یہ عجیب کی بات تھی، مگر جیجی بچا تھا کہ وہ گردی کا مکمل تھا۔ اس کی قدرتی ذہانت اور قابلیت اسے اپنے ماحول سے الگ کر تھی۔ وہ سو سال کا تھا تو اس کی والدہ اور بارہ سال کا قہاب والد کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ اسے میرٹ اسکالر شپ ملی رہی۔ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اس نے رات نام چھوٹی موٹی بہت سی ملازمتیں کی تھیں، بیٹھو پر چائی تھیں۔ اس کے پاس قدرتی ذہانت تو تھی مگر اس نے اپنی آپتی کی تھی۔ وہ کم سیلٹ میڈ تھا۔

اب جس لب و لہجے میں وہ روایتی سے انگریزی بولتا تھا اسے سن کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی گورنمنٹ اسکول کا پڑھا ہوا ہے۔ اس کے ہمراز اس کے اسی کیلئے، اس کی لکھتوں، اس کا لکھنا، جیٹنا، ان سب کو اس نے خود مت کر کے سنوارا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ”جس انسان کے پاس کر گزرنے کا عزم، ذہانت ہو، قابلیت ہو، خود پر اعتماد ہو تو میرا ہے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔“ وہ صرف اپنے کر نے تک جواد بھائی اور ان کی فیملی کے ساتھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا راستہ اس سے الگ کر لیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی گزارنے کے طریقے، محدود سوچ اور کئے ہوئے ماحول والے گھر سے اچھٹن ہوئی تھی۔ زمانہ میں آگے بڑھنے کی جستجوئی اور ترقی کرنے کی لگن۔ تعلیم چلو اگر انسان زیادہ حاصل نہ بھی کر پایا تو جب بھی اپنے لئے محنت اور کوشش کے درپے ترقی کی راہیں کھول سکتا ہے۔ مگر وہ تو کوئی کم سیزنگ کی طرح اپنے حال میں گن بنے ہوئے خوش تھے۔ باتیں ادا تھا انہوں نے تو کپڑے کی ل کی نوکری چھوڑ کر اپنی بیوی کے ہاتھوں کے ساتھ شراکت داری کر کے کپڑے کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ لیاقت آباد میں کراچی کی دکان اور شراکت داری والا محدود سا کاروبار۔ وہ انہیں ایک ناکام انسان کہتا تھا۔ محدود آمدنی، محدود وسائل، پانچ بچوں کے اخراجات، زندگی انہیں زندگی اشیاء، روزانہ جیواں کے گھر کو چھوڑنے کے بعد وہ اندرون سندھ سے آئے اپنے پانچ دوستوں کے ساتھ ایک گھر کے قریب میں رہا کرتا تھا۔

اس نے کوئی آسان زندگی نہیں گزار لی تھی۔ وہ محنت کر کے سختی جمیل کر اور کڑی مشکلات سے گزر کر اس مقام تک پہنچا تھا۔ لیکن یہ مقام اس کی نگاہوں میں کافی نہیں تھا۔ ابھی اسے آگے جانا تھا، بہت آگے۔ اسے ترقی کرنی تھی، بہت ترقی۔ ابھی جو کچھ اس نے حاصل کیا تھا وہ تو اس کی نگاہوں میں آغاز تھا۔ ترقی اور کامیابی کی شاہراہ اس کا پہلا قدم۔ آگے ایک لمبا اور شدار سفر تھا۔ وہ زندگی میں ناکام نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ اپنے پریشانی میں کامیابی کی آخری حد تک پہنچنا چاہتا تھا۔ ایک ملکی و دین الہی و اقوامی سطح کا پیاسا سمجھا جانے والا قابل اور ماہر بینکر۔ وائٹس کے جس فیئر میں وہ دو کروڑوں کے کرایہ کے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا، وہ وہاں نہیں بلکہ وائٹس کے سب سے آئی ڈی ٹی فیئر میں اپنے ذاتی دو تین ہزار گز کے بنگلے میں رہنا چاہتا تھا۔ جو گاڑی وہ رائج کرتا تھا، وہ دوسروں کو شاید اچھی لگتی ہو مگر اس کے معیار کے حساب سے وہ اچھی نہیں، بس صرف گزراؤ سے لائق تھی۔ وہ معمولی چیزوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لینے والا انسان نہیں تھا۔ اسے بڑا کڑی اور کامیابی کی انتہائی منزلوں کو چھو لینے والا خواہ اس نے اچھا لگا کر اس کے حصول کے لئے وہ محنت کرنے کی بات کر رہا تھا، کسی غلط راستے پر چلنے کی نہیں۔ اس کے سب خواب اس نے اپنی جگہوں پر سجائے تھے۔ جب اس شخص کو دل و جان سے اپنا لیا تھا تو اس کے خوابوں کو کیوں نہ بنائے۔

وہ ماہا کی محبت میں جلا ہو کر اپنی سوچوں کے برخلاف جلدی شادی کرنے پر توجہ ہو گیا تھا لیکن ابھی چند

سالوں تک وہ اپنی فیملی میں اضافہ نہیں جاتا تھا اور یہ بات اس نے ماہا سے اسی رات ہی کافی سنجیدگی سے کہی تھی۔ ”بچوں کی ذمہ داری بہت بڑی ہوتی ہے، ماہا! ماں باپ کا کام صرف بچوں پر نہیں بلکہ انہیں بہترین رہائش، بہترین آسائش اور بہترین تعلیم دینا بھی ہوتا ہے۔ میں اپنے بچوں کو دیکھا نہیں اور وہ کسی زندگی نہیں دیتا جاتا جیسی میرے باجی نے مجھے دی۔ اب میں بچوں کو ایک بہترین زندگی دینے کے لئے ماہا! مگر اس کے لئے میں چند سال انتظار کرنا ہو گا۔“ اس نے میرے یہ بات بغیر کسی اختلاف کے فوراً مان لی تھی۔ محبت کی ایسی مضبوط ڈور اس شخص کے ساتھ بندھ چکی تھی کہ اسے لگا کہ وہ اس کی کوئی بات بھی رو کر ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ ایک شخص، وہ ایک رشتہ، وہ ایک محبت، اس کی زندگی اب اس محو سے کبھی ہٹ نہیں سکتی تھی۔

وہ دن ان دنوں نے ساتھ یوں گزارے جیسے انہیں دنیا میں ایک دوسرے کے سوا کسی بھی شخص اور کسی بھی چیز سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ وہ اس کے ساتھ بہت گھمی، بہت انجوائے کیا اور وہ ہر بل اپنے رویوں سے اسے اپنی محبت کا مجر پورا انداز میں احساس دلاتا رہا۔

☆☆☆

ہنی مون سے لوٹے تو زندگی صرف گھونٹے پھر نے اور انجوائے کرنے والے دور سے نکل کر اپنے معمول پر آ گئی۔ ان کی شادی سے ہمید پھر پہلے ہی میراں نے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوا تھا، اس لئے ابھی اپارٹمنٹ پوری طرح فرشتہ اور کورڈ نہیں تھا۔ وہ میرے وہاں کا کرایہ بن کر بے ہوش ہوتے ہوئے بنی۔ اگر وہ اتنے دنوں میں اس کے مزاج کو کچھ سمجھتی ہوتی تو وہ یہ ضرور کہتی کہ یہاں کے سبائے وہ کسی سٹے اپارٹمنٹ میں نہیں رہ سکتے؟

وہ جینز میں جو فرنیچر اپنی تھی، وہ اس جگہ کے شاہان شان نہیں اور نہ ہی میرے معیار کے مطابق ہے، یہ بات وہ خود بہت اچھی طرح سمجھتی تھی۔ میرے اس کی اجازت سے وہ سارا فرنیچر فروخت کر کے نیا قیمتی اور خوبصورت فرنیچر خرید لیا تھا۔ نیا فرنیچر خریدنے میں سارے پیسے تو میرے ہی خرچ ہوئے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ وہ بھی اس نئے فرنیچر کے وہاں ج جانے پر بہت خوش تھی۔ اپنے گھر کی پہلی پہلی شادی اسے خوشی کے ساتھ فرمیں بھی جگہ جگہ کر تھی۔ ماہا! اچھا ملے گا پورے حق کے ساتھ اپنا کہہ سکتے والا ایک گھر آخر کار مل گیا تھا۔

☆☆☆

جس طرح میرے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بالکل سچائی سے بتایا تھا، اسی طرح اس نے بھی اسے پوری سچائی سے اپنے متعلق کچھ بتا دیا تھا۔ وہ سب جو کچھ کسی سے شہر نہیں کر پاتی تھی۔ دوستوں کے سامنے مجرم قائم رکھنے کو وہ بھی کی محبت، مظہر بالکل بالکالت اور بھائی بین کی چاہت کے چھوٹے تھے کھڑا کرتی تھی، مگر اس شخص کے سامنے اسے جھوٹی عزت اور جھوٹا مجرم قائم کر کے کسی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ساری دنیا میں اس کا سب سے زیادہ اپنا تھا۔ وہ کسی طرح کی شرمندگی محسوس کے بغیر اس سے اپنا ہر کچھ کہہ سکتی تھی۔

”تمہیں ایسی بیوی ملے گی جو کچھ کہے گا جی نہیں کرے گی۔ شوہروں کو بڑی آزادی کا احساس ہوتا ہے نا، جب یوں بیان کیے جاتی ہیں۔ تمہیں یہ احساس بھی نہیں ملے گا۔“ اس کے کندھے پر سر رکھ کر اس نے آنسو بہائے تھے، اپنے سارے دکھ اس سے کہے تھے اور اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو خشک کئے تھے۔ وہ رو کر جب وہ اپنا

دل ہلکا کر چکی تو ماحول کی اداسی دور کرنے کی خاطر قصداً شرارتی انداز میں یہ بات اس سے کہہ گئی۔

”تم اگر مجھ سے دور جاؤ گی تو مجھے آزادی کا نہیں بلکہ محسن کا احساس ہو گا۔ اچھا ہے کہ تم اپنی سی کے گھر نہیں جاؤ کرو گی، ورنہ اور کسی بات پر جھگڑا ہوتا یا نہیں، تمہارے وہاں جانے پر ضرور ہوا کرتا۔ میں تمہیں خود سے درواب کبھی دیکھ ہی نہیں سکتا۔“ وہ اسے اپنی بھینوں کا یقین دلانے لگا تھا اور وہ سرشاری ہوئی سی کے بازو پر سر رکھ کر سونے کے لئے لیٹ گئی تھی۔

☆☆☆☆

انہیں اپنی روٹین لائف پر آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے جب بابا کا رزلٹ آ گیا۔ اپنی توقع کے عین مطابق وہ بڑے شاندار اور نمایاں انداز میں کامیاب ہوئی تھی۔ میرے اس کی کامیابی کو بڑے جوش و خروش سے سلیم ریٹ کیا تھا۔ وہ بے تحاشا خوش تھا۔ اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس سے بھی زیادہ خوش ہے۔ اپنی تمام مصروفیات چھوڑ چھاڑ کر اس نے وہ ساری کامیابی کے نام کو دے دی تھی۔ ساری شام وہ دونوں ساتھ رہے پھر رات میں حیرت سے اسے فائبرسٹورٹ میں شاندار ڈیزائرنڈرگٹ میں اسے دانت کوٹنے کی جین دی جس میں ڈانڈز سے سجھا لاکٹ تھا۔ یہ گفٹ ہے شک بہت جتنی تھا مگر اس کی اصل قیمت یہ تھی کہ میرے لیے یہ خود اپنے ہاتھوں سے پہنایا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے احساس پایا تھا کہ اپنی خوشیاں وہ کسی کے ساتھ بانٹ بھی سکتی ہے، کوئی اور بھی ہے جو اس کی کامیابیوں اور اس کی خوشیوں کو اپنی کامیابیوں اور اپنی خوشیوں سمجھ کر بے تحاشہ خوش ہو سکتا ہے۔

ڈزکر نے کے بعد وہ دونوں بہت دیر تک سمندر کے کنارے ٹھہرے تھے۔ اگلے روز چھٹی کا دن تھا، اسی لئے بے فکری سے رات گئے تک جاگ کر انہوں نے بابا کی پسند کی موسیقی دیکھی تھی۔

اگلی صبح وہ دونوں باہر بیٹھ سو کر اٹھے تھے۔ انہوں نے ناشتہ اور پانچ ایک ساتھ ملا کر کیا تھا۔ وہ برتن دھوئے

میں مصروف تھی جب حیرت سے اسے آواز دے کر بلائی۔

”کیا بات ہے حوی؟“ اسے حوی کہہ کر بابا کو اچھا لگا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب وہ اسے اس نام سے بلاتی ہے تو اسے

میں محبت اور قربت کا احساس مزید مزید جاتا ہے۔

وہ اپنے سامنے انگریزی کی اخبار پھیلانے بیٹھا تھا۔

”یہ دیکھو میں نے تمہارے لئے کتنی ڈزبرسٹ چیز تلاش کی ہے۔“ وہ غور محسن پر اس کے برابر میں بیٹھ گئی اور پھر یہی طرح اخبار پر چمک کر اس اشتہار کو دیکھنے لگی جس پر میرے نے لکھی تھی۔ ایک ملٹی پلٹل سٹریٹس MBA کئے ہوئے Trainees کی ضرورت تھی۔ اس اشتہار کے علاوہ میرے تین اور اشتہارات پر بھی نشان لگا رکھا تھا، جن میں ایک اشتہار ایک لوکل کرش بینک کا بھی تھا مگر وہ زیادہ ایک سٹینڈ اس پبلے والے اشتہار ہی کے بارے میں تھا۔

”تم یہاں ایسا کرنا؟“ بابا کو ابھی یہاں جا رہی تھی کہ وہ آواز دے کر آجائے گا۔ اسے شاندار کیریئر والی جاہ اور اتنا بہتر میٹری کیلئے۔“ وہ اس کی ایک منٹ پر ہولے سے مسکرائی۔

”حوی! جاہ تو بہت اچھی ہے لیکن تیس تو فائبرسٹورٹ جاہ کیا بات میں کر پاؤ گی؟ میں اپنے گھر کو اور جہیں انکو نہیں کرنا چاہتی۔ صبح تم آفس جاؤ تو میں تمہیں دروازے تک جا کر پڑے اجتماع سے رخصت کروں اور

جب شام میں واپس آؤ تو تمہارے لئے بہت اچھا سا کھانا پکا کر رکھوں اور خوب اچھی طرح ہو کر ج سٹور کر تمہارا دروازے پر ہی استقبال کروں۔“

”تو کیا بابا تم نے علی نے MBA کرنے کی مشقت اس لئے اٹھائی تھی کہ وہ شادی کے بعد آج آلو کوشٹ پکاؤں یا کو بھی کوشٹ، جیسی سوچوں میں اپنا وقت گزارا کر رہی گی؟ اگر یہی کرنا تھا تو بی اسے بلکہ انٹر بھی تمہارے لئے کافی رہتا۔“ وہ دادا ابا والے اس کی عقلی سے بھر پور کچھ پر عمل کر سکتی تھی۔

”میں آلو کوشٹ اور کو بھی کوشٹ کے علاوہ دوسرے سامان پکانے کے متعلق بھی سوچا کروں گی، مگر مت کرو۔“ پھر اسے تھیں لکھوں سے گھورتا کہ وہ بھی قدرے عجیبہ ہوتے ہوئے ہوں۔

”میں نے یہ سب کہا ہے کہ میں گھر میں بھی رہوں گی۔ میرا مطلب تھا، میں کوئی بھلی پھلکی سی جاہ کروں، چائے پاس کرنے والی۔ مجھے کسی کیریئر Oriented جاہ کی طرف جا کر اور کسی عجیبہ و غریب طلب کیریئر کو اپنا کر اپنے گھر کو بلکل انکونین کرنا۔ کیا میری یہ سوچ غلط ہے؟“

”صرف طلب ہیں بلکہ ایک دم بوجاس ہے۔ اتنی بڑی ڈگری حاصل کر کے چھوٹی موٹی جاہ کرو گی؟ اتنی محنت کی ہے اتنا بڑھا ہے تو اس کا کچھ بڑن بھی تو انسان کو حاصل کرنا چاہئے۔ IBA سے ایم بی اے کی ہوئی تو کی، وہ بھی اسے شاندار طریقے سے، کوئی ایسی معمولی سی چند ہزار روپوں والی جاہ کرتی اچھی لگے گی؟ انسان کو اپنے کیریئر کے اشارت میں خوب سوچ سمجھ کر کیریئر راتے پر قدم رکھنا چاہیئے۔ جہاں میں کہہ رہا ہوں، وہاں جاہ کرنے سے تمہارا کیریئر بے گام آفتاب لڑی!

تمہاری جیسی ٹیلنٹڈ لوکی جاہ اور گھر سب کچھ ساتھ ساتھ لے کر چل سکتی ہے پھر ہم گھر میں افراد ہی کتنے ہیں؟ صرف دو۔ ہمارے گھر کا ایسا کیا کام نہیں جس پر تمہارے سب سے شک ہم گھر میں موجود نہ ہونے سے کوئی فرق پڑے گا۔ اگر تمہارا کیریئر ٹھیک پر چل پڑا تو چند سالوں میں تم کہاں سے کہاں پہنچ جاؤ گی۔“

”اچھا بابا تم جیتے میں ہادی۔“ وہ اس کے مضبوط دلائل سے بھری تھی تقریر کے جواب میں مسکرا کر بولی۔

”یہ ہے ہم اس طرح بات نہیں کر رہے جیسے بابا آفر ہو چکی ہے۔ بس اسے قبول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ مجھے کرنا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں فیٹ میں ہی لٹل ہو جاؤں یا وہ انٹرویو ہی میں مجھے ریجکٹ کر دیں اور اراڈوں کی کوکری ہمارے سر پر سے گر جائے۔“

”بھگن، ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔“ اس کے شرارتی انداز کے جواب میں وہ دنی میں سر ہلاتا بیچہ گی اور بہت یقین کے ساتھ بولا۔ ”میرا مشا بھی کسی جگہ لٹل نہیں ہوا تو اس کی بیوی کیسے ہو سکتی ہے؟“

☆☆☆☆

حیرت سے اس سے جہاں جہاں کہا تھا، اس نے ان تمام جہیوں پر اپلائی کر دیا تھا۔ اس کے پاس انٹرویو کے لئے کالز آ رہی شروع ہوئی تھیں۔ میرے زیادہ شدت سے اس کتنی سے کال کا انتظار تھا پھر آخر کار وہاں سے بھی اس کے پاس کال آ گئی۔ تب تک وہ تین جہیوں پر سے تو اسے جاہ مل جانے کی بوجھ لگی تھی حیرت اور انٹرویو کی تیاری کے سلسلے میں اس سے کہیں زیادہ بیچہ تھا۔ اس نے خود سامنے بیٹھ کر اسے ان دونوں چیزوں کی تیاری کر دینی تھی۔

”خوشی! میں پور ہو گئی ہوں، تبہاں سے منہ سے یہ ٹھٹھکا ہوا نہیں سن کر نہ کہنے دوں گے تم نے نہ مجھے یہ بتایا کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو اور نہ کہ میری برادری انھوں کی طرف دیکھنے کے بعد تم باقی ہر بات بھول جاتے ہو۔“ وہ دھیر ساری کتابیں سامنے سے ہٹا کر بائیں بھرے انداز میں اس کے کندھے پر سر رکھ کر بولی۔

”تم زیادہ میری نہیں لگ رہی ہو مجھے، اس لئے ڈر رہا ہوں کہ کہیں تم وہاں کچھ کڑوا نہ کر آؤ۔“ اس نے اس کی غیر تنہید کی اور غیر دلچسپی پر اسے سر ہٹا دیا۔

”اچھا اب تم سنجیدہ ہو جاؤ اور درد بہت کر لیٹو۔“ لہا اس کے کندھے سے سر ہٹا کر فوراً سنجیدہ ہو بیٹھ گئی۔ وہ اسے لیٹ ڈاؤن نہیں کرتا جانتی تھی۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ بابا بچہ حاصل کرے تو وہ اسے حاصل کر لیتا جانتی تھی۔ اور پھر اس نے حیدر کو لیٹ ڈاؤن کیا بھی نہیں تھا۔ پھر یہی اس کا امتحان اور امتداد ہے، وہ دونوں مراحل میں سرخرو ہوئی تھی۔ تین مہینوں کا ٹریننگ پیریڈ بہت بھانجے دوڑتے اور مصروف کرتا تھا۔ اسے اپنے آفس میں ایسی کارکردگی کا مظاہرہ کرنا تھا کہ وہ وہاں مستقل ملازمت کی حقدار قرار پا سکے اور اس مقدمہ کے حصول کے لئے اسے بہت محنت کرنی پڑی تھی۔ اور پھر اس کی محنت راپیگن بھی نہیں تھی، اسے وہاں مستقل ملازمت مل گئی تھی۔ حیدر اس کی جانب سے بہت خوش اور مطمئن ہوا تھا۔

لہا کی پوری کی پوری تنخواہ گھر کے اخراجات میں خرچ ہو جاتی تھی۔ وہ ایک سیدھے کچھ بچت کر بھی لیتی تو اچھے سیدھے گھر کے لئے کسی کی پیڑ پائی کے خریدے لئے پر وہ بچت خود بخود ہی ٹھکانے لگ جاتی۔

ان دونوں نے زہرے سے اشارت کیا تھا، اس سے شادی سے پہلے تک تو حیدر دوستوں کے ساتھ اپارٹمنٹ شیئر کر کے رہتا رہا تھا۔ مگر تو ان دونوں کا پہلا یہ تھا۔ چاہے کرایہ ہی کتنا ہی کم ہو، وہ اپنے گھر کو ہانے، بچانے اور سٹارٹ کرنے کے لئے ایک ایک کر کے گھر کی ضرورت کی ہر چیز خریدتی رہی۔ اپنی ساری تنخواہ خرچ کر ڈالتی تھی۔ حیدر اور وہ الگ الگ تو نہیں تھے۔ اگر اس کی پوری کی پوری تنخواہ گھر کے اخراجات میں خرچ ہو بھی جاتی تھی تو کیا ہوا؟ حیدر کی آمدنی جو اس کے مقابلے میں دو گنی تھی، وہ اس میں سے ہر ماہ کا رقم تنہا لیا کرتا تھا۔ یہ بچت ان دونوں ہی کی تھی۔ ان دونوں کے اس گھمسنے کے لئے یہ رقم جمع ہو رہی تھی جو ان کا ہونا ہوگا۔ اپنے ذاتی گھر کا خواب اس کا اور حیدر کا مشترک خواب تھا۔ اکثر وہ دونوں گھنٹوں بیٹھ کر اپنے گھر کے بارے میں باتیں کیا کرتے۔

”ہم اپنے گھر کے لان میں ایک حصے میں صرف گلاب ہی گلاب لگائیں گے۔ سرخ، سفید، گلابی، بہت سے رنگوں کے گلاب۔“ وہاں کا لان کیا ہوا گلابی بات بھی بے شرع ہوتی وہ فوراً نہ کیا کرتی اور جب یہ باتیں ہو رہی ہوتیں، وہ ہچکے سے دل میں یہ بھی سوچا کرتی کہ ان کے بچوں کا کمرہ کس طرح کا ہوگا؟ ان کے درمیان بچوں کے موضوع پر بہت زیادہ بات نہیں ہوتی تھی۔ ہاں حیدر پر ضرور کتا تھا کہ وہ بچوں سے آگے اپنی فطرتی نہیں بڑھائیں گے۔ وہ ابھی سے اس وقت کی سوچ کر دل میں انوکھی سی خوشی اور سرشاری محسوس کرتی۔ وہ وقت جب وہ ماں بنے گی، اس شخص کے بچے کی جیسے وہ دل و جان سے چاہتی ہے۔ اپنا آپ کتنا مستعد اور کتنا مکمل لگنے لگے گا اسے اس وقت۔ وہ اس آنے والے وقت کا بہت میرے انتظار کر رہی تھی۔

اسے حیدر کی ہر بات ادھی گنتی تھی۔ جس جواد بھائی کے ساتھ اس کا رویہ اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس موضوع پر کئی بار ان میں ٹکرا ہوا ہوتا ہوا روتی تھی۔ جواد بھائی میرے واقفی بہت محبت کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اسے اپنی محبت سے واپس آنے کے چند روز بعد ہی ہو گیا تھا۔ کتنے پیار سے وہ ان دونوں کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دینے آئے تھے اور حیدر نے انہیں روکے انداز میں صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے انکار پر ان کا چہرہ کیسا بھجھ گیا تھا۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس انکار میں اس کا کوئی دخل نہیں تھا۔ پھر یہی وہ مشر مندہ ہو گئی تھی۔ وہ ان کے گھر بٹھائی اور پھل بھی لے کر آئے تھے۔ حیدر نے ان میں سے کسی چیز کو کھانا کھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ چیزیں اس کے میزبان کی نہیں تھیں۔

”ہمیں جواد بھائی کے گھر جانا چاہئے تھا تو؟“ اس نے پیار سے ہمیں انوائٹ کرنے آئے تھے۔ ”ان کے جانے کے بعد وہ دل پر بوجھ سا محسوس کرتی میرے بولی۔ حیدر اس کی بات سن کر اس کی کہنے کے اس کے ہاتھوں میں پڑی چیزوں سے کھینچ رہا۔

”کون سا ہم دونوں کے کوئی بہت دھیرے سارے رشتہ دار ہیں۔ ایک جواد بھائی ہی تو ہیں، انسان خوبی رشتوں سے کٹ کر تو زندگی نہیں گزار سکتا۔“

”فارگاہ ڈیسک! ہائیڈرو پوسٹ کرو یا! یہ فضول قسم کی نصیحتیں کر کے تم میرے رومانک موزک سٹیشن اس کر رہی ہو۔“ اس وقت وہ چپ ہو گئی تھی مگر وہ کچھ بھی نہیں کہنے کا نظر انداز کرنے اور جب آجیمر انداز اختیار کرنے کے باوجود جواد بھائی ان لوگوں سے ملنے آئے اور فون پر بغیر یہ دریافت کرنا بھی نہیں بولتے تھے۔ وہ بھائی کی کامیابیوں پر بہت خوش ہوتے تھے، انہیں اپنے قابل بھائی پر بڑا فخر تھا۔ حیدر کے رویوں کی تلافی کرنے کے لئے وہ خود ان سے بہت اچھی طرح ملتی تھی۔

☆☆☆

میری نکل بھی اس کی زندگی میں شامل رہی تھی اور نہ آج تھیں پھر بھی وہ ہفت میں ایک بار انہیں فون ضرور کر لیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی وجہ سے وہ فون نہ کر پاتی تو کسی اسے خود فون کر کے اس کی خبر لے پوچھ لیا کرتی تھیں۔ تین، چار مہینوں بعد وہ کھڑے کھڑے کسی کے گھر بھی ہو آتی تھی۔

ان کی شادی کی دوسری سالگرہ سے چار ماہ پہلے پیر کا پروموشن ہوا تھا۔ اپنی ترقی کی خوشی میں اس نے لہا کو بلک پرل کے انٹر ٹیکٹ کٹے تھے۔ اس موقع پر وہ خوش تو تھا مگر حیدر انہیں اس کے فون کرنے کے لئے انہیں سراہا تھا۔ وہ ڈالا ہو۔ جو میسر اس نے خود اپنے لئے کر رکھا تھا، ابھی وہ اس سے بہت دور تھا۔

☆☆☆

رات تقریباً پونے نو بجے دروازے پر تیل ہو گئی تھی۔ اس نے بھاگتے ہوئے آکر دروازہ کھولا۔ حیدر نے اندر داخل ہوتے ہی اس کی تیار کی کھانہ دیکھ کر ہلکا سا ہنسا دیا۔

”آج کیا نہیں کھیں جانا تھا؟ تم نے مجھے یاد کیوں نہیں دلایا فون پر؟“ وہ اس کی فون کا ل اور اب اتنی ذہن دہشت تیار کی دیکھ کر کئی اندازہ لگایا کہ شاید آج وہ کسی پارٹی میں اڑا بیٹھ ہیں۔

”جانا تھا نہیں، جانا ہے۔ آج تم مجھے باہر ڈنکرانے لے جا رہے ہو، کیسے بہت اچھی جگہ پر کیونکہ آج میں

نے گھر پر رکھا، نہیں پکا ہے، اس لئے۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لاتے ہوئے سہم لہجے میں بولی۔ وہ نہ سمجھ میں آنے والی لگا ہوں سے اسے دیکھا، اس کے ساتھ اندر گیا اور جیسے ایڈجسٹ ٹیلیفون پر اس کی نگاہ پڑی، وہ ٹھیک کر وین پر گھبرا گیا۔ ٹیلیفون کے پتھن چل کر کھا خوبصورت سائیکل اور اس پر لگی دو تھم قیام جوتیل کی آواز سننے ہی اس نے ہلا بھی دی تھیں۔

”ماہا! وہ آج کچھ بھی نہیں بول پایا۔ اس کے چہرے پر ایک دم ہی شرمندگی پھیل گئی تھی۔ شاید ہانا پھیلے سال کا وہ وعدہ بھی یاد آ گیا تھا جو سالگرہ بھول جانے پر اس نے یہ کہہ کر کہا تھا کہ آئندہ اس دن کو ہرگز نہیں بھولے گا۔“
”پتلی! اپنی دوسری حوی!“ وہ اس کے گھٹے میں ہاتھیں ڈال کر سکرما رہے ہوئے بولی۔
”ماہا! آتم سواری میں بھر بھول گیا۔ تم نے مجھے یاد دیکھ نہیں دلایا؟“ وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

”ہاں واقعی یہ تو میری غلطی ہے، مجھے یاد دلانا چاہئے تھا۔“ شرارتی سے لہجے میں مسکراہٹ دباتے ہوئے جیسے بڑی آسانی سے اپنی غلطی مان گئی تھی۔ ”اب تم ایک کات لیں“ وہ حیران وارح ٹھیک کی سمت کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں گویا ہوئی۔ ”اس کے بعد میں تجھیں فریش ہونے کے لئے صرف دس منٹ کا ناٹم دے والی ہوں کیونکہ مجھے بھوک بہت شدید لگ رہی ہے اور گھر میں کھانے کو آج واقعی کچھ نہیں ہے۔“ وہ چہرہ پر ہاتھ میں پکڑ کر کھٹکھٹائی۔ ان دونوں نے مل کر سوہم بتایاں بچا لیں، ٹھیک کاٹا اور پھر اسے ایک دوسرے کو کھلایا۔
”میں تمہارے ساتھ اسی طرح اپنی شادی کی پیچیدہیوں، چالیسویں، بلکہ پچاسویں سالگرہ بھی منانا چاہتی ہوں۔ یونہی تم بھول جاؤ اور یونہی میں نہیں یاد دلادوں۔“

”پچاسویں سالگرہ یعنی پچاس سوہم بتایاں۔ پچاس سوہم بتایاں ٹھیک پر سامنے کی کیسے؟“
”کوئی مسئلہ نہیں ہے، میں ٹھیک بہت باورسائیکل کروں گی۔ اتنا بڑا کہ اس پر پچاس سوہم بتایاں لگائی جائیں۔“
وہ اسے ڈنکرانے لے آیا تھا اور ڈنکرانے ہوئے وہ دونوں اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ اس کا تختہ اور کارڈ حیران کو پسند تو بہت آئے تھے مگر وہ خود اس کے لئے کچھ نہیں لگا سکا۔ اس بات پر وہ خاصا شرمندہ تھا۔
”تم نے میری ذرا بھی تعریف نہیں کی۔ تم نے اچھا تو آئینہ ہے جس نے تم کو کم مجھے تو بتا دیا تھا کہ میں اچھی لگ رہی ہوں۔“ اپنی ناچاری خوبصورتی سے بے نیاز رہتے والی لڑکی کو اب اپنی تعریفیں سننا اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ اس کے شکوے پر مسکرایا مگر بولا کچھ نہیں۔

”حوی! کیا میں ابھی نہیں لگ رہی؟“

”ابن ٹھیک لگ رہی ہو۔“ میرے بڑی تنبیہی سے جواب دیا۔

”ابن ٹھیک؟“ ہاں، آج میں پارلر میں کتنے پیسے خرچ کرتی ہوں؟ اور یہ ساڑھی جو میں نے خاص آج کے دن کے لئے خریدی تھی، کتنے کی ہے۔ میری نہیں تو کم از کم ساڑھی ہی کی تعریف کرو۔“ ڈنکرانے کے دوران وہ یونہی اسے اپنی تعریفیں کرنے کے لئے آکسانی رہی اور وہ ”ٹھیک لگ رہی ہو“ کہہ کر کہہ کر چہرہ پر ہانگروا ہوں سے واپس آنے کے بعد جیسے ہی وہ اپنے اپنا رشتہ میں داخل ہوئی، میرا اس کے شانوں کے گرد ہاتھ کر کے اسے اپنے قریب

کرتے ہوئے اس کے کان میں دھم آواز میں بولا۔
”تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو! اور تمہارے خوبصورت لگنے میں اس ساڑھی کا کوئی کمال نہیں کیونکہ مجھے تو تم ہمیشہ ہی خوبصورت لگتی ہو۔ کبھی یہ سوچنے لگوں کہ اللہ نے مجھے جو کچھ بھی دیا ہے اس میں میرے پاس سب سے جتنی کیا ہے تو میرے ذہن میں صرف تم آتی ہو۔ تم میرے لئے بہت اہم اور بہت نایاب ہو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں ماہا!“

”کتنے دنوں بعد آج اتنے دل سے تم نے میری تعریف کی ہے۔“ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر دھم سے لہجے میں بولی۔

”دنوں کو یاد رکھتے اور انہیں منانے کا یہی فائدہ ہوتا ہے حوی! ہم زندگی کی مصروفیات اور بھاگ دوڑ میں الجھ کر، اپنے کاموں میں لگ کر خود سے وابستہ ان لوگوں کو جس سے ہمیں بہت محبت ہوتی ہے، اکثر یہ نہیں بتا پاتے کہ ہمیں ان سے کتنی ہے تمنا محبت ہے۔ جیسے آج تم نے کتنے سارے دنوں بعد مجھے یہ بات پھر سے بتائی کہ میں تمہارے لئے کتنی اہم ہوں۔ میں چاہتی ہوں، سال بھر میں کم از کم ایک آج کے دن ہم دونوں صرف ایک دوسرے کے لئے ہوں۔ ایک دوسرے کو یہ یاد دلانے کے لئے کہ ہمیں اب بھی ایک دوسرے سے پہلے جتنی ہی محبت ہے۔ گزرتا وقت ہماری محبت میں کمی نہیں بلکہ اس میں اضافہ کر رہا ہے۔“ میرے جیبا کہا تھا، وہ واقعی اس کے ساتھ دلی ہی زندگی گزار رہی تھی۔ انتہائی خیر رفتار، اتنی سچی، ہوائی ہوئی کر فرست کے نکلتا ان کے درمیان بہت کم آتے تھے۔
”کتنی جلدی دو سال گزر گئے، پتا ہی نہیں چلا ماہا!“ کتنے دنوں بعد آج وہ دونوں اپنی فرست سے اپنی باتیں کر رہے تھے۔ آج حیران کی آنکھوں میں خیر اور حسن محبت تھا بلکہ صرف محبت حوی اور وہ اس کی یہ بات مان رہا تھا کہ دونوں کو یاد رکھنا چاہئے، انہیں سلجھ بٹ کرنا چاہئے۔“

”مجھے تمہارا اچھا لگے حوی! جب ایک روز تم مجھ سے کہو گے۔“ کتنی جلدی کچیس سال گزر گئے، پتا ہی نہیں چلا ماہا!“ وہ جواباً قہقہہ کر رہی پڑا۔

”بہت جلدی ہے کچیس سال گزارنے کی۔ کچیس سال بعد تم بڑی سچی ہو جاؤ گی۔ پہلی بار دیکھا ہے کہ کوئی لڑکی اتنی شرم سے بے حوا ہے کہ اتنا کہے۔“ میرے قہقہے میں اس کی ہنسی بھی شامل ہو گئی تھی۔

”اگلے سال میں آج کے دن کو ہرگز نہیں بھولوں گا کہ فروری کو ہی اپنے آئینے کے اور گھر کے کینڈرو پر سولہ فروری کی تاریخ کو کوئی اہم کر دوں گا اور گفت تو تمہارے لئے جودی کے آخری میں خرید کر رکھ لوں گا۔“ وہ جواب میں کچھ کے بغیر شرارتی مسکراہٹوں پر لئے اور ہنسنے لگا۔ وہ دھم سے گھورتے ہوئے بولا۔
”تمہیں لگ رہا ہے میں بھر بھول جاؤں گا؟ دیکھ لینا، اب میں کبھی نہیں بھولوں گا۔“

”میں لگ رہا ہے کہ کبہ کہ رہی ہوں، مجھے ہاں ہے تم یاد رکھو گا۔“ وہ دھم سے گھورتے ہوئے مسکراہٹ اپنے لبوں پر دیکھتے ہوئے فوراً بولی۔

رات کو ساڑھیں میں سے ٹھیک ہاتھ لگنے کا اثر یہ تھا کہ صبح آٹھ ڈھکڑا مشکل سے کھلی۔ روز وہ الارم بجنے سے پہلے اٹھ کر بیڈ سے جاتی تھی جبکہ آلام صبح سے بھی مشکل کی آٹھ کھلی۔ حیرانے خبر پر ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پر پھر سے باڈن

”کل لوگ بی بی می ڈنکر کرتے ہوئے خوب صورت لگ رہے تھے۔“ فائز اس کے کہیں میں داخل ہوئے کے بعد اس کی میز کے آگے سے کسی ٹھیکٹہ کس پر دم سے بیٹھے ہوئے بولا۔ وہ یونگی شور مچاتا اور بنگے کرتا تھا۔ وہ کپیر پر اپنے کام میں مصروف تھی، اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تم میری جاسوسی کر خوشی میں کر رہے تھے؟“ فائز عید آئی بی بی اس نے اس کے ساتھ تھا۔ کپیر مڑا سٹاپ پر کی طرف ہونے کی وجہ سے وہ ماہا کلاں ٹیلو تو ہرگز نہیں تھا مگر چونکہ وہ کلوم کا فرسٹ کزن تھا اور اس کے ساتھ اس کی دوستی بھی تھی، اسی لئے وہاں اسکاں لوگوں کے پاس آتا رہتا تھا۔ ڈین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بلا کا بڈ لنگ اور حاضر جواب تھا۔ اپنی ریز دور رہنے والی عادت کے برخلاف اس کی فائز سے آئی بی بی اس میں ان ملاقات کے چند مہینوں ہی میں دوستی ہوئی تھی بلکہ یہ تعلق ظاہر ہے کہ اس نے دوستی کی تھی، وہ خود ہی اپنے بے تکلف انداز سے اس کا دوست بن بیٹھا تھا اور یہ شخص اتفاق تھا کہ جب ماہی نے یہ کہنی جو ان کی، تب اس سے ایک ماہ قبل ہی وہ بھی اسی کہنی کو جوان کر چکا تھا۔

اپنے پیپے کے ٹھیک خاک قسم کے برنس اور ان کی کہنی کو چھو کر اس نے یہاں صرف اس ضد میں ملازمت اختیار کی تھی کہ وہ اپنے مہما، پاپا اور تمام قریبی احباب کو جنہیں اس کی صلاحیتوں پر اگر کچھ تھا تو یہ دیکھ کر دور ہو جائے کہ وہ اپنی قابلیت کے مل بوتے پر ایک نئی شخص کہنی میں بی سانی ملازمت حاصل کر سکتا ہے۔

وہ یہاں سسٹم اینالسٹ کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا مگر ڈیپارٹمنٹ الگ ہونے کے باوجود وہ اسکاں اس کے پاس آ جا کر تھا تھا۔

”میں نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ ویسے تم نے اگر مجھے دیکھا لیگا تو آ کر ملے کیوں نہیں؟“ میں تمہیں حیر سے ملوانی۔ ”مونیز سے نظریں پٹا کر اس نے فائز کو دیکھا۔

”جس بندے سے میں دن کے چوتیس میں سے سترہ گھنٹے جلا رہتا ہوں، اس سے مل کر کیا کرتا۔ ویسے سات گھنٹے میں نے سونے والے باتیں کئے ہیں۔“ وہ کراہتی اٹھیں۔ ”بھاتا افسردگی سے بولا۔“ میں بے چارہ تو سوچتا ہی رہ گیا کہ ذرا ایم بی ای کے مکمل کرلوں اور کوئی معقول سی جاب حاصل کرلوں پھر اس لڑکی سے حال دل کوں گا مگر وہ بندہ تو مجھ سے کہیں زیادہ اسارت لگا۔ لے اڑا اٹھا رہے اٹھنیوں کی سب سے خولہ تو لڑکی کو۔“ اپنی بے گلی باتوں کے دوران وہ غصہ آجی آپس بھرتا نہیں بولا۔

”ذرا کسی دن میرے مہاں کے سامنے کرنا بے بکواس۔ وہ اچھی طرح تمہاری مزاج پر ہی کرے گا۔“

”اچھا اچھا اب اپنے اس ہیرو کے ڈراوے مت دو دیجئے۔ ویسے وہ بندہ تمہاری کچھ قدر شہر کر رہا بھی ہے یا نہیں۔ کلوم میں ہے، مشکل ہے کہ یہ لڑکی کسی لوگ لوگوں کو اپنی اہمیت کا احساس دلا سکے۔ ذرا دانا تو کتا جاتا ہی رہا مگر تم کو کہہ دو دنیا کے خوش قسمت ترین انسان ہیں، جنہیں اتنی اچھی پوری ملی ہے۔“ وہ کئی سیٹیوں والے انداز میں اسے گر کی باتیں کھانے لگا۔

”وہ خوش قسمت ہے یا نہیں، یہ تو نہیں معلوم مگر میں واقعی بہت خوش قسمت ہوں جو مجھے میرا جیسا شوہر ملا ہے۔“ وہ بارہ مٹیڑ کی طرف متوجہ ہوئے ہوئے وہ بہت عجیبہ اور پرنسٹین لہجے میں بولی۔

کوا اپنے ہاتھوں سے پیچھے جٹاٹے ہوئے اس نے اسے آواز دی۔ اس نے اپنی سوتی ہوئی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو وہ اسے اٹھنے کا کہہ کر بالوں میں کلپ لگائی بستر سے اٹھ گئی۔ صبح وہ اپنے تیاری اور ہاتھ کی تیاری ساتھ ساتھ کرتی تھی۔ آلیٹ کی پلٹ نیل پر رکھ کر وہ تیزی سے کمرے میں آئی تو وہ ہنوز بے خبر گہری نیند سوتا نظر آیا۔

”اوہ ماہی گاڑ!“ اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”خوبی ماہر ہوگی، اٹھو۔“ اس نے زور سے اس کے کندھے کو ہلایا۔

دیر کا لفظ سنتے ہی وہ فوراً اٹھ بیٹھا اور جیسے ہی اس کی نگاہ کھڑکی پر پڑی وہ پھلکاٹے ہوئے انداز میں بستر سے چھلاگ مار کر اتر آیا اور بغیر کچھ کہے سے عید باجھ روم میں گیا۔ کپڑوں کے ساتھ ہی دیگر بھی گاڑی لٹکا کر وہ انکس بیڈ پر رکھ کر باہر لگا اور تیزی سے ناشے کی چیزیں مڑے میں لگائی۔ وہ ناشے کر کے میں واپس آئی تو وہ بڑ بڑکھانے شرت کے من بند کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے وائٹ میں سے کچھ تلاش بھی کر رہا تھا۔

”دیر ہوگی، میں ناشے بالکل نہیں کر سکتا۔“ اپنی آپورٹنٹ ٹیننگ ہے۔ آج تو مجھے اسے بھی پہلے لکھنا تھا۔“ وہ اس کے ہاتھ میں مڑے دیکھ کر غلٹ مڑے انداز میں بولا۔ وہ سیٹو وچ اٹھا کر اس کے پاس آئی۔

”میں ناشے نہیں کروں گا ماہا!“ اس نے لپٹ کر دیگر میں سے گاڑی نکالی اور اسے گھسے میں ڈالتے ہوئے اسے ایک مرتبہ پھر متنگ کیا۔

”تم اپنی تیاری کرو۔“

”میں تمہیں کیا کہہ رہی ہوں، ناشے تم سے کرو گے اور تیاری ہاتھوں سے۔“ دونوں کام ساتھ ساتھ ہو سکتے ہیں۔“ اس کے پاس اس وقت بحث و مباحثہ اور کار کا بھی تاہم نہیں تھا، وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگ کر اپنے ہاتھ سے اسے سیٹو وچ کھاتی رہی۔ بریف کیس میں فائز کیس کے رکھے وہ اس کے ہاتھ سے سیٹو وچ کھانے کے ساتھ ساتھ اور جگہ جوں کا پورا لگاں بھی لی پکھا۔ اپنا ٹاکٹ، موہاں اور بریف کیس اٹھا کر وہ کمرے سے باہر نکلا تو وہ اس کا وائٹ لے کر تیزی سے اس کے پیچھے آئی۔

”اوووہ“ شخصکس ماہا! اور اسے آٹھ سو روپے ہیں، تمہاری وین کھل گئی۔ چلو میں تمہیں ڈراپ کر دوں۔“ اس کی تیاری میں لگ کر وہ خود آج لیت ہوئی تھی۔

”مجھے ڈراپ کر کے تو تمہیں اور در نہیں ہو جائے گی؟ تم جاؤ، میری فکر مت کرو، میں چلی جاؤں گی۔“ ہاں ڈرائیو اعتبار سے کرنا، کہیں دیر ہوگئی کہ پکڑ میں ریش ڈرائیو تک نہ لگوں۔“ وہ دروازے تک اس کے ساتھ ساتھ آئی اور اسے سیٹو وچ ڈرائیو تک کی نصیحت کرتی نہیں بھولی۔ لیہ مگر مختلف کاموں کے پیچھے چھوڑتے رہنے کے بعد انسان رات گئے تک بھی کاموں ہی میں الجھا رہے اور خود کو آرام نہ دے تو صحت کا کیا حال ہوگا۔ کیسے خبر ہو کر گہری نیند سو رہا تھا وہ۔ دیر ہو جانے کے سبب وہ بغیر ناشے کئے اپنا فرسٹ کا دروازہ لاک کرتی باہر نکل تو میری سے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس کا دل اسے اتنی گہری نیند سے جگانے پر ذرا خوش تھا تھا۔ وہ اس کی صحت کا سوچ سوچ کر کڑھ رہی تھی۔ وہ خود غالی پینت گھر سے جاری ہے اسے خیال ہی نہیں آیا تھا۔

”اب تم اس طرح میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ تمہیں کچھ اپنا کام دام ہے بھی یا نہیں۔“ وہ پرنس میں جھجکا رہی تھی۔

”جیلس ہو رہا ہوں اس بندے سے جس کے تم پر وقت گمن گانی ہو اور دعا کر رہا ہوں کہ وہ تم جیسی اچھی لڑکی کی ہمیشہ قدر کرے اور جناب کا سونامیہ ہے کہ کچھ ناخام ہو چکا ہے، میں یہاں سے گزرتے ہوئے آپ کے کہیں کے پاس اسی لئے رکھا کہ کچھ ناخام ہو جانے کی اطلاع دے سکوں۔“ وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”چلو کی میرے ساتھ چل کرے؟“

”نہیں، میں نے اپنے لیے بیٹیں پر سینڈویچ اور جوس منگوا لیے۔“ اس نے قطعیت سے انکار کیا۔
 ”ہمارے ایک قسمت کہاں کہ مسز باہا حیر رضا ہمارے ساتھ چلے گا تو زکریاں۔ لڑکی تم نے مسز میں بہت جلدی کی ہے۔“

”فائز! تم یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ، ورنہ میں ابھی زارا کو نوٹ کرتی ہوں۔“ اس نے معصومی ناراضی سے اسے گھورتے ہوئے زارا کا نام لے کر اسے دھمکا یا جو اس کے اٹھل کی بجلی ہونے کے علاوہ اس کی محبت بھی تھی اور ایک بہت ہی عقیدہ دار لے چڑے ہوئے فائز کے بعد بھی اجماع پائی تھی۔ زارا اور فائز کو کسویں صدی کا رومیو جوئیٹ یا پٹلی بھوں بڑے آرام سے کہا جا سکتا تھا۔ ”چلے جاتے ہیں جناب، ویسے کچھ آؤنی آؤنی خبر ملی ہے میں مسز باہا حیر رضا کے پر دوشوں کی۔“

”واقعی تم جی کچھ کہہ رہے ہو۔ کس سے سنا تم نے؟“ وہ ابنا سب کا چھوڑ چھاڑ کر خوشی دینے لگی۔
 ”کیلیٹ میں اس سے پوچھنے لگی۔ وہ اس کی بے قراری پر مسکرایا۔

”ابھی تو جیسن نکالا جا رہا تھا۔ کچھ بے یارو! دینا ہے ہی مطلب کی۔“
 ”اچھا، صاف صاف بتاؤ ساری بات۔“ وہ واپس اس کے پاس آکر اسے اس کے مطلوبہ سوالوں کے جواب دینے لگا۔

رات کو زکریاں سے ہوئے اس نے اپنے مکان پر دوشوں کی خبر حیرت انگیز سنائی۔ جیسن عہدے پر اسے ترقی ملنے کا امکان تھا اس عہدے پر ترقی پانے کے ممکنہ ذریعہ وار اور ابھی تھے۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ کیریئر والی جاہ ہے۔ یہاں تم نے اپنی جگہ بنالی ہے، اب دیکھن تم کتنا آگے تک جاؤ گی۔“ حیرت فز کے دوران اس کی جاہ اور کیریئر کی معقول پائیں کار ہوا۔

”جکھن سہیلے، اپنے اگلے دن اپنے پینتے والے کپڑے استری کرنے اور دیگر ضروری کھیلے کاموں سے نارغ ہونے کے بعد وہ حیر کے لئے گلاس میں دودھ لے کر کرسی پر آئی۔ وہ کپڑے کے سامنے بیٹھا تھا۔ اسے اس کی صبح کی وہ مگبری نیند ابھی بھولی تھی جی، اس لئے دودھ کا گلاس اس کے قریب رکھ کر کھنگلی سے گویا ہوئی۔

”آج تم آریٹک جاگ کر کوئی کام نہیں کرو گے۔ دوپہر، دوپہر، دانت برش کرو اور اچھے بچوں کی طرح لیٹ کر سو جاؤ۔ یہ کام بھی تم نہیں ہوگا، ہاں اس کے پھر میں تمہاری صحت ضرور خراب ہو جائے گی۔“ وہ بڑی تیز رفتاری سے کی بورڈ پر انگلیاں چلا رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا مصروف تھا کہ اس نے نہ اسے سر اٹھا کر دیکھا اور نہ پاس رکھے

دودھ کے گلاس کو۔

”خیر! میں تم سے بات کر رہی ہوں۔“

”میں نے تم کو کیا ہے! میں دودھ پی لوں گا تم پلینر مجھے ڈسٹرب مت کرو۔ یہ رپورٹ بہت اہم ہے اور مجھے اسے آج برقیات پر مکمل کرنا ہے۔“ اس نے فوہر کے لئے اپنے سامنے رکھے صفحات اور کی بورڈ سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ ”میرے مطلب کا کام کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہ رپورٹ احسان کے خالے کر دی تھی اور دیکھو زار کیا خوش کیا ہے تمہارے اس کا۔“ اس نے اپنے سامنے رکھے صفحات کا پلندہ ہاتھ میں اٹھا کر بہت طے سے اسے دکھایا۔

”اتنا کام تو میں بھی کر سکتی ہوں حوی! اور یقین کرو، میں بالکل تمہارے مطلب کا کام کروں گی۔ تمہارے لئے آج پوری نیند سنا بہت ضروری ہے۔ پچھلے کتنے سارے دنوں سے تم ڈھنگ سے پوری نیند سونے تک نہیں ہو۔ خدا کے لئے تم کرو اپنے حال پر۔“ اس نے اسے ہاتھ پکڑ کر کرسی پر سے اٹھانے کی کوشش کی۔
 ”تم۔۔۔ لیکن ماما۔۔۔“

”لیکن وہ کیوں کہتیں، یہ کام میں کر رہی ہوں اور یقین رکھو تمہارے احسان صاحب جیسی کوئی گزبڑ میں نہیں کر دے گی۔“ اس نے اسے زبردستی وہاں سے اٹھا دیا اور پھر بند کر کے اسے مسز پر لیٹ جانے پر بھی مجبور کر دیا۔ وہ واقعی اتنا تھا کہ اٹھا کر مسز پر لیٹنے یا دوسرے کاموں میں اور دھرو میں اور دھرو میں اسے غافل کبری تید سو گیا، اس کی نیند کو کسرے کی جلی ہوئی لائٹ تک ڈسٹرب نہیں کر رہی تھی۔ وہ اگرچہ بوئی احتیاط سے کام کر رہی تھی۔ کسی قسم کا کوئی شور مچا پیدا نہیں ہونے دے رہی تھی مگر پچھلے پچھلے وقت پر نرک کا مخصوص شور جب سنانے میں گویا تو اس نے فوراً پلٹ کر تید کر دیکھا، وہ اسی طرح بے خبر رہا تھا۔ یوں جب وہ تمام صفحات کے پرنٹ آؤٹس لینے اور کپیڈ بند کرنے کے بعد مسز پر آئی تو سوا چار بج رہے تھے۔ اس کی آنکھ کتنے دلی تھی جب سوتے میں حیر نے کمرٹ بدلی اور اس کا ہاتھ ماما کے کندھے سے گھرایا۔

”کام ہو گیا ماما؟“ اس نے غنودگی میں اس سے پوچھا۔ کٹاٹ کے شدید احساس اور نیند کے غلبے کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آئی۔ سوتے میں بھی اسے اپنے کاموں کی ٹینشن تھی۔
 ”سو تو سکون سے چایا کیجیے مسز حیر رضا! ہاں ہو گیا۔“ اسے اطمینان دلاتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

صبح اس کی آنکھ اسے متحیرہ وقت پر مکمل تھی حوی اور اٹھنے یا اسے یوں لگا تھا جیسے ابھی تو آنکھ کی تھی۔ آج میری صبح وقت پر جاگ گیا تھا۔
 ”ٹھیک ہو ماما!“ حیر نے کھڑے کھڑے رپورٹ پر لگا ہوا میں اور پھر مطمئن ہو جانے والے انداز میں اسے اپنے برف کیس میں رکھ دیا۔

”تم مجھے اپنی ٹیکری بائٹ کرلو، میں تمہارا سدا کام بالکل ٹھیک کیا کروں گی تمہاری مرضی کے مطابق۔“
 ”اچھی خصوصیت اور اچھی ڈیزائن ٹیکری، پھر تو میں گھر آیا ہی نہیں کروں گا۔ سارا وقت آفس میں رہا کروں گا۔“ وہ ماما کے شرارتی انداز کے جواب میں ہنسنے ہوئے بولا۔

وہ آفس جانے کے لئے اپنے اپارٹمنٹ سے نکل آئی تھی۔ لفٹ سے اتر کر اس کی نگاہ رویکا پر پڑی۔ ان کی بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر رہنے والی جاپانی میاں بھوی کی دو سالہ بیٹی۔ باوجود اس کے کہ اس وقت اس کی دین آنے کا نام ہو رہا تھا پھر بھی وہ رویکا کو بچہ کے بغیر وہاں سے کیسے جا سکتی تھی۔ وہ اتنی چھوٹی سی اور اتنی چارسی تھی۔ واقعی جاپانی لڑکی اور جب اپنی ماں سے ہاتھ چمڑا کر وہ تیز چلتی تو اس کا دل پاتا، وہ گود میں اٹھا کر اسے خوب پیار کرے۔ اس کی جاپانی پڑپون اپنے مخصوص تہذیبی انداز کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے سامنے کچھ بھی اور بھراس کی خیریت دریافت کی۔ اس نے بھی جوابا اس کی خیریت پوچھی اور اس دوران رویکا گودگو میں اٹھا کر جلدی سے اس کے دونوں گالوں پر پیاری مٹی کر لیا تھا۔

آفس میں ایک اور مصروف ترین دن اس کا منتظر تھا آج تو آفس سے واپسی میں سیدھے اپنے اپارٹمنٹ جانے کے بجائے اسے کلثوم کے گھر جایا تھا۔ کلثوم کے جڑواں بچوں کی پہلی سالگرہ اور حقیقہ کا نقشہ ایک ساتھ ہوا تھا، اور اس تقریب میں کلثوم نے اپنے شوہر کے ساتھ ان کے گھر پر آکر بڑے غلظت سے اسے اور گھر کو اوائٹ کیا تھا۔ وہ وہاں جانا چاہتی تھی مگر حیر کے پاس اس روز بائٹل فرسٹ نہیں تھی۔ اس نے کلثوم کے جانے کے بعد حیر سے وہاں چلنے کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنی مصروفیت کا تہہ کر دیا جانے سے معذرت کر لی۔

رات کے وقت وہ اپنی توہیں جا سکتی تھی۔ اسی لئے اسے لہنا جانا بھی ملوکی کی پڑا تھا۔ کلثوم سے اس نے فون پر معذرت کر لی تھی مگر وہ جانتی تھی کہ اس نے اس کے نہ آنے پر بہت برا مانا ہو گا۔ اس لئے جب ہی اس نے سوچا اپنا تھا کہ وہ اپنی پہلی فرسٹ میں کلثوم کے گھر اس کے بچوں کے لئے نکلتی ہے کہ ضرور جانے کی۔ حیر کو وہ کبھی ایسے آج کے پروگرام سے آگاہ کر چکی تھی۔ وہ اس پر پابندی نہیں لگا تھا مگر وہ اس کے علم میں لائے بغیر کسی نہیں جانتی تھی۔

آفس وین سے وہ راتے میں پڑنے والے شاہک سینئر پر اتاری۔ کلثوم کی ایک دکان سے اس نے کلثوم کے بچوں کے لئے نئے خریدے۔ بچوں کے کلثوم کی دکان تھی ابھی تک رہی تھی۔ اگر اسے کلثوم کے گھر پہنچنے کی جلدی نہ ہوتی تو وہ ابھی مزید کچھ وقت یہاں رکھے کلثوم کو دیکھنے ہوتے جاتے۔

وہ کلثوم کے گھر پہنچی تو وہ خبر متوقع طور پر اسے اپنے سامنے دیکھ کر اتنی خوش ہوئی کہ اپنی ساری ناراضی بھلا کر الہانہ بین اور گرم جوش سے اسے گلے سے لگایا۔ اسے شاید مانا کہ آنے کی امید تھی۔ "اکیلی آئی ہو؟" جواباً اس نے اثبات میں ہلکے اور اس کی گود سے اس کی نیلی کو لپی گود میں لے کر اسے چار کرنے لگی۔

"جو ڈول میں تمہارے لئے لائی ہوں تم تو اس سے بھی زیادہ پیاری ہو گئی ہو۔" وہ اس کے گالوں پر چٹا چٹ پیار کرتے ہوئے محبت سے بولی۔

"شام کے وقت اکیلی کیوں آئیں ماہ؟ شہر کے حالات اتنے اچھے بھی نہیں ہیں۔" کلثوم سے چہرے پر اس کے لئے محبت بھری توشیش بھلی ہوئی تھی۔

"بائی ڈیز فرینڈ! میں اب یونیورسٹی میں گریجویٹ رہی۔ شادی شدہ عورت اور رنگ دونوں۔ شام کا وقت مجھے بیک نہیں کہتا۔" کلثوم نے جواباً کچھ کہنے کے لئے ہاتھ لگے مگر پھر اپنی ساس کو ڈرانگ روم میں آ کر دیکھ کر تعصبا اس ذکر کو چھوڑ کر اس کی اور حیر کی خیریت پوچھنے لگی۔ کلثوم کے لیے جانے کے لوازمات سے لطف اندوز ہونے کے

بعد وہ فوراً گھر واپسی کے لئے اٹھ جانا چاہتی تھی۔

"میں اوتار کے دن فرسٹ سے خوب لبا بیٹھنے کے لئے آئی۔ گھر کیا کروں یا راجھنی باقی سارے بچنے سے بھی زیادہ مصروف گرتا ہے۔"

"گھر کتنا بھی پکڑتا رکھا ہو تم سے خود کو ماہا ذرا حال تو دیکھو نا۔ کیسی کمرورنگ رہی ہو۔ اور آنکھوں کے نیچے اچھے اچھے گہرے پتلے جیسے چائے کب سے پوری تیز بھی نہیں ہوئیں۔"

"جو آپ سے بہت محبت کرتے ہیں، انہیں آپ بیٹھ ہی کمرورنگ کلتے ہیں۔ وہ کلثوم کے توشیش بھرے انداز پر کمرورنگ رہی۔

"بھئی یہ حیر راضا فرسٹ سے میرے ہاتھ لگے تو میں اسے خوب کھری کھری سناؤں۔ میری اتنی پیاری اور نازکی میں دوست کا کیا حشر کر دے گا۔"

"ایکسو ذی، آپ میرے منہ پر میرے میاں کی برائی کر رہی ہیں۔" اس نے کلثوم کو گھورا، مگر وہ اس کے گھورنے سے ذرا متاثر نہیں ہوئی۔

"اس کے پاس تمہارے لئے کوئی نام نہیں بڑی مصروف شخصیت ہیں مصوف۔ تم میرے گھر نقشہ پر آنا چاہتی تھیں ابھی طرح بتا ہے۔ مگر وہ جسنر لگے ہیں اس کے پاس بیوی کو اس کی انکونی پہلی کے گھر لے جانے کا وقت نہیں تھا اور آج تم اتنی شام کے یہاں اکیلی آئی ہو اور اکیلی ہی جاؤ گی۔ اسے تمہاری کچھ پروا ہے کسی کی نہیں؟" وہ حیر کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتی تھی اسی لئے اس کے چہرے پر ناگوار سے بھر پور تاثر چمک گیا۔

"بلیز کلثوم۔" اس نے سخت لہجے میں کلثوم کو ٹوک کر کلثوم غصے میں تھی سو بولے گی۔ حیر مجھے دیکھیں گتا جیسا تم اسے بتاتی ہو۔ بہت چالاک اور خود غرض لگتا ہے۔ مجھے۔ جنہیں ٹوک کر کے اس نے جواب کر دیا۔ میں نے نہیں کہہ دی کہ چاب کرنا برا ہے۔ مگر شادی کے بعد یہ میری مرضی ہے کہ میں فوکر کی کروں یا نہیں۔ میرا تازم تر خراج اٹھانا اور ساری ضروریات پوری کرنا میرے شوہر کی ذمہ داری ہے۔ سکا کرانا امر کی ذمہ داری اور مگر خوش اسطوبی سے چلانا عورت کی ذمہ داری۔ جب ایک مرد ایک عورت کو اپنے نکاح میں لیتا ہے تو پھر وہ اس کے نام پتلے اور تمام اخراجات کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ میں نہیں کہہ رہی، یہ ہمارے مذہب نے نہیں بتایا ہے۔ تم اس کے مجبور کرنے پر اس کے ساتھ برابر کا کام کر رہی ہو اور اس کے پاس تمہیں دینے کے لئے وقت تک نہیں؟ پاکستان میں رہتے ہوئے تم دونوں امریکن اسٹائل کی زندگی گزار رہے ہو۔"

"میں کر کلثوم! تم حوی کے خلاف یہ ساری کجواس اس لئے کر رہی ہو کہ میں تمہارے بچوں کے نقشہ پر نہیں آسکی اور اس روز جب مجھے اوقات کرنے آئی تھی جب اس نے تم لوگوں کو یہ کہہ دیا تھا کہ وہ تم لوگوں کے آنے سے پہلے نہیں جانے کے لئے نکلے والا تھا۔ وہ تم لوگوں کو انور نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ واقعی ایک بہت اہم ذمہ زار جانے کے لئے لیت ہو رہا تھا۔" حیر کے لیے کہنے کے بعد کہ نہیں جا رہا تھا۔ کلثوم اور اس کا شوہر بھران کے گھر پر زیادہ دیر نہیں رہے تھے۔ اسے خود محسوس ہوا تھا کہ کلثوم کو گھبرا کر دھکا دینا انداز برا لگا تھا۔ حیر کے روپے سے اسے بھی رنج ہوا تھا مگر وہ ابھی طرح جاتی تھی کہ جس ذمہ زار جانے کے لئے وہ لیت ہو رہا تھا وہ اس کے پردیش کے حوالے سے

اس کے لئے کس قدر اہم تھا۔

دعوتیں کیا معلوم وہ مجھ سے کتنی سے تھا شامیت کرتا ہے۔ ہر انسان میں کچھ نہ کچھ خاموشی ہوتی ہیں کیا ہم میں اور مجھ میں نہیں؟ وہ اپنے پرورش اور اپنے کیریئر کو بہت تنجیدگی سے لیتا ہے اور میں اسے برائی پرگز نہیں سمجھتی۔ ہاں ایسی جگہ سے اس کے پاس کس اور کے لئے تو کیا خدا دے لے بھی وقت نہیں ہوتا۔ پھر وہ تہارے میاں کی طرح نہیں کہ باپ کے ذکر میں اسے ایک گھر اور دولت جائیداد ملتی ہو۔ نہ اسے اپنے ماں باپ کی طرف سے وراثت میں کچھ ملتا ہے اور نہ مجھ سے۔ میں دونوں کو مل کر اپنا ذاتی گھر بناتا ہے۔ میں اپنی زندگی خود اپنی اور خود سٹوارٹی ہے، ماں باپ کی طرف سے کسی سپورٹ کے بغیر۔ اگر اس متعلقہ کے حصول کے خاطر میں اس کے ساتھ کل کر کچھ جہد کر رہی تو کس کے لئے؟ اپنے ہی لئے۔ اپنے ہی گھر کے لئے، اس میں کیا برائی ہے؟ اور اس کی محبت جس پر ہمیں شک ہے اس میں منکلی میرے لئے کوئی کمی تھی اور نہ آج ہے۔ وہ پورا کا پورا میرا ہے۔“ اسے کلوم کی بات میں بری تھی نہیں۔ اسی لئے وہ اپنے لہجے میں درآنے والے غصے پر قابض رکھ پائی تھی۔ اسے اپنا زمانہ نہیں تھا کہ کبھی کلوم کا خون آنے پر وہ گھر نہ ہوتی اور پھر وہ دوسری اسے فون پر بات ہونے پر اپنی موجودگی کی وجوہات کے سلسلے میں یہ بول دیتی کہ وہ اپنے مزاج میں یوگن کے کہنے سے خریدنے لگی تھی کسی گھر کا دوسرا کوئی بھی سامان خریدنے لگی ہوئی تھی تو اس کی تمام باتوں کو کلوم اس الفاظ اور اس پیرائے میں لے کر، نہ صرف یہ کہ لے کر بلکہ انہیں اپنی دیکھی کر کے کی اور اسے جتانے لگی تھی۔ اگر اسے اس بات کا تصور اسامیٹ امانہ ہوتا تو کبھی بھی اپنے منہ سے روانی اور سادگی میں نکلے ان جملوں کو نہ دیتے۔

”محبت..... ہونہ۔“ اس کے غصے کا اڑ قبول کے بغیر کلوم ٹکے سے بولی۔ ”تمنے تو تمہاری یہ بات بھی سراسر جھوٹ لگتی ہے بابا! اگر ابھی بچوں کے بھینٹھ میں پرانا نہیں پااتیں۔ اگر بچے نہیں ایسا ہی بھینٹھ اور ہال کتے تو میرے بچوں کو یوں تپ کر دالہانا انداز میں پیار نہ کیا کرتیں۔ جو جو تم میں بننے سے اتنی ہزار ہوتی ہیں مجھ کو دوسروں کے بچوں کو طرح طرح پیار بھی نہیں کرتیں۔“ کلوم نے قدرے بے رحمانہ انداز میں یہ بات کہتے وقت بابا اور ہاس کی گود میں حصار کو غور دیکھا۔ یوں جیسے اسے یہ بتانا چاہتی ہو کہ وہ جب سے یہاں آئی ہے اس کی اپنی مسلسل اس کی گود میں بیٹھی ہے اور وہ باتوں کے دوران تھوڑی تھوڑی بددعاں کے کالوں اور پھاٹوں پر پیار بھی کرتی جانی ہے۔ بے ساختہ اور غیر احتیاطی طور پر اس نے فوراً حصار کو گود سے اتار رکھوئے۔

”میری نجی زندگی میں داخلات کا جنہیں کوئی حق نہیں ہے کلوم آئیں کب ماں بیٹا چاہوں گی اس بات کا فیصلہ میں اور میرا شوہر کر لیں گے جنہیں اس بارے میں فکر کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے اسوں سے ہر ماہ اپنے بھائی آنے پر۔ نہ میں آج تمہارے گھر آتی اور نہ تم حوی کے خلاف میرے ہی منہ پر یہ فضول بکواس کرتیں۔“ وہ ایک دم بے صوفی سے اٹھ کھڑی۔

”تم ناراض ہو جاؤ یا برا مانو، مگر میں کیا کروں ماہا! میں تمہاری دوست ہوں۔ تم مجھے بہت عزیز ہو۔ میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں اور میرا بھی پیار تمہاری فکر کرنے پر آتا ہے۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ اس شخص پر ہوں اظہارِ محبت کر دوں۔ چنانچہ کیا ہے مگر میری پھٹی کتھی ہے۔ وہ دنیا میں جیسا دکھتا ہے۔ اس روز جب سے

میں تمہارے گھر سے آئی ہوں تب سے تم سے بات کہنا چاہ رہی ہوں ماما کہ اس شخص پر اتنا عقارت کرو۔ انہو
جس دوست کو بھی یاد کی اس نے شہر پر نہیں کرنا چاہئے اور تم۔ تم کو خاص طور پر، وہ بندو جو تمہارے ساتھ امریکن
اسٹائل کی زندگی گزار رہا ہے تم اس پر آگاہیں بندہ کہ اس عقارت کرو۔ اپنی ساری کمائی سے وہ ریلے خرچ مت کر دیا
کرو۔ اپنا کچھ پیسہ اس سے بچھا کر کہیں محفوظ رکھو، اسے الگ بینک اکاؤنٹ میں شہر سے بچھا کر جمع کر کے لاکھ لاکھ
کوئی غلط نہیں ایسا تو یہ وہی اس کرتی ہیں جو شہر کی کمائی پر گزارا کرتی ہیں۔ وہ بھی شوہر ہی کے دیئے پیسوں میں
شہر کو بخر دے بغیر کچھ نہ کچھ پہلے انداز کر کے ضرور دیکھتی ہیں۔

مردوں کی قوم پر کبھی مجبور نہیں کیا کرنا چاہتا ہے۔ ایک نام لے کر ہمیشہ موت کو بے خوف بناتے ہیں، اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ”کلوٹم اس کے قریب آ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر رسیات سے بولی۔ اس نے شدید غصے کے عالم میں کلوٹم کے ہاتھ جھٹک دیے۔ کلوٹم سے بہت ناراض اور بے انتہا خفا وہ اس وقت وہاں سے واپس کے لئے اٹھ کر کلوٹم سے اسے اکیلے واپس جانے نہیں دیا۔

وہ اپنے شوہر کے ساتھ گاڑی میں اس کے اپارٹمنٹ تک چھوڑ کر غمی تھی۔

”دامخ خراب ہو گیا ہے کلوم کا۔ جو من میں آتا ہے بکے جاتی ہے۔ خود کے سمان نے گھر داری کرنے، بیچ پالنے اور اپنی ماں کی خدمت کرانے کے لئے گھر پر بٹھا کر رکھا ہے اس لئے اسے چلپ کرنے والی ہر شادی شادی کے معصوم اور اس کا شوہر غلام نظر آتے ہیں۔ جی وی اس روز صبح کو تیرہ گھر تھا اس کے سمان کے بارے میں۔ ایک سیدھا سادہ MBBS کر کے انجی گورنمنٹ جا بے خوش اور مطمئن فیملی کی ٹھیک ٹھاک سپورٹ ہونے کے باوجود نہ اسپتال نہ ترقی کیا نہ ادائیگا کچھ ایسا سبب اپ بنایا۔ وہی کنویں کے مینڈک۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ بیوی کو بھی گھر بٹھا لیا۔ کلہوڑم میرے کمانے چند ہزار روپوں میں غمی گزارا کرو۔“

مگر آنے کے بعد تو عورتوں میں دردِ کھلم کی باتوں پر اچانک جلاتی رہی۔ پھر اس پر اور اس کی باتوں پر لطف سے پہنچ کر دو منہ ہاتھ دھوئے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کچن میں آ گئی۔ آج وہ بھی کبھی اس لئے زیادہ اہتمام کرنے کا وقت نہیں تھا۔ کام کے دوران ہی فون کی کھنکھی گئی۔

”ہوئی اپنی سکیلی سے ملاقات؟“ عیب کی آواز سننے ہی اس کے لبوں پر سرگراہٹ بکھر گئی۔

”ہاں..... اب تو مجھے واپس آئے بھی کافی دیر ہو گئی۔ تم کب آرہے ہو؟“ کارڈلیس کندھے کے سہارے کان کے پاس نکالے وہ ہنوز سیب کاتنے میں مصروف تھی۔

”بھئی جانے کے لئے میں نے فون کیا ہے۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔ تم کھانے پر میرا انتظار مت کرنا۔“
 ”اور جو میں تمہارے لئے اتنی بڑی خدمت و محنت پیش کر رہی ہوں، اس کا کیا ہوگا؟“
 ”میں آ کر کھاؤں گا۔“ پلیز اسکا سمجھا کر کہو۔ ارسلان صاحب نے ایک کام میرے سپرد کیا ہے۔ جس میں ہمارے پاس
 میں انھیں لگا نہیں کر سکتا۔“

”ہاں مجھے پتا ہے اور تمہیں مجھے صفائیاں دینے اور وضاحتیں پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم اطمینان سے اپنا کام کرو مگر رات میں بہت زیادہ دیر بھی مت لگا دینا اور مگر وہی سی میں اعیانے سے گاڑی ڈرائیو کرو۔“ جب دیر

ہو جاتی ہے پھر تم تیز ڈرائیونگ کرتے ہو۔" وہ حسب حادثہ اسے یہ نصیحت کرتا نہیں بھولی۔ اور اس نے ایاز نے میر کو کوئی دفتری کام سونپا تھا یا ذاتی وہ نہیں جانتی تھی مگر اسے اتنا بہال معلوم تھا کہ میر ان کے ذاتی نوعیت کے کام بھی ان کو کر دیتا تھا۔ ان کی فیملی امریکہ سے آ رہی ہے، وہ خود تو اسلام آباد میں ہوں گے، اس لیے میر ان کی فیملی کو رینو کرنے کا تیر پورٹ جانے کا نہیں اپنے بیٹے کے لئے کیا کھیر فریڈا ہے اور چونکہ انہیں اس بارے میں کچھ خاص معلومات نہیں، اس لیے میر ان کے بیٹے کے لئے کھیر فریڈا کر اسے ان کے گھر پہنچوا بھی دے گا۔ ان سے تعلقات اور دوستی اس کے لئے بہت اہم تھی۔

ان کے کانٹیکٹس اور ان کا اثر و رسوخ زبردست تھا۔ میر بڑا اس سے بھتا تھا کہ یہ دور پبلک ریلیشنز کا دور ہے۔ آپ صرف اپنی فائناؤں اور صلاحیتوں کے سہارے وہ سب کچھ نہیں پاسکتے جو ذرا سی آبی پر بڑھا لینے سے حاصل کر سکتے ہیں۔

"اسلام آباد میں میرے کوئی چاہے، مامے نہیں بیٹھے اور میرا دیرا میرے لئے کوئی مضبوط فیملی بیک گراؤنڈ اور اتنا چھوڑ کر گیا ہے۔ مجھے اپنے آپ کو خود مضبوط کرنا ہے، اپنی مدد کرنی ہے۔ ہمارا ملک تو وہ ہے کہ نااہل سے نااہل آدمی اسلام آباد میں کسی چاہے، مامے کی مہربانی سے اونچی سے اونچی پوسٹ پر براہِ جان ہو جاتا ہے۔ پھر ہم جو اہلیت بھی رکھتے ہیں، قابلیت اور صلاحیت بھی صرف کی مضبوط بیک گراؤنڈ کے نہ ہونے کی بادش میں پیچھے کیوں رہ جائیں؟" میرا کڑا موضوع پر اس سے اسی طرح کی باتیں کیا کرتا تھا۔ یہ چیز خود اس کے اپنے حراج کے خلاف تھی مگر اس نے کبھی میر سے اس بارے میں بحث نہیں کی تھی۔

اس کے ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ کا بیٹا ہارڈ سے مگر جیوشن کر کے آیا۔ ان کے اسٹاف کے تقریباً تمام افراد سے فرادہ راز انہیں جا کر مہارکھادی۔ یہاں تک کہ اس کے بعض کوئٹہ تو ان کے گھر بھول اور وطنی تک کے رتی بچے اور اس سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ایک دہری مہارکھادی انہیں ان کے آفس میں جا کر دے آئی۔ ایک بار تو انہوں نے اسے یہ کہہ کر ٹوک دیا تھا کہ میر پر اس کے سوا ان کے پاس تمام اسٹاف مہموز کے عید مہارک کہنے کے لئے نو آنے تھے اور وہ پھر بھی خود کو بدل نہ سکی۔

☆☆☆

"تم تھوڑا سا پہلے مجھے بتادیتے تو مجھے تھوڑے آسانی ہو جاتی حوی!"

"اور اصل حیران راز وہ جو میر اور ان کی سڑکوں کی ایجنسی سے ہوئی میں ڈر کے لئے انوائٹ کرنے کا تھا۔ آج جب میں نے انہیں دعوت دی تو انہوں نے بہت خوشی سے قبول کر لی، مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کر دی کہ اگر میں انہیں ڈنر کروانا چاہتا ہوں تو اپنے گھر پر کروا دوں۔ وہ گھر کے بنے ہوئے پاکستانی کھانے کھانا چاہتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ، میں انہیں انکار کیسے کرتا؟" امریکہ سے میر کے بیک کے ایک سینئر سٹیج ہڈیا پر اچھی جگہ کے ساتھ پاکستان آئے ہوئے تھے اور ان کی جو میر نے کل رات اپنے گھر کھانے پر انوائٹ کر لیا تھا۔ یہ بات سن کر وہ اس وجہ سے مگر منہ دار پریشان ہو گئی تھی کہ اسے اس دعوت کی اطلاع رات دن بچے کھانا کھاتے ہوئے میر نے دی تھی۔ یہ میر کے ایک سینئر آفیسر کی دعوت تھی اور اس میں ہر چیز بہت بھر چاہے تھی۔ کل اسے آفس جاتا تھا اور اب رات کے دن بچے وہ دعوت

کے لئے درکار سامان کہاں خریدے نہ پہنچتی۔ اس کا ذہن بہت حیرت ریزی سے سوچ بچار میں مصروف تھا۔ وہ کیا کرے اور کس طرح کرے۔

"کیا سوچ رہی ہو ماہا؟ کیا تم منیج نہیں کر پاؤ گی؟ اگر ایسا ہے تو میر میں کسی ہوٹل سے کھانا گھر پر منگوا لوں گا۔ اب انہیں گھر پر انوائٹ کر چکا ہوں تو کھانا تو کھانا گھر پر ہی....."

"تم قحط کر دو، میں سب کچھ کر لوں گی۔ کسی ہوٹل سے کھانا منگوانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"آر پو شیور؟" میر کے اشتداد پر اس نے سرانٹات میں ہلادیا۔

میر کے سوچ جانے کے بعد اس نے اپنے قریب قائم ہیں رکھ کر اس میں چار بجے کا الارم لگایا اور خود کی لیٹ گئی۔ اس کے اعصاب پر دعوت ایسی سوجھی کہ کلام بچنے سے پہلے ہی پونے چار بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ میر نے خبر سورا تھا۔ فریڈا پر میں مرئی، چمکی اور گائے کا گوشت سب موجود تھا اور پھر دعوت بھی فقط دو ہی افراد کی تھی، اس نے چادروں چلوں پر ایک ایک کر کے مختلف چیزیں چڑھا دی تھیں۔ سب سے زیادہ احتیاط اسے یہ کرنی پڑی تھی کہ کوئی شور مچا نہ ہو۔ پلکے سے نکلتے سے میر کی آنکھ ضرور کھل سکتی تھی۔

آفس جانے کے وقت تک جتنا کچھ وہ کر سکتی تھی، اس نے کر لیا تھا۔ "بڑے کوان کے ہوٹل سے لے کر تو میں ہی آؤں گا۔" میں انہیں سو، ساڑھے نو بجے سے پہلے گھر نہیں لاؤں گا۔ اتنے میں تیار کی کا زیادہ موقع مل جائے گا۔" وہ اس کے اطمینان دلانے پر سکرما رہے ہوئے اپارٹمنٹ سے نکل آئی۔

اسے کیا کیا کرتا تھا، یہ سب وہ اب پوری طرح طے کر چکی تھی، اسی لئے جیسے ہی اس کا کالج ختم ہوا، وہ اپنے آفس سے فوراً نکل آئی۔

کالج ختم ہونے میں صرف دو دن باقی تھے، جب وہ خوب لدی بھندی اپنے آفس میں داخل ہوئی تھی۔ فائز کہیں باہر سے کچھ کر کے آ رہا تھا۔ اس نے اسے ڈھیر سے سارے تخیلوں کے ساتھ دیکھا تو اس کے قریب آ کر پرجس اس انداز میں بولا۔

"غیر مت تو ہے؟ کیا آج تم سب کو لٹرڈ کو کوئی سر پرائز دینے والی ہو؟"

"کی کو خواب میں بھیجھو رہے نظر آتے ہیں۔" فائز نے جواباً اسے محسوس ہوئے اس کے ہاتھوں سے قہقہے پکڑنے چاہے تو وہ جلدی سے بولی۔

"اُس او کے فائز! میں اٹھاؤں گی۔"

"دوستوں کو ایک کنٹریٹ میں پر لایا بنائے میں تمہیں بہت مزا آتا ہے ماہا میر رضا!" اس کے انکار کے باوجود اس نے اس کے ہاتھوں سے شاہج بنگلے لے لے۔

"میر نے اپنے ایک جاننے والے کو ان دعوت پر بلایا ہے، اسی لئے یہ تعزیری ہی چیزیں خریدنے لگی تھی۔"

وہ لٹ سے نکل کر اس کے ساتھ اس کے بیکن تک آ گیا تھا۔

"تم کیسے کہاں سے کچھ کر کے آ رہے ہو؟"

"اکیلا کہاں، دو مہتر مزارا صاحب ہیں نا۔ حالانکہ آج میں اتنا بڑی تھا مگر بھی محتر م نے ہم جاری فرمادیا کہ

میرا براہمت میں کچھ کرنے کا سوڈ ہے۔ تم کچھ ناٹم میں دہاں پہنچو، میں بھی اپنے کالج سے سیدھی وہیں آ جاؤں گی۔
ارے یار! میں کہتا ہوں بندے کو کھیت نہیں کرنی چاہئے، مرنی خواری ہے۔“
وہ سارے شاہک بیکڑا اس کی میز کے قریب زمین پر رکھتے ہوئے جھنجھلائے ہوئے انداز میں بولا۔
فانز کے برامان جانے کے خوف سے اس نے اسے جھنجھک نہیں کہا تھا۔

آفس دین دیر سے گھر پہنچائی، اسی لئے وہ شام میں خودی رکشہ سے گھر واپس آگئی اور آتے ہی اس نے
ای بھرتی اور تیز رفتاری سے کام شروع کیا جیسے واقعی کوئٹہ شین ہو کر نہ گئے۔ میں سب کچھ بہترین ہونا چاہتا تھا۔ نو
پنٹیشن پر جب ان کے اپارٹمنٹ کی ڈور بیل بجی تو صرف یہ کہ کھانا پوری طرح تیار تھا بلکہ وہ خود بھی بھترین تراش
خراش والا اسٹائنلس ساسٹ پیٹنر اور پلاک سائیک اپ کے تیار تھی۔

غیر ملکی سکراہٹ لے ہوئے دوستانہ انداز کے ساتھ اس نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ وہ دونوں میاں
بیوی اگر میر رضا کی بیوی کی خوش اخلاقی اور مہمان نوازی سے حائر ہوئے تھے تو اس کا پلکا پلاکسٹی کھانا بھی انہیں
بہت پسند آیا تھا۔ پیٹریک بیگم کو اس کی بانی ہوئی کھیر اس قدر پسند آتی تھی کہ بعد اصرار انہوں نے اس سے اس کی
ترکیب مانگی۔

”میں امریکہ میں یہ اپنی دوستوں کو بنا کر ضرور کھلاؤں گی۔“ پہلے وقت انہوں نے اس کے پکائے کھانوں
کی تعریف کرنے کے بعد یہ بات کہی۔

حیرانہیں دہاں ان کے ہوش چھوڑنے چلا گیا تو وہ جلدی سے لباس تبدیل کر کے برتن سینے میں مصروف ہو
گئی۔ بچے ہوئے سارے کھانے فریزر میں پھینکے کے بعد وہ برتن دھوئے گئی۔ میں ڈور کالاک کھلنے کی اسے آواز دیتی تھی۔
اسے چاہتا تھا کہ میر ہے، اسی لئے وہ اپنے کام میں مصروف رہی۔ اندر آنے کے بعد وہ سیدھا کچن ہی میں آ گیا تھا۔
”جھنجھکسا ہا!“ وہ اس کے بالکل پیچھے آکر کھڑا ہو گیا اور اس کی گردن میں بازو جمائ کر دیئے۔

”تم بہت تھک گئی ہو گی نا؟“

”اگر کھانا اور باقی سب کچھ تمہارے معیار کے مطابق تھا تو بالکل نہیں تھکی اور اگر کوئی ایک بھی چیز تمہارے
معیار سے کم تھی تو واقعی بہت تھک گئی ہوں۔“

”سب کچھ بہت اچھا تھا ماما! ایک دم پرکھت۔“ پیٹر کو گھر پر بلانے سے مجھے بہت فائدہ ہوا ہے۔ ہوش میں
ہمارے درمیان یہ سبے تکلفانہ لفظ بھی پیدا نہ ہو پائی جیسی گھر پر ہوتی ہے۔ میں ان کے ساتھ جس طرح کے قریبی
تعلقات استوار کرنا چاہتا تھا وہ تمہاری وجہ سے ہو گئے ہیں۔ میری ایجنز تمہاری اور تمہاری کلنگ کی بچی عاشق ہو
کر گئی ہیں۔ ابھی راستے میں مجھ سے تمہاری بہت تعریف کر رہی تھیں۔ پیٹر ایجنز اور ان کی بیوی کے ساتھ اس سے تکلفی
کا سارا کرڈٹ جمیں چاہتا ہے ماما! وہ اس کے پیچھے سے بہت کراس کے برابر میں آکر کھڑا ہو گیا اور اس کے سامنے
ٹکا کر کے برتنوں کو دوسرے تنگ میں کھٹکا لے گا۔

”ارے تم یہ کیا کرنے لگے؟“

”تمہاری سیلپ کر دار ہوں۔“ اس نے پلیٹ پانی سے دھو کر سائیز میں رکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔

”مجھے کوئی سیلپ نہیں چاہئے، تھوڑے سے تو برتن ہیں۔ تم جاؤ، میں بھی بس دس پندرہ منٹ میں کمرے
میں آ رہی ہوں۔“ اس نے فوراً اسے وہاں سے ہٹا دیا۔

”اچھا جلدی سے آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ اس کے کہنے سے وہ وہاں سے بہت گیا اور پھر کچن
سے نکلے ہوئے اسے کمرے میں جلدی آنے کا کہا۔

☆☆☆

حیرانے کی گاڑی خریدی تھی۔ اپنی نئی گاڑی میں سب سے پہلے اس نے لمباہی کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ اپنی نئی
گاڑی پر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بھی کہہ رہا تھا کہ یہ گاڑی بھی دو گاڑی نہیں جو وہ ڈرائیور کرتا چاہتا ہے۔ اس
نے مسٹر پرا، BMW اور نہانے کن کن کھلی گاڑیوں کی باتیں کرنا شروع کیں تو وہ بے ساختہ سکراتے ہوئے اسے
ٹوک گئی۔

”جی! مجھے پتا ہے آسمانوں سے بھی اونچے تمہارے معیار ہیں مگر پلیز کچھ دیر تو اپنی اس خوشی پر پوری طرح
خوش ہولو۔“

وہ جواباً سرشات میں ہلار کہتا۔ ”ایک گھنٹے کی ڈرائیور کے بعد حیرانے ایک آفس کرم پارلر
کے سامنے گاڑی پارک کر دی۔ اندر آکر ایک میز منتخب کرنے کے بعد وہ اس پر بیٹھی تو اس کی نگاہ اپنی میز کے قریب ایک
میز پر بیٹھی باجی لڑکیوں کے گروپ پر پڑی۔ وہ باجیوں کی انجھوں اسے اور حیرانے کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“ اسے کن اکھیں اسے ایک میز کی طرف دیکھتے اور سکراہٹ دہاتے دیکھ کر حیرانے تعجب
سے پوچھا۔

”میں ان لڑکیوں کو دیکھ رہی ہوں۔ میرا خیال ہے، تم انہیں بہت جلدی گم رہے ہو اور مجھے بہت ملاحظی
لگا ہوں سے وہ سب اس طرح دیکھ رہی ہیں جیسے میں اپنے گھر والوں سے چھپ کر تمہارے ساتھ ڈنٹ پر آئی ہوں۔“
حیرانہ محظوظ ہو جانے والے انداز میں بے اعتیاد رہا۔ ”ج کبہ رہی ہوں تو! ان کی نظریں دیکھ کر ایسا
نی گم رہا ہے جیسے میں تمہارے ساتھ ڈنٹ پر آئی ہوں، ہاں نہیں مسئلہ کیا ہے، میں ان کو لاشادی شدہ کیوں نہیں لگتی؟“
”یہ انہوں کی بات ہے یا خوشی کی کرتہ ابھی کالج بھی کالج نظر آتی ہو؟“ وہ اس پر سٹائی نظریں ڈالتے
ہوئے بولا۔

”وہ بات تو صحیح ہے مگر ہر وقت یہ چیز کاغذ منہ ثابت نہیں ہو سکتی۔ اب دیکھو، ہمارے جوئے فائنل
ڈائریکٹر آئے ہیں۔ حالانکہ بے چارہ بڑے شریف آدمی ہیں مگر کیا کریں کہ انہوں نے آتے ہی از خود بے فاض کر لیا کہ
میں غیر شادی شدہ ہوں۔ دن میں پانچ دفعہ مجھے اپنے آفس میں بلواتے اور ان میں سے تین دفعہ بالکل غیر ضروری،
کسی ایسے فیصلوں کام کے لئے جس پر سوچنا ان کی پوسٹ کے شاہان شان میں نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے ان کے سامنے تمہارا
ڈکر کرنا پڑا۔ یہ تانا بانہ کہہ رہی میں خیر سے شادی شدہ ہوں۔ سز دھک کبہ رہی تھیں کہ اس میں ان بے چارے کا کوئی
قصور نہیں۔ میں سبیل کا سننے سے پسینہ شادی شدہ نظر آتی ہوں۔“

وہ آفس کرم پارلر کا کچھ منٹ میں لے جاتے ہوئے بولی۔ وہ جیلڈری میں فٹہ میں جڑیں پہنچتی تھی جو حیرانے اسے

تھے میں دی گئی تھی اور جو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اسے پہنا تھا۔

”میں سوچ رہی ہوں، مولائی دو چڑیاں خرید کر ہاتھوں میں ڈال لوں۔ شاید اس سے لوگوں کو میں شادی شدہ لگنے لگوں۔“

”کبلی فرمت میں یہ کام کرو بلکہ میں تو کہتا ہوں تھوڑا سا وزن بھی بڑھا لو اور یہ ناس ڈائریکٹر کا کیا قصہ ہے۔ تم مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا اس غیبت کے بارے میں؟“ وہ معنوی قسم کا طعنے طاری کر کے اس سے بولا پھر اسے ہنستا دیکھ کر خود بھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

وہاں سے باہر نکل کر وہ اپنی گاڑی کی طرف آ رہی تھی جب فٹ پاتھ پر اپنی جین میں تن میں ایک شخص کی نگاہ میر پر پڑی۔ وہ چٹا نکل کر کھڑا گیا۔ چند سیکنڈ اس نے جیسے اسے پہچانے میں لگا رہے اور پھر وہیں سے چلا گیا۔ ”میرا“ وہ شخص تیز رفتاری سے بھاگتا سیما حان دونوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گئے اس کا سانس بڑی طرح پھول رہا تھا اور اس کے چہرے پر دہلائی خوشی گھری ہوئی تھی۔ وہ بہت بڑے جوش طرے سے میر سے بغل گیر ہو گیا تھا۔

”کیسا ہے، پاتھ، پہچانا نہیں مجھے، میں غلام عباس ہوں۔“

”کی بہت پرانے اور بہت پیارے دوست کے مل جانے کی بچی خوشی اسی کے ہر پرانے انداز سے ظاہر ہو رہی تھی میر میر کے چہرے پر کوئی خوشی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اپنے گلے سے لگے اس شخص کو اس نے فوراً ہی خود سے دور ہٹایا۔ ”میں لوگ ہوں۔“ میر کا جواب مختصر اور کبھی طرح کے جوش و خروش سے عاری تھا۔ اس شخص نے شاید ابھی اس سردہری کو محسوس کیا نہیں تھا۔ اس کی نگاہیں پڑیں تو سوالیہ انداز میں میر کی طرف دیکھا۔

”میری چوٹی ہے۔“ میر نے تنگ لہجے میں تعارف کر دیا۔ اس کی نگاہوں اور لہجے میں سردہری اور اجنبیت بڑھتی جا رہی تھی اور وہ اس کے ہلے ہلے کی ساتھی تھی، اس کی مزاج آشنا، اس نے ان نگاہوں کو ایک لمحہ میں محسوس کر چکی تھی۔

”السلام علیکم اے بھائی بی بی!“

”وہیکم اسلام! وہ کچھ جانتے ہوئے بہت ہلکا سا کرائی۔“

”یہی خوشی ہو رہی ہے آپ سے مل کر۔“ میر میر کے چہن کا دوست ہے۔ کبھی اس نے ذکر کیا میرا آپ سے؟ ہم نے پہلی گلاس میں ایک ساتھ داغ لپا تھا۔ پہلی سے آٹھویں تک ہم نے ایک ساتھ بڑھا۔ ہمارے اسکول میں انھیں دو شخص بالکل نہیں تھیں۔ ہم زمین پر بیٹھتے تھے، میں اور میر بیٹھ مارا بیٹھتے تھے۔ یاد میں نہیں میر؟“ وہ پہلے اس سے اور پھر میر سے مخاطب ہوا۔ میر اسے جواب دینے کے بجائے جیب سے گاڑی کی چابی نکالنے لگا۔

”بڑا چٹا کھو تھا۔“ اپنے گھر پر پڑنے کی جگہ میں تھی تو میر سے ساتھ میرے ابا کی دکان پر آ جاتا۔ میر سے ابا کی کتابوں کی دکان تھی نا، ابا دکان ہمارے حوالے کر کے شام میں گھر چلے جاتے۔ میں دکان پر آنے والے خریداروں کو نشانہ داتا اور یہ دکان کے بالکل اندر کونے والی جگہ پر بیچنے پر چاہتاں کرتا رہتا۔ ہم رات دیر تک وہیں رہتے۔ ساتھ کھانا کھاتے اور کبھی کبھار تو ساری رات وہیں گزار دیتے۔ کیا وقت تھا وہ بھی۔“ اسے لگا میر اس شخص

سے فوراً بچھا چھڑا کر کبھی بھی طرح وہاں سے گاڑی تک پہنچنا چاہتا تھا۔

اس کے قدم اٹھنے کے لئے بالکل تیار تھے اور زبان پر شاید کوئی بد اخلاقی اور بے مروتی سے پھر پھر جملہ آنے ہی والا تھا۔ وہ میر کے کچھ کہنے سے پہلے بے ساختہ بولی۔

”آپ کیا کرتے ہیں غلام عباس بھائی؟“ میر کی قسم میری گالیں وہ نظر انداز کر گئی۔ وہ سادہ دھنس سا شخص اسے اس سلوک کا حقدار قطعاً نہیں لگ رہا تھا، جو میر اس کے ساتھ کر رہا تھا اور جسے وہ اپنی خوشی اور جوش اور اپنی سادگی میں سمجھتی تھی۔

”ہم نے کیا کرتا ہے بھائی بی بی! گھر کے حالات ایسے تھے کہ آٹھویں سے آگے پڑھنا نہ سکا۔ بس ابا کی دکان سنبھالی۔ ابا کی کرائے کی دکان تھی۔ میں نے اسے خرید لیا۔ بس ہی بڑا کرم سے مولا کا، بڑا اچھا کراہا ہو رہا ہے اور میر! تو کیا کر رہا ہے یا راج کل؟“ پرانے محلے سے کیا کیا، اپنے پرانے دوست کو بھی بھول گیا۔

”ہاں! میں گاڑی میں تیار ہوا انتظار کر رہا ہوں۔“ میر غلام عباس کو جواب دینے بغیر ہاتھ سے کرفت لہجے میں آنے کا کہہ کر گاڑی کی طرف چلا گیا۔ وہ اپنے جوش و خروش اور خوشی سے نکل کر جبریت اور بے چینی سے گاڑی میں بیٹھ جاتے والے اپنے پرانے دوست کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کو تعلیم یافتہ و سادہ سے انسان کی آنکھوں میں پچھتے دکھ کو دیکھ نہیں سکتی تھی، اس نے ان کی طرف گالیں ڈالے بغیر آ سکتی تھی۔

”اصل میں میرا حیرا جلدی میں ہیں، ہمیں کہیں بہت ضروری پہنچنا ہے۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے غلام عباس بھائی! اللہ حافظ۔“ اسے اس شخص سے ایسی عدمت محسوس ہو رہی تھی کہ اس کی طرف دیکھے بغیر یہ پہلے کہہ کر تیزی سے اپنی گاڑی کے پاس آ گئی۔

دل پر اربابو بھو بڑھا پیچھے میر نے نہیں، خود اسی نے اس شخص کی تحقیر کی ہے۔ میر کرب سمجھنے غصے سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب لکھی اور غصے کے سوا کوئی بات نہیں تھا۔

”حوی! اس نے میر کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ میر نے اس کے ہاتھ کو بہت غصے سے جھک دیا۔“ وہ بے چارہ اسے غلطی سے بات کر رہا تھا حوی! وہ ہم سے کیا لکھ رہا تھا؟“

”جس سے میں بات کرنا پسند نہیں کر رہا تھا، اس پر غلطی بھادو کرنے کا نہیں کیوں شور مچا تھا؟ ایسے گلے گلے کو لوگوں سے میری چوٹی اخلاق بھادو، ہو نہ۔“ ہمیں کیا نظر نہیں آ رہا تھا کہ میں اس سے ملنا نہیں چاہتا۔“ وہ بہت راضی سے تیز آواز میں بولا۔

”اچھا آتم سو رہی۔ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔ تم جلیز اپنا ہوا تو مت خراب کرو۔“ اس کا انداز مکمل طور پر معذرت خواہانہ اور صلح جوئی والا تھا۔ وہ اپنے جس فعل پر ذرہ برابر بھی شرمندہ نہیں تھی، اس پر سارا رات اس سے معافی مانگ رہی۔ اسے ملنے والی مسلسل کوششوں اور تسلسل سے معافی مانگتے رہنے سے یہ ہوا تھا کہ اپنے بیلہ دم میں آکر بسز پر لینے کے بعد وہ اس سے منہ پھیر کر رت بدل کر نہیں لینا تھا۔ جب اس کے برابر لینے سے پہلے اس نے اس کا ہاتھ میٹھا کیا اور پھر پورے استحقاق کے ساتھ اس پر سر رکھ کر گئی تھی تو اس نے اپنا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی اور نہ اسے دور ہٹایا۔

"مجھ سے ناراض ہو کر سو گئے تو جھیں خند آجائے گی؟" اس کی ناراضی میں قدرے کمی ہوئی دیکھ کر اس کے اوسان بحال ہوئے تھے۔ حیر کے لہوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھرتی کر دیکھ کر کسکھ کر سانس لینے لیتے اس نے خود سے ہزار دفعہ کہا وعدہ ایک مرتبہ بھر کیا۔

☆☆☆

اپنی ترقی کی خبر پر وہ بہت خوش تھی اور اس رات وہ حیر کے ساتھ خوش خوش اپنی ترقی ہی کو دیکھ کر گئے جا رہی تھی۔ اب اس کی خواہ میں کتنا اضافہ ہو جائے گا۔ دیکھ کر کیا حیرات اسے مزید بے چین نہیں گی مگر وہ اس کی باتوں میں اس طرح دلچسپی نہیں لے رہا تھا جتنی کہ عموماً کیا کرتا تھا۔ وہ ایک دو دن سے ہی ماہو کچھ کچھ چپ سا اور الگ الگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے حوی! ام بجھے پرسوں شام سے ہی خاموش اور اچھے ہوئے لگ رہے ہو۔"

"کچھ نہیں ہوا۔ خوشخوار اچھے وہم ہو رہا ہے۔"

"وہم؟" چما چما بجھے یہ تانا، ابھی میں تم سے کیا کہہ رہی تھی؟

"تم اپنے پرسوں کی بات کر رہی تھیں۔"

"نہیں، وہ بات تو میں ختم بھی کر چکی تھی۔ میں تو اب یہ بات کر رہی تھی کہ آج میں کوئی اچھی سی مودوی دیکھنی چاہئے۔ کل بھئی بھی ہے اور بھر نہیں ایک ساتھ فلم دیکھتے بہت دن کی ہو گئے ہیں۔"

"آج نہیں بابا! آج مجھے ہیندا آ رہی ہے۔" اسے حیر کے لیے میں غیر معمولی بین محسوس ہوا۔

"حوی کیا ہوا ہے؟ تم مجھے تو بتاؤ۔ اگر کسی وجہ سے پریشان ہو یا تیرے شہر کرو۔" وہ اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ کر کے اس کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے بہت محبت سے بولی۔

"میں کہہ تو رہا ہوں کچھ نہیں ہوا، بلا جملہ لگے کہ ایک ہی بات کے پیچھے مٹ پڑ جایا کرو۔" بھڑک دینے والے انداز میں اس سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ کو بھی اپنے چہرے پر سے ہٹا دیا، پھر کچھ پر سر رکھ کر لیتے ہوئے جھنجھکیا لیتے ہیں اس سے ہلایا۔

"اب میں سوچا جاتا ہوں۔ پلیز مجھے دوسرے مٹ کرنا۔" اس نے کر دت بدل لی۔

مجھ وہ اپنے نارمل موڈ میں اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اپنے رات کے روپے پر نہ اس نے ہلکا سے سواری کہا اور نہ اس نے اسے کچھ بتایا۔

دوسرے سو کر اٹھنے اور چھٹی والے دن کا خوب شاندار اہتمام والا ناشتہ کرنے کے بعد وہ اپنے چھٹی والے دن کے مخصوص کاموں میں مصروف ہو گئی۔ ایک طرف واشنگ مشینیں گولی تھی، دوسری طرف کچن میں سارے چلوں پر کچھ نہ کچھ چھا ہوا تھا اور تیسرا کام ہاتھ کے ہاتھ اس نے حیر کے جوتوں کی پالش کرنے کا شروع کیا ہوا تھا۔ چھٹی والے دن فرحت سے یہ کام کر تو رہی تھیں ایک پلاسٹک برش جھینرانی کا لی ہو یا کرنا تھا۔

وہ ہاتھ روم میں کھڑا شیدہ بنا رہا تھا اور ہاتھ روم کا دروازہ چونک کھلا تھا، اس نے اس سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ گاہے گاہے اس پر لگاؤ ڈال کر اسے یہ کہہ کر جھینرانی رہا تھا کہ وہ اگر چاہتی تو بہت اچھی جوتے پالش کرنے والی بھی بنی

کتنی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھے حیر کے سواہل کی تکی کی تھی۔

"لہا! دیکھ کون ہے۔ اگر کوئی خاص فون ہو تو میری بات کر دینا، ورنہ بیچ لے لینا۔"

وہ سر اٹھاتا میں ہلاتے ہوئے ابھی اور بیٹھ کے پاس آکر سواہل اٹھایا۔

"ہیلو!"

"مجھے حیر رخصتا سے بات کرنی ہے۔" اپنے ہیلو کے جواب میں اس نے ایک خوبصورت زنانہ آواز سنئی۔

"آپ کون بول رہی ہیں۔"

"سردار آفاق۔" وہ اس نام کی کسی خاتون کو جانتی نہیں تھی، اس لئے ایک ہلکے فون کے خاص پیام ہونے کے بارے میں سوچا پھر کچھ سوچ کر حیر کے پاس آ گئی۔

"کس کا ہے؟" حیر نے بے آواز پوچھا۔

"کوئی سردار آفاق ہیں۔" اس نے بھی آہستہ ہی سے جواب دیا حیر نے اس کے ہاتھ سے سواہل لے لیا تو وہ ہاتھ روم سے باہر آ گئی اور دوبارہ اپنے کام میں متہم ہو گئی۔ حیر کی گفتگو کی نہ اسے آواز آ رہی تھی اور نہ اس نے قصداً سننے کی کوئی کوشش کی تھی۔

"یہ سردار آفاق کون ہے؟ پہلے بھی نہیں خاص اس کا ہے؟" حیر دوپہر میں اسی وقت شیو کرنے کو نہانے کے فوراً بعد اس سے کسی ضروری کام کا کہہ کر حیر سے چلا گیا تھا اور پھر اب رات کے کھانے سے کچھ پہلے اس کی واپسی ہوئی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد وہ دروازہ پر پہنچی عام سے لیے میں حیر سے اس فون والی لڑکی کے متعلق پوچھ بیٹھی۔ بغیر کسی خاص تجسس کے۔

"کوئی گے، میری، مہینہ پھر پہلے جوائن کیا ہے۔ ہارڈ سے ماسٹرز کر کے آئی ہے۔ ہو گئی تھی؟" وہ چالوں کی ڈش زور سے بچ کر فیسے سے ہلایا۔

"حوی!" اس نے حیرت سے اس کے فیسے سے بھرے چہرے کو دیکھا۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ میں اپنے ہر جاننے والے کی تعلیمات تمہاری خدمت میں پیش کیا کروں؟" اسے چپ نہیں کیوں اتنا غصہ آ گیا تھا۔ اس نے اپنے سامنے لگی پلیٹ بھی فیسے سے دور ہٹا دی تھی۔

"حوی! کیا ہو گیا ہے، میں نے ایسا تو کچھ بھی نہیں کہا۔ تم خاکیں ہو رہے ہو؟"

"دماغ خراب ہو گیا ہے، ہیرا، پاگل ہو گیا ہوں۔" وہ کھانا چھوڑ کر میز پر سے اٹھا اور پھر کرسی کو کھنکھارے ہوئے دروازہ کھول کر بالکونی میں چلا گیا۔

"جھیں میری کیا بات بری تھی ہے حوی! میں نے تو یہ بھی پوچھا تھا کہ تم اتنی ہی بات پر ناراض ہو رہے ہو۔ میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی جو..." وہ اس کے پیچھے بالکونی میں آ گئی۔ حیران پریشان ہی۔

"تم نے کچھ نہیں کہا مگر جھیں ہاتھ میرے سر پر سوار رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ میں کہاں جاتا ہوں، کس سے ملتا ہوں، کس سے بات کرتا ہوں۔ جب تک تم یہ سب پوچھ نہ لو، جھیں اطمینان نہیں ہوتا۔"

وہ ہتھیں کیوں ایک معمولی اور بڑا وجہ کی بات کو لٹو بنا کر چھڑا کرنا چاہ رہا تھا لیکن اس نے بغیر کسی غلطی کے معافی مانگ لی اور پھر اس نے اسے متا کر ہی دم لیا۔ اسے متا کر وہ دوا پس کھانے کی جیز پر لے آئی تھی۔

مگر یہ صرف اس ایک بار تھا نہیں تھا، وہ کھانے کیوں بات یہ بات اس سے اٹھنے لگا تھا۔ اس کے خلاف مزاح تو بابا نے بھی کچھ نہیں کیا تھا، اب تو وہ مزید احتیاط پر تنے جی مگر وہ بھر بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر چڑھے بن کا مظاہرہ کرنے لگا تھا۔ وہ اس کے ان اٹھے رویوں کا سبب نہیں جانتی تھی مگر یہ اٹھے دو دیے اسے پریشان بہت کر رہے تھے۔ اگلے پندرہ میں روز تک میر کا مزاح یوں ہی چڑا اور دھڑائی سے بھر پور ہا بھر خود بخود ہی اس کے مزاح میں جڑ بیٹا ہو گئی۔ وہ اس کے ساتھ ناول طرح کی رپورٹ کرنے لگا۔ اس ناول انداز میں بھی کچھ نہ کچھ ناول تو ضرور تھا۔ ایسا کیسا تھے وہ صرف محسوس کرتی تھی، کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔ وہ صرف اس کے قدموں کی آہٹ سے سڑ کر دیکھے بغیر اس کا نام محسوس کر سکتی تھی تو اس کی آنکھوں میں جھانکی بیڑاری کیوں نہیں پڑے کچھ تھی۔ وہ بازو اب بھی ہر رات اس کے گرد ملتے ہوئے تھے۔ بحران میں محبت کی یہ نہیں بلکہ برف کی یہ خشک ہوتی تھی۔

ظاہر دیکھنے میں ایسا کچھ تھا نہیں جیسا وہ لگتا تھا بلکہ اس کو خوش نہیں تھا۔ ادا کی یہ کیفیت پچھلے کی دنوں سے اس کے ساتھ تھی۔ وہ جس راستے سے، جس طرف سے اس کے دل میں بھی سوچوں کو جانے کے لئے اس کے قریب جانے کی کوشش کرتی، وہ وہیں ایک ان دیکھی دیوار کھڑی کر دیتا۔ ظاہر ہوتا، تاکہ جیسے سب کچھ کو فیصلہ ٹھیک ہے۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا اور حیران اخبار اپنے سامنے پھیلائے بیٹھا تھا۔ سامنے لی دی بھی چل رہا تھا مگر جتنی دفعہ بھی وہ کمرے میں گئی، اس نے نیکی دیکھا کہ وہ اخبار پڑھ رہا ہے، نہ نئی دی کو دیکھ رہا ہے اور نہ ہی اسے اس کے آنے اور جانے کی کوئی خبر ہے۔ اس نے کمرے میں دیکھ کر بڑھ چلا، اب اسٹینک کی اور وہ اس کی آہٹ سے بے نیاز لپٹی کسی سوچ میں الجھا ہوا دکھ رہا کہ بہت گہری سوچ میں گم تھا۔ جو کام ہو گئے تھے، سو ہو گئے تھے اور جو وہ گئے تھے، انہیں احوال ہی چھوڑ کر وہ کمرے میں آ گئی۔

کیا بات ہے، تم چپ کیوں ہو کوئی پریشان ہے؟

اس کے ان سوالوں پر وہ خفا ہوتا تھا، اسے اس نے ان میں سے کوئی بھی بات نہیں کی۔ وہ کسی بھی طرح ان کے سچ حاکم ہوتی اس ان دیکھی دیوار کو گرا دینا چاہتی تھی۔

”تمہارے بال کیسے روکے روکے سے ہو رہے ہیں حوی! اتنے خشک اور بے جان ہے۔ چلو میں تمہارے سر میں تیل کی مائل کر دوں۔“ اس کے سر کو کھولا ہے ہوئے کہا۔ حیران خاموش بیٹھا، اس نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل سے تیل کی شیشی اٹھا کر لے آئی اور بیڈ پر اس کے پیچھے بیٹھ کر اس کے سر میں تیل ڈالنے لگی۔

”اب فوراً جا کر شپینٹ کر لینا کہ“ مجھ سے تیل کی بو برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کہنے تک تیل لگا رہے دیکھا سر میں۔“

”ماہا مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ وہ آہستہ آواز میں بڑی عجیب کی ہے بولا۔

”ہاں بولو حوی!“

”پہلے تم اپنا کام کرلو۔“ اس نے اپنے سامنے بیٹھے سارے اخبار سیٹ کر ایک طرف رکھ دیے اور بیٹھ سے لی دی بھی آف کر دیا۔ اب کمرے میں سوائے خاموشی کے کچھ نہیں تھا۔ تیل کی مائل کرنے اس کے ہاتھوں کی رفتار سست پڑنے لگی، اس میں خود بخود یہ کچھکپاہٹ بھی پیدا ہو گئی۔ وہ اتنی عجیب کی ہے اس سے کیا کہنے والا تھا۔ تیل گھوانے والا یہ کام اس نے کیا تھا اسے خاموشی سے نہیں کر دیا تھا، آج اتنی خاموشی سے بغیر کسی جھٹ کے کر دیا تھا۔ اس کے بالوں میں گردش کرنے کی ان لٹکیاں چھتری تھیں۔ اس نے تیل کی شیشی بند کی اور اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ وہ پوری توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ماہا! جو بات میں تم سے کہنے والا ہوں، مجھے پتا ہے اس سے تم بہت برٹ ہو گی، جنہیں بہت دکھ ہو گا مگر میں کیا کروں، میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔“ وہ اس کے تیل گئے ہاتھوں کی آہٹوں میں لے کر راسیت سے بولا۔ ”حوی! کیا بات ہے؟“ اس کے چہرے کی عجیب کی اس کا دل دہلا رہی تھی۔ تیر تیر دھڑکنے لگا تھا اسے خود اپنے قابو سے باہر جا رہی تھی۔

”میں شادی کر رہا ہوں ماہا!“ اس نے حیران کو دیکھا جسے وہ کسی ایسی زبان میں بات کر رہا تھا جسے وہ سمجھ نہیں سکتی تھی۔

”ماہا! میں شادی کر رہا ہوں سندرہ آفاق کے ساتھ۔“ اس نے اپنی بات دہرائی۔

”اس نے اس بار بھی کوئی رول غلط نہیں کیا اور کم گم سے انداز میں اسے دیکھتی رہی تو وہ مزید بولا۔

”اس میں اس اتوار کو سندرہ کے ساتھ شادی کر رہا ہوں ماہا! تم تم رتی ہو میری بات؟“ اس کی سکتے کی سی کیفیت اور بے تاثر آنکھوں کو دیکھ کر اس نے راز دہر سے ایک بار پھر وہی بات دہرائی اور وہ کوئی رول کیسے ظاہر کرتی جبکہ اس کی کوئی بات وہ سمجھ ہی نہیں پڑتی تھی۔

اس کی سکتے کی سی کیفیت اور بے تاثر آنکھوں کو دیکھ کر اس نے راز دہر سے ایک بار پھر وہی بات دہرائی۔ اس نے اپنی آنکھیں زور سے کھینچ کر بند کیں پھر انہیں دوبارہ کھولا، مگر نہ اس کے سن ہوئے اعصاب بیدار ہو پائے اور نہ اس کے کان وہ سن پائے جو وہ سننا چاہتی تھی۔

”آئی کو بولو ماہا۔“

”تم میرے لئے بہت جیتی ہو۔“

”ماہا! تم میری زندگی کا سب سے خوبصورت احساس ہو۔“

میں جانتا ہوں، جنہیں اس بات سے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ تم بہت اچھی ہو ماہا۔ بلکہ میں تو یہاں تک بھی کہنے کے لئے تیار ہوں کہ تم میری زندگی میں آنے والی سب سے اچھی لڑکی ہو۔ مگر اپنی اس خوبی کے باوجود تم میری منزل نہیں۔ جو زندگی میں تمہارے ساتھ لی رہا ہوں یہ وہ زندگی نہیں جس کے میں نے خواب دیکھے تھے۔ میری منزل سندرہ آفاق ہے، میں نے تم سے کبھی غلط بیانی نہیں کی اب بھی سب کچھ جنہیں تیار ہوں۔ وہ مجھ سے بہت متاثر ہے، اسے لگتا ہے کہ اس کے فنان کو ایسا غنائ کرنا اور دوستوں میں وہ بات نہیں جو مجھ میں ہے۔ وہ جانتی ہے میں شادی شدہ ہوں اور وہ بھر بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ تم نہیں جانتی کہ وہ کوئی کس کی بیٹی ہے۔ کہنے بڑے شکر ہیں اس

کے ذیلی دنیا کے بہترین چنگس اور بڑے بڑے اداروں میں سے کسی میں کام کرنے کا ان کے پاس دو بچہ تجربہ ہے۔

اس وقت وہ نیو یارک میں کس چنگس میں کام کر رہے ہیں اور کس پوسٹ پر کر رہے ہیں، میں یہ نہیں بتاؤں۔ چہاں ہمارے آئینوں کی کلکی مل جائے گی۔ نیو یارک، لندن، پیرس، روم کہاں کہاں ہو تو ان کے شاندار گھر ہیں۔ اتنی اونچی اونچی پوسٹوں پر کام کیا ہے تو نام اور شہرت کے ساتھ ساتھ خوب چیز بھی بنایا ہے۔

دنیا بھر کے بڑے بڑے بینکار اور اقتصادیات کے ماہرین سے ان کے کانٹیکٹس ہیں۔ صرف پاکستان میں نہیں دوسرے ممالک میں بھی کافی اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔

یوں میں ان سے بھی ملتا ہوتا تو دیکھ لیتا کہ معمولی سا بینکر کچھ کرنا پسند نہیں کرتے مگر اب چنگس ان کی انوکھی بیٹی مجھ سے شادی کرنے کی خواہش مند ہے اس لیے تم اندازہ نہیں کرو کہ مجھ سے کبھی طرح ملتے ہیں۔ کس طرح میرے کیریئر کی فکر کرتے ہیں۔ میری ذہانت اور قابلیت کو کس وجہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور یہ کہتے ہیں کہ ابھی مجھے بہت آگے جانا ہے۔ آگے میں بے شک اپنی قابلیت ہی کی بنیاد پر جاؤں گا مگر مجھے آگے بڑھنے میں مدد دینے والے، میرے لیے نئی راہیں کھولنے والے دی گئے ہوں۔ ڈینس میں اپنے جس قسم تعارفی مائٹان گھوم رہی تھی تم کیا کرتے تھے اور جو ناچیں کبھی ہم دونوں کرنا بھی پاتے یا نہیں ڈینس کے ایسی فٹرمیں دیکھا مگر بلکہ اس سے بھی زیادہ شاندار ایک گراہیوں نے مدد سے کام کر لیا ہے۔ ان کے اثر و رسوخ، ان کے پاورز تم سوچ ہی نہیں سکتیں بلکہ اب تم خود بتاؤ میں کیا کروں؟ میرا کیریئر میرے لئے کتنا اہم ہے تم جانتی ہو میں ایک کامیاب شخص کا سیلاب ترین انسان بننا چاہتا ہوں اور اس کے لئے مجھے مدد کا ہاتھ تم ماننا ہی ہوگا۔

اس کا جواب بہت نرم اور باخیر میں تھا۔ اس کی نگاہوں میں بھی زیادہ نرمی تھی کہ کرنے کا ایک نیا انداز تھا۔ وہ ابھی کبھی چٹرائی ہوئی آنکھوں اور جملہ احساسات کے ساتھ ایک نیک اسے دیکھ کر جاری تھی۔ اس کے منہ سے کوئی بھی لفظ نہیں نکلا تھا اور نہ ہی سادگت بیٹھے اس کے وجود میں کوئی جھش ہوئی تھی۔ وہ کسی جیسے کی طرح سادگت و جادگھی۔

"میں کل یہاں سے شفٹ ہو رہا ہوں بلکہ! افکار کو ہماری شادی ہے، سچ کے یہ چھ دن میں کسی ہوٹل میں گزاروں گا۔ میں ایسا صرف تمہاری وجہ سے کر رہا ہوں اگر اگلے اتوار کے دن یہاں سے گیا تو تمہیں یہ سوچ کر زیادہ دکھ ہوگا کہ میں چند گھنٹوں بعد شادی کر لینے والا ہوں۔"

"ہماری شادی؟"

ہمارے یہ کون تھی جو اس کے شوہر کے ساتھ مل کر ایک "ہم" بن رہی تھی۔ وہ اس کے پاس سے اٹھا اور پھر بیڈ کے بائیں جانب کی الماری کھول کر اس میں سے اس نے اپنا ساٹھ کس نکالا۔ اس کا سکتہ جیسے ایک دم ہی نوا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اس کے قریب آئی۔

"موسیٰ! یہ سب جو ابھی تم نے کہا۔ یہ شادی، یہ مدد، آفاق۔ یہ سب جھوٹ ہے نا! اب مجھے تم سے ٹک کر رہے ہو ناں؟ وہ اس کے کندھوں کو چھو کر اس انداز سے بولی جیسے وہ ابھی جتنے ہوئے یہ کہہ دیے گا کہ "ہاں میں مذاق کر رہا تھا۔"

"کچھ دیر! کہ یہ جھوٹ ہے تم مذاق کر رہے ہو۔" وہ نہایت انداز میں چلائی۔

"یہ جھوٹ نہیں ہے بلکہ! میں اور مدد شادی کر رہے ہیں۔"

آہستہ آہستہ اور وزن لیتے میں بولا۔

"تم تمہارا کس طرح کر سکتے ہو۔ میں مان ہی نہیں سکتی۔" تم کی مدد سے کہنے شادی کر سکتے ہو، تم مجھ سے محبت کرتے ہو، اتنی دفعہ تم نے یہ بات مجھ سے کہی ہے اور ابھی، ابھی ہماری ویڈیو انڈر وی، رہتے تم مجھ سے کبھی کہا تھا۔ صرف سات مہینے تو گزرے ہیں اس دن کو، بولو کہا تھا تم نے اس رات کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔" وہ روتے ہوئے یوں چلا رہی تھی جیسے اپنے حواس ہی میں نہ ہو۔

"ہاں میں تم سے محبت کرتا ہوں، لیکن بلکہ۔"

"میں ایک دوسرے سے اتنی بے تمنا۔ محبت کرتے ہیں۔ ہمارے درمیان کوئی تیرا کیسے آ سکتا ہے۔ ہمارے درمیان کوئی مدد آفاق کبھی نہیں آ سکتی۔"

اس نے قہر کو "لیکن بلکہ" سے آگے بڑھ کر اس کے پتے پر سر رکھ کر اس کا روتے ہی نہیں۔

"میرے یہ ایسا مذاق مت کرنا! ہماری! تمہارے لئے یہ مذاق ہو گا مگر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے چھانی کے تختے پر کھینچ کر لے جا رہا ہو۔ میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں، میں تمہارے بغیر زندہ ہی نہیں سکتی۔"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں بلکہ! صرف میرے لئے کافی نہیں۔ محبت ہے بڑھ کر میرے لئے زندگی میں اور بہت کچھ ہے۔ یہ فیصلہ کو آسان فیصلہ نہیں تھا۔ بہت دکھ کے ساتھ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ مجھے تمہاری فکر تھی، تمہارا خیال تھا، پورے دو مہینے میں اسی الجھن میں جھل رہا کہ کیا کروں۔ میں اپنے خوابوں کی قربانی دے کر فقط محبت کے سہارے زندگی میں گزار سکتا۔ محبت بہت کچھ ہے، مگر محبت سب کچھ نہیں۔ میرے سب خوابوں کی تعمیر بلکہ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر ہیں اور میں انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔" وہ اتنی دیر سے مسلسل نرمی و انانیت سے بات کر رہا تھا، ابھی اس کی کالچر دینا ہی تھا۔

اپنے سینے پر سر رکھ کر دیتی اس لڑکی کو اس نے سکیں کر دوڑیں بنایا تھا، ہاں مگر بیٹھ کی طرح اپنے بازوؤں کے پتلے میں بھی نہیں لپکا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ان لمبوں کو پکڑے ہوئے تھے جنہیں وہ ماہ کے قریب آنے سے پہلے پیلے پر ڈالنا چاہتا تھا۔

احسانی سال کا ساتھ تھا، اتنا سچ تو کہی تھی وہ لڑکی اسے دھکا بڑی عزت کے ساتھ جاگے۔

"میں ایک دوسرے کے ساتھ اسے خوش حالی اور ہر طرح سے انڈیل زندگی، انڈیل گھر، ہم میں تو کبھی کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوگا۔" وہ ابھی کبھی سے جتنی بے یقینی کی طرف نہیں آئی تھی۔

"میں خوش نہیں تھا بلکہ! یہ زندگی کبھی میرا خواب نہیں تھی مگر کس طرح کرنا اور بچوں کی بچت کے بعد میری مرضی کی کوئی چیز ملے سکتا۔"

"وہ ہے اور؟" "ہیں" کہہ رہی تھی اور وہ تھا اور جی وہ اس کے پاس کھینچے ہوئے تھا اسے اپنی امانی حصر

قرار دے رہا تھا۔ جس شخص کی محبت میں اس نے اپنی ہستی مناد دی تھی، جسے خوش رکھنے کے لئے اپنے وجود کو قربان کر چکی تھی، وہ کبہر ہاتھ کا کہ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں۔ جس عورت کا شوہر یہ کہہ دے کہ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں، اس سے بڑھ کر ہمدردی ہوئی عورت اور کون ہو گی۔

اس نے حمیر کے بیٹے رکھا اپنا سر اوپر اٹھایا اور آنسو برساتی آنکھوں سے بے چینی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ جراس کی زبان نے کہا تھا وہی اس کی آنکھوں میں بھی لکھا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ اس کے پاس سے دور ہوتی تو وہ پر سکون سا ہوتا دوبارہ اپنے کپڑے الماری سے نکالنے لگا۔ وہ دیکھ کر اسے ایک کفری کی تک اسے دیکھ کر جاری تھی۔ اپنے سارے کپڑے باہر نکالنے کے بعد اس نے اپنا دوسرا سامان اٹھا کر شروع کر دیا تھا۔

وہ ہنسنے چلا گیا۔ کہا کرتے تھے کہ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر سارا سامان لا کر ڈھیر کرنے کے بعد چا نہیں کہاں چلا گیا۔ اس نے تین روزہ دھار کھلتے اور پھر بند ہونے کی آواز ضرور سنی تھی۔ کافی دیر بعد واپس آیا۔

”حوی! ایلز بیر سے ساتھ ایسا مت کرو۔ پلایز تم جیسا کہو گے میں دیا کروں گی۔ میرا پرہیز تو دیسے ہی ہو گیا ہے۔ میری سڑکی پر جی سے تمہیں پتا ہے۔ ہاں۔ بھروسہ شام میں کہی کہ وہاں جب بھی کرلوں گی اور اس سڑکے کو بھی کچھ کر لیا کروں گی، کوئی ایسا کام جس میں اچھے پیسلے جائیں۔ میں اب تمہیں بالکل بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ یقین کرو، میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔ تمہیں یقین بھی نہیں آئے گا کہ ملنا ہی منت کر سکتی ہے۔ اس قسم بھجود کر مت جاؤ۔“ وہ بے اختیار بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی اور جتنی انداز میں کارڈن میں رکھا مائٹرواٹس باہر نکالنے لگی۔

”ہا! بند کرو یہ پاگل پتا۔“ وہ سخت کچھ میں بولا۔ پھر جیسے کچھ سوچ کر اس نے اپنے کھٹے کھٹے ہاتھوں میں کیا اور دوستانہ انداز اختیار کر کے بولا۔

”تم جا کر مت ہاتھ بھڑو اور کھاؤ کھاؤ۔ شام کے چھ بج رہے ہیں اور تم دھیر سے ایسے ہی بیٹھی ہو، لچ میں بھی کچھ نہیں لیا۔ جاؤ جا کر کھاؤ کھاؤ اور ایک گرم گرم چائے کا پیو۔ اس سے بہت بہتر محسوس کرو گی۔“ اس دوستانہ اور نرم کچھ میں سے تبصرہ بھیجی ہوئی تھی کہ وہ بغیر شکایت کے اسے اس کا کام ختم کرنے دے۔

”حوی! اس طرح سے تو کوئی بھی نہیں کرتا۔ تمہیں مجھ سے شکایت کیا ہے؟“

”بھری بات۔ میں کبہر تو کہتا ہوں، مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں آتی ہے کار میں مجھے پریشان مت کرو۔“ اس بار اس کے کچھ میں زنی کا مضمر تو دے کر تھا۔

”اور تمہارا یہ بغیر میرا کیا ہوگا؟ تمہارا سوا اس دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں، تم میرا واحد سہارا ہو، میرا واحد رشتہ ہو۔ میں تمہارا بغیر اکیلے کیسے رہوں گی، تم نے یہ بھی سوچا ہے؟“ وہ ایک بار پھر زور زور سے دنے لگی۔

”تم اپنی کسی کے پاس چلی جانا۔ وہ تمہارا ہی ہیں۔ بتانا ظالم تم انہیں کبھی ہو، وہ اور کسی نہیں۔ بھرتم اپنا کھانا کمانی ہو، کوئی انسان کے کھر جو بدعتن کر رہو گی۔“ کتنا مادہ و آسان ساحل تھا، واقعی اسے خیال ہی نہیں آیا کہ وہ واپس اس ماں کے گھر جا سکتی ہے جو بھلو بہمان اپنے گھر پر آئے ایک کپ چائے تک نہیں چلا سکتی۔ وہ اسے نظر انداز کر کے اپنی بیٹک میں مصروف رہا۔ اب وہ اس کے قریب ہی آ کر پلٹ پر گھٹنوں پر سر رکھے بے آواز آنسو بہا رہی

تھی۔ کچھ دیر بعد اسے کچھ سے شامی کہاؤں کے سنے جانے کی خوشبو آئی۔ اس کے کچھ دیر بعد چائے کی خوشبو۔

”میں نے کباب فرمایا کئے ہیں، اگر تمہیں کھانا ہے تو کباب اور بریفے فیمل پر ہی رکھے ہیں اور کباب میں چائے بھی ہے۔“

وہ چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر کمرے میں داخل آ گیا اور اسے مخاطب کر کے اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی وہی آن کر لیا۔ وہ کارپٹ پر ابھی بھی اسی جگہ، اسی انداز میں بیٹھی تھی، اس کی آنکھوں سے ابھی بھی قطرہ قطرہ کر کے بہہ نکلا رہا تھا۔ خوش فہم میں وہ ڈاؤن کبھی جھٹکوں کہ جان کیوں نہ پایا۔

”بیڈ! حمیر کے موبائل پر کال آئی تھی اور وہ ایک ہاتھ میں چائے کا کپ اور دوسرے میں موبائل لے کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ اس کی آواز وہ آسانی سن سکتی تھی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کسی ہو؟“ اس کا لہجہ بہت پر جوش اور آواز خوشی سے بھر پوری تھی۔

”نہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ تم میری فکر مت کرو۔“

”ڈنٹ دوسری سدرہ کو بھی چھوٹا سا بچہ ہوں جس سے پیچھے تم صبح شین آؤ گی۔ میں کیا مہارہ بیچے تک آفس پہنچوں گا ہاں! میں پھر کچھ دیر چھٹی میں تم سے ملاقات ہو گی۔ اوکے، ایک گھر ہائے۔“

ایسا کیا تھا وہ اس لو کی میں ڈھائی سالوں کی اس کی محبت بھری رفاقت کو اس نے محض دو ماہ میں خاک کر ڈالا۔ جتنا کچھ جڑ اس کا آشیانہ کس آسانی سے اس نے اجاڑ ڈالا تھا۔

”تمہیں تو اور بہت سے مل گئے ہیں۔ اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ مجھے خیر لو۔ مگر میری زندگی میں تو فقط یہی ایک شخص ہے۔ اسے مجھ سے مت چھینو۔ یہ مجھ سے چھین گیا تو میں اس طرح بی باک ہوں گی؟“ اس کے منی میں آئی کہ وہ ابھی اور اسی وقت جا کر اس لو کی سے ملے۔ اس کے سامنے ایک جھوٹے پڑیں تو ہاتھ جوڑے۔ اس کے پاؤں پکڑنے سے پڑیں تو پاؤں پکڑ لے۔ اس کی منت کر رہے۔

وہ کمرے میں واپس آیا۔ موبائل میں پر رکھا، مگر ایک نظر اس پر ڈالی اور سونے کے لئے بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ کارپٹ پر بیٹھی رہی اور وہ بیڈ پر لیٹا ہوا۔ جس شب کو اس کا دل چاہا ہاتھ پکڑ کر روک لے۔ وہ اتنی تیزی سے گزر رہی تھی کہ سو رہا ہونے میں کچھ وقت رہی نہیں گیا تھا۔ وہ کچھ دیر سو رہا پتلی تھی، سو کر اٹھی تو سب کچھ پہلے جیسا ہو گا، یہ ڈراؤن خواب سو کر اٹھنے پر اپنی موت پر چرمانے گا، مگر مزید آنکھوں میں آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ صبح کی روشنی پہنچتی دیکھ کر وہ گھبرا کر ابھی اور تیزی سے اس کا نوٹ کس کھول کر اس میں سے کپڑے واپس نکالنے لگی۔

”ہا! وہ اس کے سر پر کھڑا ہے“ فطین لکھاؤں سے گھور رہا تھا۔

”میں کل دوپہر سے تمہارا پاگل ہیں برداشت کر رہا ہوں۔ صرف اس لئے کہ تم نے بہت مدت ایک ساتھ بہت اچھے طرح گزارا ہے، میں چاہتا تھا کہ اب تم اپنے دوستوں کی طرح کتنی اچھی اور کسی جھگڑے کے بغیر ایک دوسرے کو خدا حافظ کہیں۔“ حکم تمہیں دے بدلے پر مجبور کر رہی ہو۔ تم ایک پرچی بھی، ڈاؤن لو کی ہو، کیوں باہر جاسکی ان چہ اور جاہل عورت کی طرح رانی ایک کر کے مائل کو خواب کر رہی ہو۔“

”میرا شوہر مجھے چھوڑ کر کسی اور سے شادی کرنے والا ہے نہیں ہوں میں پرچی لکھی نہیں ہوں میں ڈاؤن،

میں چاہی ہی ٹھیک ہوں۔" کاش وہ اسے چھوڑ دیتا مگر وہ یہ بات کہہ پائی۔

سوئیٹ کس دایہ بنے کرنے کے بعد وہ نپانے چلا گیا، ہانہا کردہ آکر اسی اجتماع اور اسی انداز سے تیار ہونے لگا جیسے روز ہوتا تھا۔ اس کے بعد اس نے کمرے سے اپنا سوئیٹ کس باہر نکالا، ٹھیک ٹھیک جیسے ہی اس نے آخری کارڈن کمرے سے باہر نکالا وہ فوراً اس کے پاس آئی اور اس کے بازو کو درے سے پکڑ کر منت پھرے لیجے میں ہوئی۔

"تمہیں اس سے شادی کرنی ہے کہو، لیکن مجھے چھوڑ کرست جاؤ حوی! میں تم دونوں کی زندگی میں بالکل مدافعت نہیں کروں گی، اس اتفاق دے دو کہ جہاں اپم رہو گے وہیں میں بھی رہ سکوں۔" صبر نے اپنا انداز بہت ناگوار کی ہے پھرایا اور اس کی بات کا جواب دینے بغیر کارڈن ٹھیکتا کرے سے باہر آ گیا۔ وہ دوڑے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے آئی۔

"تمہارے سوا میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گی۔" وہ اپنے پیچھے آئی اس روٹی اور اپنا نہیں کرتی آواز کو نظر انداز کر کے اپنا سارا سامان ایک ایک کر کے مین دروازے سے نکال کر لٹ کی طرف لے جا کر رکھنے لگا۔

"دیکھو تمہارے سوا میرا کوئی بھی نہیں، میں بالکل اکیلی ہوں۔" اس نے اس کی تسلی پیچھے سے پکڑ کر کسی بیکارڈن کے سے انداز میں اس سے ٹھیک ہانگی۔ اس نے ایک جھکے سے اپنی تسلی اس کی گرفت سے پھڑپائی اور اپنی سخت لیجے میں اسے دھکیب دلی۔

"تم نے اگر یہ ڈرامہ بند نہ کیا اور مزہ ایک قدیم مہم میرے پیچھے آئیں تو میں تمہارا بالکل لاپرواہی کروں گا۔" وہ درگرم کر ٹھیک کر خوف زدہ نکلاں سے اسے دھکی رہی اور وہ اپنا ٹھیک دروازے کے اندر سے اٹھا کر لٹ کی طرف چلا گیا۔

اس کا ذہن پھر سے ڈاؤن ہونے لگا، اعصاب پھر سے تھوہونے لگے، احساسات پر پھر سے ہدف بننے لگی، ہوش خود سے بیکارڈن کی بالکل صورت کی طرح اس نے اپنے اپنا فرشتہ کا دروازہ دایہ بند کیا اور وہیں دروازے کے پاس ہی ٹھکر رہی پڑنے لگی۔ اسے اس جگہ بیٹھنے کیسے ہونے چاہتے تھے جب اس کے گھر کی ناسو کی ٹون کی تلے نے توڑا۔

"باقی ہو میرے سنس آف ہیرس کو دیکھا کیسا پینکلیٹ ٹھیک کی تمہارے ساتھ۔" ڈرا کر دیکھا جا نہیں سمجھ سکتی وہ دیر میں۔" اس نے اپنے کانوں کے پاس ایک بانس آواز سنئی، وہ دیکھتا ہوا دایہ بالوں کی طرح ٹون کی طرف بھاگی۔ اتنا اہوا بعد چند کمرے دگی پڑنے لگی اسے نظر نہیں آئی، بہت ہی طرح وہ ٹھکر کر کے بلے زین پر گری، اس کی ڈاک اور ہونٹ پر چوٹ لگی تھی، سخت تکلیف کا احساس بھی ہوا تھا مگر وہ اس چوٹ پر دھیان دینے بغیر ٹون کی طرف لگی اور سمجھ کر رہنے نہ پانے لگا۔

"حوی۔" یہ نام پکارے ہی انھیں پھر آنسوؤں سے بھرے گئی تھیں۔

"میں بولی رہی ہوں بابا۔" وہ کی کی آواز تھی۔

"جہیں کیا صبر کے ٹون کا انتظار تھا؟"

"میں، ویسے ہی میں کبھی شاید اس کا ٹون ہو۔" اپنے آنسوؤں پر قابو پا کر وہ ڈال انداز میں بات کرنے

کی کوشش کرنے لگی کسی کو کچھ بات نہیں چلتا جا ہے کسی کو بھی دلی ہوگی۔

"بہت دنوں سے تمہارا ٹون نہیں آیا، اس نے میں سے سچا تمہاری خیریت پر پوچھوں۔ تمہارے آنسو ٹون کیا تو بچا چلا تم آج وہاں آئی نہیں، کسی طبیعت ہے تمہاری؟"

"میری طبیعت ٹھیک ہے کی، اس ویسے ہی آج کمر میں کچھ کام تھا، اس نے چھٹی کر لی۔ آپ کسی ہیں اور انکل اور عبداللہ کیسے ہیں؟"

"ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرا گھر اجڑ گیا۔ کسی ماں جو، جہیں میرے دکھ کیوں جاتیں چلتے؟"

"ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مگر بھی ٹھیک ہیں۔ وہ میں نے تم سے عبداللہ کی جانب کے لئے بات کی تھی، مگر جوشن کب کا ہو گیا اس کا پھر اب تو اس نے کہیہو کے بھی اتنے سارے کورسز کر لئے ہیں۔ دیکھی کوئی جگہ تم نے اس کے لئے اپنے آفس میں؟"

"جی کی، میں کوشش کر رہی ہوں۔ انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔" اس سے بالکل بھی بولا نہیں جا رہا تھا۔ بڑی مصلوں سے اپنی تمام تر طاقتوں کو تھک کر کے وہ مصلوں کو ادا کر رہی تھی۔ ریلیٹر کر پٹی پر رکھ کر اس نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ بھرا۔ اس کی انگلیاں خون آلود ہو گئی تھیں۔ اس کے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا اور انگوٹھوں سے آنسو خون صاف کرنے کے لئے ٹشو پیپر لیے، وہ ڈانگے بیل کے پاس آئی، جہاں بہت سے بھوٹے برتن رکھے تھے۔ ایک پلیٹ میں ڈھک کر رکھے کھاب اور اس کے قریب ڈیل روٹی، چائے کے خالی کپ۔ وہ ٹشو پیپر لینا بھولی چلی تھی۔ وہ اب آہستہ آہستہ ان برتنوں کو چھوڑی تھی۔

وہ اپنے اپارٹمنٹ کے ایک ایک کونے میں پاگوں کی طرح روٹی ہوئی پھر رہی تھی۔ نہ زمین پر تھی نہ آسمان سر پر گرتا تھا۔ کچھ مٹی تو میں ہوا تھا، نظا تھا کہ ایک کمر، ایک رشتے اور ایک محبت کی محبت میں خود کو مٹا دینے والی ڈولڑی پھر سے تمہارے تھی۔

☆☆☆

"دعیمیر میرے بغیر خیر آ جاتی ہے۔" میں تو نہیں سو پائی تمہارے عا، میں تو نہیں جاتی پائی تمہارے عا۔ تم کس طرح تھی رہے ہو میرے بغیر؟ پیڑز دایہ آ جاؤ۔"

دھوڑے، دھکے اس کی تصویر پر ہاتھیں کر رہی تھی۔

آج رات وہ کسی اور لڑکی کے ساتھ تھا۔ اس کا حق کی اور کو دینے والا تھا۔

مگر وہ چھوٹوں میں اس نے اس کی سر پر اس کا موہاں بھرا لپٹا تھا، اس کے آفس کا نمبر لپٹا تھا اور وہ اس سے کہیں پر بھی ہاتھ نہیں کر رہا تھا۔ ایک موبو نمبری امیدی تھی، شاید وہ اسے ڈک پائے، لیکن وہ اس سے بات نہیں کر پائی تھی اور وہ رات آگئی تھی، وہ اپنے کمرے میں تھا پھر پھوٹ کر روئی۔ کبھی بہت زور دے پیچ کر، کبھی بغیر آواز کے۔

"مجھے بہت اچھا لگے گا حوی! اب ایک روز تم مجھ سے کوئے تھی جلدی کیجیں سال گزار دے، بتائی نہیں چلا ہاں! بہت جلدی ہے کیجیں سال گزارنے کی۔ کیجیں سال بدیم تو بڑی ہو جاؤ گی۔" اس رات جب وہ یہ باتیں صبر سے کر رہی تھی۔ تب کا صبر قدرے اس کی سادگی پر کس قدر مسکرایا ہوگا۔ اس کی قسمت میں تو اس رات کے بعد

بچوں، ماہ کی رات بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اس شخص کی ساری رات روتے رہنے کے بعد صبح کے قریب اس کی آنکھ کی تھمی تو صبح اپنے مخصوص وقت پر وہ بڑا کر جاگ کھڑی تھی۔

”خو! اٹھو۔“ روانی میں بولتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ مگر زور سے راتوں کی طرح اسے خود کو یاد دلانا پڑا کہ وہ کمرے میں تھا ہے۔

”تمہیں اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی؟ میری طرح کون تمہارا خیال رکھتا ہوگا، کون صبح میں فریض جوں لا کر دیتا ہوگا، رات میں کون تمہارے لئے دودھ کا گلاس لاتا ہوگا۔“ وہ ایک بار پھر زار و قطار رونے لگی تھی۔

☆☆☆

دن پر دن گزر رہے تھے، اسے اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نکلے، باہر کی دنیا میں گئے پورے تیس دن ہو چکے تھے۔ تیس دنوں سے وہ اپنے اپارٹمنٹ میں قید کسی مردے کی سی زندگی جی رہی تھی۔ اس کے آفس سے اس کی غیر حاضری کے اگلے ہی روز دن آیا تھا۔

اس نے اپنی کسی نجی مصروفیت کا کہہ کر آفس سے چھٹی کر لی تھی۔ اس نے کبھی اپنی تہی تو کیا، بعض ایک دن کی چھٹی بھی کبھی نہیں کی تھی۔

انہیں دن اس نے اپنی بیویوں کی حالت میں گزارے مگر تیس دنوں سے وہ دودھ اور چینی کے بعد جاتی بھی ختم ہونے کا احساس ہوا تو وہ چرکی۔ فرخ میں رکھا دودھ اور خشک دودھ کی روز بوب کے ختم ہو چکے تھے، وہ کتنے دنوں سے بغیر دودھ اور بغیر شکر کے چائے پانی رہی تھی۔ وہ ابھی زندہ ہے، اسے خود اپنے آپ کو یاد دلانا پڑا، یہ اپارٹمنٹ اس کی قبر تھا اور وہ اس میں کسی مردہ سے مر رہی تھی، ابھی اس سینے کے باہر وہ باقی تھے اور اس کے پاس صرف تین ہزار روپے تھے۔ کہ اس کی پوری کی پوری تنخواہ مگر کے اخراجات میں خرچ ہو جا رہی تھی۔ بچت تو صبر رخصا کی تنخواہ کی کرتے تھے، وہ لوگ۔ تین ہزار روپے، اس کی کل کائنات اس کا کوئی چیک بیلنس نہیں تھا۔ اس کا اپنا اکیلا کا کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں تھا۔

تین ہزار روپے کا کل اثاثہ رکھتے ہوئے وہ اپارٹمنٹ میں بند اور کتنے دن روکھتی تھی؟ اسے چیت بھرنے کو اتنا بھی چاہئے تھا، تین ڈھائی ڈھائی کو لکڑیاں کا چائے تھا اور سر چھپانے کو کھیت بھی چاہئے تھی، اسے یہ سب کچھ چاہئے تھا، اس لئے کہ وہ زندہ تھی اور یہ سب حاصل کرنے کے لئے اسے وہ بارہ دینا سے اپنا شہر چھوڑنا تھا۔

ایکسویں روز صبح وہ اپنے آفس جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ اس نے آئیے کے سامنے کھڑے ہو کر کتنے دنوں بعد خود کو دیکھا۔ اس کی حالت واقعی کسی مردہ جیسی تھی۔ اندر دھنسی ہوئی چمک اور زندگی سے ماری انکھیں، آنکھوں کے نیچے گہرے مٹلے، ہڈیاں جھپٹا چھو، ایسے جیسے ابھی کسی سنگین بیماری سے ابھی ہو رہی ہو۔ کبھی آفس جانے کے لئے اسے اجازت سے تیار نہیں ہوئی تھی، چھٹی آج ہو رہی تھی۔

بیت فریض اور چاق و چوبند اگر وہ سب کو نہ بھی گئے تو کم از کم ایسی کمزور اور سر جھانی ہوئی بھی نظر نہ آئے کہ کوئی اس بارے میں کچھ پوچھے۔ وہ چلا گیا تھا تو کیا ہوا، اسے واپس تو اس کے پاس آنا تھا اور وہ اس کی واپسی سے پہلے کہ یہ سارا وقت اس طرح گزارنا پڑے گا کسی کے کسی بھی جاننے والے کو کچھ پتا چل سکے۔ کچھ دنوں وہ

واپس آجائے گا مگر پھر کاشمیر اور فائر جیسے اس کے خالص دوست گھر کی کوئی کوئی کتا اسے اور جگ بھائی کروائے۔

وہ آفس آگئی تھی۔ اپنی ظاہری حالت کو چھٹی لباس، بہترین میک اپ اور دلاؤ بڑا سکرپٹ کے پردے میں چھپا لیا تھا مگر اندر کی دنیا کا کیا کرتی؟ اس نے کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے رشتی تھی جی اور وہ اہوائی گروپ کی جانب سے وقت پر منعقد نہ ہونے کے خوالے سے لیڈر کلیف کر رہی تھی۔

”میں خوش نہیں تھا! میں تمہارے ساتھ خوش نہیں تھا۔“

”تم میرے لئے بہت قیمتی ہو۔“

”میں بیمار!“ رشتی subject لکھ کھینچنے کے بعد اگلے جلوس کی ختہر تھی۔ وہ چمک کر سیدی ہوئی۔ جو رقم بھائی گروپ کے ذمہ واجب الادا تھی، اس نے اس پر قید کر رکھے کے لئے سامنے رکھے کاغذوں پر لکھا جی نہیں۔

”تم میری منزل نہیں۔ میری منزل سدھ آفاق ہے۔ اسے رشتی بھی نظر آ رہی تھی اور اس کی ختہر کا جی بھی، مگر اسے بولا گیا ہے، یہ کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”ہیلو کو!“ فائر حسب عادت روانہ سے پرے تیرا آواز میں بولا اندر آ گیا، کچھ میں نے ایس بی لئے ہوئے۔

میں تمہارا پتہ استعمال کر سکتا ہوں؟ میرا پتہ اس وقت روکھی ہو گیا۔ یہ اس کی طرح ایضا ہوا ہے۔

”اورہ شیور!“ اس کے چہ چہال سو کے جواب میں وہ جہرا سکرانی اور پھر دوبارہ رشتی اور اپنے سامنے رکھے کاغذوں کو دیکھتے ہوئے اسے خط ڈکلیف کروائے گی۔

اسے اپنے سامنے لکھے لکھوں کو پڑھنے کے باوجود بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”میں بیمار! آگے۔“

”تم میری زندگی کا سب سے خوبصورت احساس ہو۔“

”آپ کی طبیعت ٹھیک ٹھیک لگ رہی ہے۔“ رشتی خشک لکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ہاں۔ میں میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ اصل میں کل ساری رات لائٹ نہیں تھی۔ تین ڈسٹرپ ری

ہے، اس لئے آپ نے کچھ عشا گھنٹا کا احساس ہو رہا ہے۔“ وہ اسے جواب دیتے ہوئے سکرانی۔

”آپ خود تھارڈ لیٹ کر لیں۔ میں شام کے بعد جاؤں گی۔“ دیکھیں لیتے۔

”نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آئی ایم فائن۔ کراچی میں رہتا ہے تو کبھی غائب ہوا اور پانی غائب والے

مسائل تو جھٹکتے ہی پڑیں گے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ کی بورڈ پر ہاتھ چلائے ہوئے فائر گردن تو بھی کر کے تھوڑی

تھوڑی دیر بعد اسے گھری لکھوں سے دیکھا جا رہا تھا۔

”اپنا کچھ میں آپ کے لئے ایک کپ چائے لے آتی ہوں۔“ رشتی اٹھ کھڑی فائر فائز با بالکل سیدھا سیدھا بیورو

اسے دیکھ کر چلا جا رہا تھا۔

”کیا بات ہے۔ تم مجھے ایسے دیکھ رہے ہو؟ میرے کیا بینک گل آئے ہیں۔“ اس کی خاموشی اور اس

نگاہوں کی گہرائی سے بچنے کی خاطر غیر سنجیدگی سے ہنستے ہوئے پوچھنے لگی۔

”تم آج خوبصورت بہت لگ رہی ہو، اسی لئے۔“

”مذہب جلاؤ نہ زار اسے واقعی کسی دن پڑھے۔“ اس کی کچھ کو بچی، تجسّس ی نگاہیں پور کھرا لہجہ سے بری طرح مضرب کر رہا تھا۔ فائز جیسے ہی اس کے کہیں سے لگا اس نے سکون کا سانس لیا۔

☆☆☆

اسے آفس دوبارہ جوڑنے کے اس روز حواں اور قہا۔ پہلے دن غیر حاضر رہا لی اور پھر کچھ ایسے انداز کا مظاہرہ کرنے کے بعد اس نے پھر جی رن میں چھوڑ دیں۔ ہونے والی قہا جو لوگوں کو چھوڑنے کے لیے قائم تھی حسب معمول وہ ایک فائل دیکھنے کے ساتھ ساتھ میڈیٹنگ کے کمانے اور کولڈ ڈرنک کے سبب لینے میں بھی مصروف تھی۔ اپنے موبائل پر کال آتی دیکھ کر اس نے دھانی کے عالم میں کال ریسیور کر لی۔

”ہیلو، ہیلو ماہا! تمہیں بول رہا ہوں۔“ سینڈویچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فائل پر گر پڑا۔

”خوبی“۔ اس کے لبوں سے اسنے دھیمے انداز میں یہ نام لگا کہ شاید دوسری طرف سنا بھی نہیں جاسکتا۔

”ہم! اچھی جمیر بول رہا ہوں۔“ کیا ان کا برسوں کا ساتھ اکتا کمزور اور اکتا بے حقیقی تھا کہ انہیں ایک دوسرے سے اپنا تعارف کروانا پڑے۔

”میں حیرتوں میں رہا ہوں۔“ (میں تمہیں تہنہ ہی آؤں گی سے بچاؤ تھی ہوں۔ یہ تعاضی اور پر تکلف جملے بولی کر کیوں مجھے پرایا جارہے ہو؟) اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں اور ملحق میں ایسا پھندا اٹھا تھا کہ وہ بکھ کر ہی نہیں مارتی تھی۔

”مہار؟“ اس کی خاموشی سے جھگ آکر اس نے پھر سے اس کا نام لیا۔

”بس! بس! جی رہی ہوں، بس! بس! مر رہی ہوں۔ تمہارے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا حتیٰ وہیلز اور لاس آجائو۔“

”تم کیسے ہو حوی؟“ منہ سے آواز نکلنے کی دیر تھی، اس کی آنکھوں میں شہر اپنی قطرہ قطرہ کر کے اس کے

چہرے اور گردن کو بھونکتا میز پر گر گئے تھے۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس کی آواز بہت اموار اور نازل تھی۔

”مجھے تم سے بکھڑا ہو سکی باتیں کرتے ہیں۔ اسی کے لئے میں نے خون کیا ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت تمہارا فخر یک ہو گا تو جو باتیں میں تم سے کرنا چاہتا ہوں، وہ تمہیں دھڑپ کے بغیر آرام سے کر سکتا ہوں۔“ وہ خاموش بیٹھی میری عیسیٰ سے گرتے اپنے آنسوؤں کو لمبک تک دیکھے چلی جا رہی تھی۔

”ہم بائیس بیس تھے۔ اسی روز کدوا چاہتا تھا کہ عظیم تنہا باقی رہے اور اس قدر کوٹھنفل ہو دے جس کے جسم کو بڑے لکھے، پھر انفرادی طرح ان تمام امور پر بات کر بیٹھیں بائے تھے۔ میں اسے دن بھر اٹھرا ہوا کرتے رہا۔ جہاں فیروز سے باہر آؤ۔ اب ایک مہینہ ہو چکا ہے اور ارباخیل سے تم اس جہاں فیروز سے کل کر ساری صورت حال کو حقیقت پسندی کے ساتھ قبول کر چکی ہو اب میں تمام تغیر طلب امور پر بات کر لینی چاہئے۔“ وہ سیڑھا کا کام کر بات کی طرف آتا بیٹھ گیا اور ہارے ہوئے۔ اس کے آنسوؤں کے بہنے کی رفتار نہ کم رہی۔ یہ شہت آگئی تھی۔

”میں ڈیوڑھی اور تھمارے مہر کی بات کر رہا ہوں۔ میں تمہیں ایک لاکھ روپے کا چیک بھجوا دوں یا تم کیش لو گی؟“ یہ ایک شوہر کی اپنی بیوی سے نہیں، ایک بینکر کی اسنے کلائنٹ سے بزنس کیونین کیشن تھی۔

غیر جذباتی اور مدلل۔ وہ جواب میں کچھ بھی نہیں کہہ پائی۔ اس کے آنسو اسے کچھ بولنے ہی نہیں دے رہے تھے۔ وہ صرف یہ کوشش کئے جا رہے تھے کہ اس کی سکینوں کی آواز اس لائق کے دوسری طرف تک نہ پہنچیں۔

”میں اور سدرہ دس پندرہ دن میں امریکہ جا رہے ہیں، میں وہاں Yale میں اینٹھینس لے رہا ہوں۔“

اسے پہلے سے پتہ چلا کہ اس معاملے کو نشانہ لیا جاتا ہوں۔ جس طرح طریقے سے کوئی، میں تمہارا

ادراک اور طرح انداز کو گدگداتی ہمارے باپ رخصت میں جو غریب و نیم غما، وہ سب تم کو خوشی فروخت کر سکتی تھی۔ مجھے اس

کوئی حق نہیں تھا۔ ”وہ اچھے کام کمال کر کے اس کے جواب کا انتظار کر لے گا۔“ پرے ایک دست تک بھی جب وہ

کھنکھناتی ہوئی تو اس نے اسی جھنجھکی و دستانت سے اسے مخاطب کیا۔

”میں تمہارے جواب کا انتظار کر رہا ہوں ماہا!“ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی سسکیوں کو دبانے کی ناکام کوشش کی۔

”مجھے طلاق نہیں چاہئے۔“ بہت کوشش کے باوجود مجھے وہ بغیر روئے۔ جملہ نہیں بول پالی تھی۔ وہ اب اس سے ابھی سکیاں چھپانے کی کوشش نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”لیکن ہلہ! یہ صحیح نہیں ہے۔ آخر تمہاری بھی ایک زندگی ہے، تمہیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا اور پورا حق ہے۔“

”میں نے کہا نا، مجھے نہیں چاہئے۔“ وہ روتے ہوئے چلائی۔

”میں تم سے کیا مانگ رہی ہوں؟ مجھے طلاق دینے بغیر بھی تو تم سداہم آفاق کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہو۔ میں کبھی بھی تمہارے پاس کوئی حق جتانے نہیں آؤں گی، کچھ مانگنے نہیں آؤں گی۔“

”تم ابھی بھی اس جذباتی کیفیت سے نہیں نکلیں۔“ وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔

”مذہ کے ایزد پوش۔ جس کیس وقت ہم کسی اس مذہبی کیفیت سے باہر نکل آؤ تو مجھے فوراً رابطہ کرنے سے آغوشوں کر کے تم احسان یوسف سے میرا مرکب کا ایڈریس اور فون نمبر لے سکتی ہو۔ اس حالت سے نکل کر اچھی زندگی کے بارے میں سوچو گی اور کسی ایسے انسان کا ہاتھ قدام لو گی تو مجھے واقعی ہاتھ خوش ہو گی۔ اچھا میں فون بند کر رہا ہوں۔ اللہ حافظ۔“ بہت فیاضی کے ساتھ اسے اس کی زندگی کے بارے میں سوچنے کی دعوت دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

ایک قیامت اسے اپنی آنکھوں کے سامنے ہر چیز گردش کر رہی گول گول حرکتی نظر آ رہی تھی۔ آنسوؤں کے طوفان سے اس پار چڑچڑھندگی تھی، ہر مظلوم غریب واضح اور محرم تھا۔

[illegible]

"تم یہ سب کر سکتی ہو کلوم! اس لئے کہ تمہاری زندگی میں تمہارے شوہر کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں۔ تمہارے پاس ایک پورا خاندان ہے جس میں ایک رشتے کی کمی دوسرے رشتے پوری کر سکتے ہیں مگر میرے پاس وہی ایک شخص ہے، میرا شوہر میرا واحد رشتہ۔ کجا ہوا جو اسے مجھ سے دیکر محبت نہیں جیسی مجھے اس سے ہے۔ محبت کے نہ ہونے سے ہمارا رشتہ فتم تو نہیں ہو گیا۔ جلد یا بدیر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گا وہ دوبارہ آ جائے گا۔"

"اور جب وہ واپس آئے گا تو تم سچ کا بھولا شام کو گھر آئے تو بھر بھولا نہیں کیسے کہہ کر اسے بھر سے آگھوں پر بٹھاؤں گی۔ اس ایک سویرے صبح کی ایک شادی پتا رہتا رات جڑوہری کی محبت میں غرق خوشی تھی جو بچا ہے۔ لغت ہے ماہا اصر علی تمہارے اس چتر اور دہن پر۔" کلوم نے ہنسنے اور جھٹھلاہٹ کے ساتھ اسے گھورا۔

"اور فرض کرو وہ واپس نہیں آیا۔ نہ جلد نہ بدیر، اگر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو سکی نہیں پھر؟" کلوم کا انداز جرح کرنے والا تھا۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ واپس آئے گا، وہ واپس آئے گا کلوم! میری محبت اتنی ہے آخر تو تمہیں ہو سکتی۔"

اس کی آواز بھراؤنی اور آنکھیں میکانا شروع ہو گئیں۔

"وہ اپنی زندگی میں سے مجھے نکال ہی نہیں سکتا۔ کہتا ہے،" ماہا تمہاری وجہ سے میری زندگی میں تربیت ہے۔ اگر تم نہ ہو میں تو چاہیں میرا کیا بننا۔" کھوئے کھوئے سے لہجے میں وہ حال کا مفید استہلال کر کے یوں بولی رہی تھی جیسے وہ وہ چار روڑ کے لئے کہیں چلا گیا تھا اور آج کل میں اس واپس آنے کی دعا لگاتا تھا۔ اس روایتی لڑکی کی یہ محبت اور یہ یقین کلوم کی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا۔ اس نے بے اختیار ہنسنے پر آمادہ ہو کر اسے بچنے سے لگا لیا۔

"وہ تمہاری محبت کے لائق نہیں، ماہا! منت خوار کرو خود کو یوں۔ جو تمہیں بغیر کسی خطا کے سچے رہنے میں مجبور کیا، جیسا کہ تمہارا اہل اسے بھی بھول جاؤ۔"

"ملا دینا اچھا آسان نہیں ہوتا کلوم! میں نے اس سے محبت کی ہے۔ اپنے دل کی تمام تر عشقوں اور کھانسیوں کے ساتھ۔ تمہیں اپنے دل کی بات بتاؤ کلوم! اس روز وہ واپس آئے گا،" ماہا انہیں تمہارے پاس واپس آ گیا۔" میں واقعی تمہیں بڑا بات بھلا کر اس کے ساتھ اپنی زندگی وہیں سے شروع کر دوں گی۔ جہاں پر ہمارا ساتھ چھوٹا تھا۔" وہ اپنی دوست کے گڑگڑ کر بلک کر رو پڑی تھی اور کلوم دھان اس کی پشت پر ہونے والے ہاتھ میرے لئے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

"ماہا! تم آگئی کے پاس کیوں نہیں گئیں؟ ایک خبیثے سے تمہارے روی ہو، کتنا بڑا غلطی، معمول لیا، ایکلی رفتی رہیں۔" بہت دیر بعد جب وہ اپنے جذبات پر قابو کر پائی تو اس بات کی طرف آنکلی جو اس وقت اس کا سب سے بڑا مسئلہ تھا اور جس کی وجہ سے اس نے کلوم کو بلایا تھا جو اسے بھی اپنی اس ہمتیہ باپ اور بھائی بہن کے متعلق سچ نہیں بتا پائی تو اس کے متعلق سچ کیونکر بتا دیتی جس سے اسے واقعی محبت تھی اور وہ جسے دو لوگوں کی گھانسی سے گرتا ہوا کسی دیکھ نہیں سکتی تھی۔ وہ می کے گھر کیوں نہیں گئی، اس بات کو سمجھانے کے لئے وہ بہت پیچھے کی باتوں کی طرف نہیں گئی۔ صرف حال کا ایک دو تازہ واقعہ دیا جو محض آٹھ روز پہلے پیش آیا تھا۔ ہنسنے کی رات کی، عبداللہ کے ساتھ اس کے قریب پرانے تھے۔ وہ اسے عبداللہ کی جانب کی یاد دہانی کروانے، اس کا ہی وہی اور ڈاکو شمس دینے آئی تھیں اور وہ غیر

متوقع طور پر انہیں دیکر کھلکا جی تھی۔ رات کے سارے بار وہ میری غیر موجودگی اور اپارٹمنٹ میں اپنے تھا ہونے کا جواز پیش کرنے کے لئے کی محبت کے بھانے بھلاہٹ میں اسے انہیں کچھ بتانا پڑا تھا اور سچ سننے ہی وہ گھبرا کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے انہیں کزنٹ لگ گیا ہو۔" ماہا کہیں واپس اُن کے گھر نہ آ جائے۔" اس نے ان کی آنکھوں میں پھیلے اس خوف کو بڑے آرام سے دیکھ لیا تھا۔ جب اس نے خود نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنے اپارٹمنٹ کو چھوڑ کر کہیں جا جائے گی مگر آج میری کوئی ناکال کے بعد اسے بچا لگ گیا تھا کہ اب اسے یہاں سے جانا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی ہی اتنی غلامی نہیں جتنا وہ انہیں سمجھتی تھی۔ اس اتنی بات تو تھا کہ اس کے گھر میں اس کے لئے جگہ تھی۔ اس میں ظلم تو کہیں بھی نہیں تھا۔

کلوم کی آنکھوں میں ایک بار پھر اس کے لئے حیرت اور دکھ کا ساتھ ٹھیل گئے تھے۔ ماہا اصر علی، میرا رضا کو اپنا خاندان اور اپنی جانی جیوں کتنی تھی، اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ بھی کی محبت، انکلی کی شفقت اور سونا اور عبداللہ کی پیار میری شرارتیں، کاجا کی پوری زندگی میں سنا ہے اس کے وہ سارے قریب چھوئے تھے، کلوم نے اسے کچھ بتایا نہیں تھا۔

☆☆☆

پاکل آنکھوں والی لڑکی!

اجتے میٹھے خواب نہ دیکھو۔

بچپن کی!!

سوچ کا سارا اڑا لکھن

جینے کی راہ میں مکمل جائے گا

کپے کے پتھروں کی خوشبو کا ریشم

مکمل جائے گا!

تم کیا چاہو؟

خواب، سڑکی بھوکے کی پیش

خواب، ادھری رات کا دوڑ سچ

خواب، خیالوں کا بچھتا ہوا

خوابوں کی منزل، رومانی!

خوابوں کا پائیل تپائی!!

تم کیا چاہو؟

میٹھے خواب، خیرے چاہوں تو

آنکھیں پھینکا پڑتی ہیں یا

رشتے بھولنا پڑتے ہیں

ابلیشوں کی ریت نہ چھو

پاس کی اوتھ سرب نہ دیکھو

اچھے منگے خواب نہ دیکھو!

تھک جاؤ گی!!

بہت منگے خواب دیکھتی تھی بابا احمد علی۔ آج اس کے وہ سارے خواب ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔

”دیکھیں، اس پکس میں بہت جتنی دینشکوار اور کٹل کے گھداں رکھے ہیں، اسے احتیاط سے رکھئے گا۔“

”اس پکس میں بہت نازک کرکری ہے، دیکھیں گا کہیں ٹوٹ نہ جائے۔“ وہ اپنی آنکھوں میں آتے

آنسوؤں کو بار بار پیچھے دھکیل کر سامان اٹھاتے ہوئے مزدوروں کو احتیاط سے سب بکھر گھٹنے کی تائید کے جاری تھی۔

”یہ بے جان چیز ہیں، یہ میرے خواب ہیں۔“ انہیں توڑتا ہے۔ ”اس کی آنکھیں ان سے اچھا کر رہی تھیں۔“

وہ کلوم کے والدین کے گھر بلیک وکسٹن اور شفٹ ہو رہی تھی۔ کلوم کے بچے کے گھر میں اس کے والدین، بھائی،

بھالی اور چھوٹی بہن رہتے تھے۔ خاصا بڑا گھر تھا ان کا۔ اس نے کلوم کے اور اس کی امی کے مندرے دو تین مہرے جے بات

ہوتی تھی کہ ان کی ضرورت کے لئے تو گڑواہ طور ہی بہت ہے۔ فرسٹ فلور پر بنا ایک کمرہ، انچھڈ ہاتھ اور ایک بچان کی

ضرورت سے زائد ہے۔ خالی پڑے اس کمرے کا گردہ کرایہ پر دے دیں تو جگہ استعمال بھی ہونے لگے گی اور کچھ پیسے بھی

مل جائیں گے۔ ان کے گھر کا چونکہ گریٹ ایک ہی تھا اور فرسٹ فلور پر جانے کے لئے بیڑ جہاں بھی گھر کے اندرونی حصے

سے ہی جاتی تھیں، اس لئے وہ کمری جان چکان والی چھوٹی سی فیملی کو گردہ کرایہ پر دینا چاہتے تھے۔

اس نے اس روز کلوم سے گردہ کرایہ پر لینے کی بات کی تھی۔ وہ کہتے کرایہ پر کر دینا چاہتے تھے، یہ اس

کے علم میں تھا۔ کلوم کو سب کچھ بتا دینے کے بعد اس نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ یہ ساری چھائی کسی اور کو نہیں

بتائے گی۔ اپنے شوہر کو بھی نہیں، اپنے والدین کو بھی نہیں۔

پھر ایک چھوٹی کہانی بابا احمد علی کے پاس تیار تھی۔ اس کا شوہر مزید تعلیم حاصل کرنے امریکہ گیا ہو ہے۔

اس کے پیچھے گھر میں دو اکیلی تو نہیں رہ سکتی اور چونکہ اس کا شوہر خود دار اور غیرت مند بہت ہے، اسی لئے اسے اچھے

لیے عرصہ تک اپنی بیوی کا اس کے پیسے میں رہنا کسی صورت گوارا نہیں۔ سو اچھے خود دار اور غیرت مندی کے جب وہ

ان کے گھر بلیک وکسٹن دار رہنا چاہتی ہے۔ یوں اس کے شوہر کی خود داری پر کوئی آج بھی نہیں آئے گی اور وہ کسی

انسان جگہ اور تیار نہ ہونے جیسی مشکلات کا شکار بھی نہیں ہوگی کہ کلوم کی فیملی اس کی دیکھی بھالی ہے اور اس کے شوہر کو بھی

ان پر پورا بھروسہ ہے۔

اپارٹمنٹ سے سامان شفٹ ہوتے وقت کلوم اس کے ساتھ سارا وقت رہنا چاہتی تھی۔ اپنا بچوں سے لے لیا

گھر اجڑا، گھر تار اور خالی ہو چکا کسی عورت کے لئے بے گناہ ہوتا، مگر گھر شوہر، بچے وہ انہیں نظر انداز کر کے پورا

دن اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ بابائے اسے خود اہل جانے کا کہا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ گھر خالی ہوتا چلا گیا جس میں دو سال اور آٹھ مہینے پہلے اس نے حیرت رشا کے ساتھ ایک نئی

زندگی کی ابتداء کرتے ہوئے قدم رکھا تھا۔ یہاں قدم قدم پر اس کے خواب بکھرے ہوئے تھے۔ آج اس کے خواب

اس سے چھن رہے تھے۔ آج اس کا گھر اس سے چھن رہا تھا۔ وہ لمبے وہ پادیں اور وہ سارے خواب، سب رزقی خاک

ہونے چاہ رہے تھے۔ وہ خالی اپارٹمنٹ میں اکیلی کھڑی تھی۔

اس کی زندگی کا وہ چوتھا گھر اس سے چھن گیا تھا جسے پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ اس نے اپنا گنا لیا تھا اور اپنا بنا لینے کے بعد اسے بہت چارے، دن رات سخت کر کے بنایا تھا۔ ایک کمرہ، ایک روپہ، ایک بیچاری چھائوں، ان سب کے خواب دیکھی بابا احمد علی ایک بار پھر یہ گھر ہوئی تھی۔

☆☆☆

ہم اکیلے ہیں، چاہے اس اکیلے میں ہم ہمارا اپنا کی قصور نہیں بلکہ میری معاشرے کے مریض اصولوں کے

تھک تو کون کی نگاہوں میں اپنی عزت اور اپنا مجرم قائم رکھنے کے لئے ہمیں اپنا اکیلا پن چھپانا پڑتا ہے۔ وہ بھی لوگوں

سے اپنے اکیلے پن کو چھپانے زندگی کو چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ می کے گھر وہاں نہیں گئی اور اپنا رہنے کا کہیں اور

انتظام کر لیا تو انہوں نے بھی اس سے کسی کڑواہ نظر نظر انداز کرنا چھوڑ دیا۔ مگر نہ اس سے پہلے عبداللہ کی جاب کے

حوالے سے کچھ پرچھے کے لئے اس نے وہاں صرف فون کی بات تو اس کی آواز سننے پر پیشان ہو جاتی تھیں۔ وہ

ان کے گھر کا ڈنچیں ڈالنے والی اور یہ کہ اس نے عبداللہ کو اپنی کپڑی میں جاب بھی دلوائی ہے، ان دونوں باتوں کے

سبب مظہر انکل جب اس سے کافی بھڑ انداز میں بات کرنے لگتے تھے۔ عبداللہ کی جاب کا ہو جانے کے بعد جب می،

عبداللہ، مونا اور اس کا شوہر عثمانی اور کچھ تھے حائف نے اس کے لئے گھر پر آئے تو کلوم کے گھر والوں کی نظروں

میں اپنی عزت اور مجرم قائم رہنے کے احساس نے اسے بے حد اطمینان دلایا۔

عبداللہ چونکہ اس کے اندر میں کام کر رہا تھا، اس لئے وہ خصوصاً اس کے ساتھ بہت اچھا رویہ اختیار رکھنے لگا

تھا۔ دکان تو قمار وہ اس سے ملنے آ جاتا۔ اسے کہیں جانا ہوتا تو ساتھ لے جانے کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیتا اور وہ

قصداً اسے انکار نہ کرتی۔ لوگوں کو جو نظر آ رہا ہوتا ہے، وہ اس پر یقین بھی کر لیتے ہیں۔ صبح سے شام تک آفس اور آفس

کے بعد وہ ایک کمرہ۔ اس کی زندگی ان دونوں اس طور گزر رہی تھی۔

☆☆☆

کلوم کی چھوٹی بہن خزل کی شادی کا سلسلہ تھا۔ آفس کی مصروفیات کے علاوہ اس کے پاس جب بھی وقت

ہوتا وہ شادی کی تیاریوں میں ان لوگوں کے ساتھ شریک ہو جاتی ان آئینہ تنہا میں آئی اور انکل نے اسے گھر کا فرد

ہی سمجھا تھا۔

خلو اس اور بہت اکر وہاں سے نہیں ملتا جہاں سے ہمیں امید ہوتی ہے اور جہاں سے کبھی امید رکھ رہی نہ ہو۔

کبھی کبھی وہاں سے مل کر انسان کو چھیننے کی نئی آواز دے لگتے ہے۔ فائز کی یہ بھی چھوچوکا گھر تھا، سو وہ اکثر یہاں آتا رہتا

تھا اور ان دونوں چھوچوکا شادی کی تیاریوں کا مرحلہ دوپہن کا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ یہاں آتا تھا۔ آفس میں اب اس

سے ملنا اس لئے نہیں ہوتا تھا کہ اسے پیابا کی ناراضیوں اور تنگیوں پر کان دھرتے ہالہ خراس نے ان کی کپڑی جڑا کر لی

تھی۔ فائز کی یہ بات اسے اچھی لگتی تھی کہ امیر اکبر اور بائز و با اختیار شخص کا بیٹا ہونے کے باوجود اس میں اپنی امارت

پر فخر کے بجائے سادگی تھی۔

یونورٹنی میں جب سب کلوم کے حوالے سے وہ شروع شروع میں اس سے ملی تو اس کی کسی بات سے اسے یہ

اندازہ نہ ہوا کہ ایک بڑس نا ٹیکن کا لاڈلا اور ناگوار بیٹا ہے۔ جب کلوم ہی نے ایک بار فائز کے پیابا کی کپڑی اور ان

کے انٹیکس کے متعلق بتا کر اسے حیران کر دیا تھا اور جب اس نے یہ سیکھا تھا کہ وہ ابر کا اس سے تعلق رکھنے والا ایک ایسا انسان ہے جسے اپنی دولت، اپنی حیثیت اور اپنے مقام پر قطعاً کوئی غرور یا اکثریتیں، سلوک کا گمراہ انداز ایک کامیاب دنیا فحاصل گمراہ لہلہایا جا سکتا تھا مگر پھر بھی ان کے اور قاتل کے گمراہنے کے انٹیکس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ انٹیکس کے اس فرق کے باوجود بھی وہ اپنی بیچو بیچو کے گھر خوب آتا۔ نہ صرف وہ بلکہ اس کے سہرا، پایا اور چھوٹی بہن آدھی آئی، انکل کے ہاں ہر خوشی کے موقع پر پوری خوشی کے ساتھ شرکت کے لئے موجود ہوا کرتے۔

اس روز بھی ایسا ہی ایک دن تھا جب شام کے وقت قاتل ان لوگوں کو شاپنگ کرنے لے کر آیا ہوا تھا۔ فزول کو ہاں کی پسند پر بہت بھروسہ تھا، اس لئے وہ اپنی زیادہ تر شاپنگ اسی کے مشورے سے کرتا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بھائی بھی ان لوگوں کے ساتھ موجود تھے۔ وہ لوگ خریداری کر رہی تھیں اور قاتل گاڑی میں بیٹھ کر اونگھتا ان کی شاپنگ ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ شاپنگ ان کی تقریباً ساری ہو چکی تھی۔

”آپ لوگ جا کر کان سے کپڑے لے آئیں، مجھے ذرا مایاں ایک شاپ پر کچھ کام ہے۔ آپ لوگ فارغ ہو کر گاڑی کے پاس پہلے جائیے گا، میں بھی وہیں آ جاؤں گی۔“ اس نے ان دونوں سے کہا اور پھر جیسے ہی وہ دونوں آگے بڑھیں، وہ بچوں کی اس دکان میں آگئی جہاں بچوں نے ہیر کے پیروں سے لے کر دیگر تمام سامان تک کی دستہ اور ہموار ریٹنگ موجود تھی۔ وہ بھائی کو ان کے پہلے بچے کی پیرا کھن پر بھروسہ کیا تھا۔ یہاں پر بھی اس طرح کی دکانوں کو دیکھ کر جس طرح کی حسرت اور افسوس ان کے اندر ہمیشہ بھیل جایا کرتا تھا۔ آج بھی بھیل گیا تھا۔ کاش..... کاش وہ بھی..... شیشے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی اور بیٹھ کر اس طرح اپنے اندر حسرتیں اور اوساں بھیلتی دیکھیں۔ سامنے وہ جو بہت چھوٹا ایک فرک بنگر میں لٹک رہا تھا اور اس کے ساتھ جو بنگ بیٹ اور چھوٹے چھوٹے سے بچے جو تھے ان کی نظر آ رہے تھے، وہ انہیں دیکھ کر رک گئی اور پھر جو کاتر کے سامنے کڑی لڑکی جو شاید اپنے شوہر کے ساتھ جس طرح ہر کیز اور دیگر مختلف برائڈ کی چیزیں دیکھ دیکھ کر رینگتے کئے جا رہی تھی، اپنے ہونے والے بچے کے لئے ابھی سے اچھی چیز خریدنے کی کام چاہا۔ شاید وہ بھی ایسا ہی کرتی، تمھارے سخی ہاں اس نے بڑی امیدوں کے ساتھ وہ منظر تصور کی آگے سے دیکھا تھا جب وہ ماں بننے والی ہوگی۔ جب وہ اپنے ہونے والے بچے کی حیر کے ساتھ مل کر شاپنگ کرے گی۔ اسے بچوں کی سخی خواہش ہے یہ بہت سارے اچھے طرح جانتا تھا۔

”ہم اپنی بیٹی کا نام اہل رکھیں گے۔“ ایک بار باتوں کے دوران اس نے حیر سے کہا تھا۔ ”نہیں بھئی، مجھے نہیں چاہئے۔“ پال پال کر بڑا کر، چڑا، دکھاؤ اور پھر کسی اور کو دے۔ مجھے چاہا چاہئے اور اپنے بچے کا نام ہم روحان رکھیں گے۔“ اس کے کانوں میں اس رات کی ان دونوں کی وہ آوازیں یوں گونج رہی تھیں جیسے کل رات ہی انہوں نے آپس میں باتیں کی ہوں اور پھر بے ساختہ ہی بنگ فرما کر اس کی تازہ تر خصوصیت کے باوجود اس نے نظر اٹھا کر ان کی Baby Girls والے سیکشن سے Baby Boys والے حصے کی طرف آگئی۔

”عمیرا یہ بھلا کتھو دیکھو کیا لگ رہا ہے۔“ وہ آواز پر نہیں اس نام پر چڑھ گئی تھی۔ دنیا میں حیر نام کے لاکھوں لوگ ہوں گے مگر بھی یہ نام ہر بار دل کے تاروں کو جلا کر رکھ دیتا تھا، وہ بے ساختہ پوری کی پوری گوی تاکہ اس آواز اور اس کے مخاطب دونوں کو دیکھ سکے اور دیکھنے پر جو اسے نظر آیا، اس کی ہر ہرگز توقع نہیں کرتی تھی۔ وہ

دونوں اس سے چند قدم کی دوری پر کاؤنٹر کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ دونوں اس کے بالکل سامنے تھے مگر اپنی خریداری اور گفتگو میں اسے مشغول کر آئیں سہرا گھر اور دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔

اسے کمرے سے ہر کسی حساب کتاب کی ضرورت نہیں تھی، اس نے جن بیٹیوں کے لائقہ اور انوں اور اوتوں کو کانٹوں پر گزارا تھا، وہ ان کی تعداد بغیر سے بتا سکتی تھی۔ بتا سکتی تھی کہ اس لڑکی سے اس کے شوہر کی شادی کو آٹھ مہینے اور سات دن ہو چکے ہیں اور وہ کتنے بیٹیوں کی پرکھت تھی، یہ اس کی حالت دیکھ کر ہی پتا چل رہا تھا۔ وہ دو سال اور سات مہینوں تک جس دن کے انتظار میں رہی تھی، اس دن ان اور دوسری لڑکی کو چند بیٹے بھی انھیں دکھانے پر چاہے۔ قاتل بھائی اور سردور آفریقہ کی اوقات کا قاتل۔ اس شخص کی نگاہوں میں ان کے تمام اور ان کی حیثیت کا فرق۔ اس شخص کی نظروں میں اس کی کیا حیثیت ہے، یہ جانتے میں اتنی دیر لگتی؟ اسے اس کے پاس بھی نہیں آتا۔ یہ جانتے میں اتنی دیر لگتی؟

”وہ اپنی زندگی میں سے مجھے نکال ہی نہیں سکتا۔ میرے بغیر تو اس کی راج نہیں ہو سکتی۔“ اس کے بغیر اس کی صبح، دوپہر، شام اور رات سب ہو رہی تھیں اور بہت خوب ہو رہی تھیں۔ اسے اپنی زندگی سے نکال کر وہ بہت خوش، بہت مطمئن اور بہت آسودہ تھا۔ اس کی زندگی میں خوشوار تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ وہ اپنا بننے والا تھا اور اس کے بچے کی ماں لبا اچھل نہیں، ایک دوسری عورت تھی۔

اسے ماں بننے کے سخی سے عزم رکھ کر جس سے اسے عزم رکھنے کا کسی کو بھی کوئی حق نہیں تھا، وہ سخی اس شخص نے ایک دوسری عورت کو اپنی آسانی سے دے دیا تھا۔

وہ خود کو اس کی شریک حیات سمجھتی تھی، غلط، بالکل غلط۔ وہ فقط اس کی شریک لپارٹنٹ تھی۔ جیسی زندگی وہ جینا چاہتا تھا، اسے گزارنے میں اس کی مددگار وہاں۔ اپنا پتا لکھاؤ، اپنا پتا لکھاؤ، اپنا پتا لکھاؤ۔ وہ امریکن انسان ہی کی تو زندگی تھی۔ کوئی کسی پر بوجھ نہیں، لپارٹنٹ کا کرنا اور ملز میں سے کروں گا تو باقی کیا پتا، رہتا ہے، گھر کی زندگی میں آرائش اور دیگر تمام اخراجات تمھارے ذمہ۔ جب ہی جب وہ اپنی کمانی کے بیٹوں سے اس کی شینگھ کا سامان اور دوسری چیزیں لے آتی وہ دو بولے سے اس کا گھر پر آدائیں کرتا تھا۔ وہ اس کا اسامان منہ کیوں ہوتا وہ اس کے لپارٹنٹ میں رہتی تھی۔ اس کا فون، بجلی اور گیس استعمال کرتی تھی جس کا دل وہ اور کرتا تھا۔

ڈاکٹر اعجاز احمد کے آفس میں اس لڑکی سے اس کے دل نے نہیں، دماغ نے شادی کو فیصلہ کیا تھا۔ ایک ڈین اور قابل لڑکی جو مختصر ہی ایم ای اے کر لینے والی تھی اور جو اپنے لباس اور اپنے برائے کسی غل کلاس گھرانے کی نظر آ رہی تھی۔ اسے اپنی تعلیم اور قاتل بنگ بنگ میں ملازمت کے باوجود اس کے پاس کوئی مشہور لیبل بنگ گراؤنڈ نہیں تھا اور اس کی گراؤنڈ لیبل بنگ گراؤنڈ کے ساتھ اونچے بچے کی کوئی لڑکی اسے ملنے کے آتا نظر نہیں آ رہے تھے۔ تب یہ نہیں معلوم تھا کہ کسی مشہور لیبل بنگ گراؤنڈ کے بغیر بھی ایک روز اسے سردور آفریقہ سے بڑے باپ کی بیٹی مل سکتی ہے۔ جب کے حالات کے لحاظ سے لبا اچھل ایک بہتر چن چکی تھی۔ جیسا لائف انسان اسے پسند تھا، قاتل بنگ میں جا رہا اور بہت اچھی سٹری کی باوجود وہ تنہا اسے انورڈ نہیں کر سکتا۔

کیا قسمت تھی اس شخص کی۔ وہ لوگوں کو بچہ دہاں کی طرح استعمال کرتا تھا، ان لوگوں کو بھی جو کسی نہ کسی

حوالے سے اس سے محبت کرتے تھے اس سے بہت پکارنے والا اس کا بڑا بھائی جیسے غلام جاس واس کا رہے دونوں کا بہت تخلص دوست۔ جب تک بھائی کی ضرورت تھی اسے استعمال کرتا رہا۔ جب تک دوست کی ضرورت تھی اسے استعمال کرتا رہا اور جب ضرورت پوری ہوگئی تو اپنی زندگی سے نکال کر باہر پھینک دیا اور بالکل اسی طرح ماہا اصرعلی کے ساتھ ہوا تھا۔

سدرہ آفاق مل گئی تو اسے بالکل اسی طرح دھککارا گیا جیسے اپنے بھائی اور دوست کو دھککارا تھا اور جیسے بھائی کہتے اور سادہ لوگوں کو دھککارا ہوگا۔ دو سال اور سات مہینوں کے ساتھ میں اس نے ایک دن بھی ماہا اصرعلی کو خود پر بوجھ نہیں بنے دیا۔ اڈارنٹ کا کرہ اور میس، بجلی وخن کے بلز پر کرنے کے علاوہ اس کی باقی ساری کمائی کہاں جاتی ہے، ماہا کو کبھی نہیں بتایا گیا۔

قسمت ہے تاس شخص کی کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے لوگوں کو استعمال کر رہا ہوتا ہے اور وہ خوش خوش خود کو استعمال کروانے کے ساتھ اس سے محبت بھی کئے جاتے ہیں۔

”وہ واپس آئے گا کلوم“ امیری محبت اتنی بے اثر تو نہیں ہو سکتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ اپنی خوش فہمیوں پر بسے یا روئے۔ اتنا یقین اس شخص کے بارے میں تھے نہ اس سے محبت تھی، نہ انسانیت۔ یہاں تک کہ بعد دردی بھی نہیں۔ اس کی محبت بے اثر بھی تھی، بے تاثیر بھی۔ بے فیض بھی اور لا حاصل بھی۔ وہ ایک چتر کی محبت میں جلا جاتی جس میں دل اور جذبات نام کی کوئی موجود ہی نہیں تھی۔

اسے میر رضا سے زیادہ خود اپنے آپ سے نفرت ہوئی۔ وہ اس شخص کی محبت میں پاگل، دیوانی اور اندھی ہو چکی تھی۔ اس شخص کو جو انسانیت کی سلسلے سے اتنا پیچھے کر ہوا ہے جو اتنا غور و خوض اور اس حد تک کینز ہے، اس کی؟ ”کلوم“ اتم جس شخص کو برا کہتی ہو، وہ تہا ری سوچ سے بھی زیادہ ہست، گھٹیا اور بچ ہے۔“ اس نے دیکھا کہ اپنا دالت نکال کر اس میں سے ہزار ہزار کے کئی ٹوٹ دھڑ نکال کر اس میں چڑی خریداری کے مل کی پے منٹ کر رہا تھا جو بڑے باپ کی بیٹی کو اس نے کروائی تھی۔ یہ میر رضا کی ایک انوشٹھن تھی تا۔

کلمین سے کچھ بات کرتے کرتے سدرہ آفاق کی نظر اس پر پڑی تو وہ اپنے شہر سے آہستہ آواز میں کچھ بولی۔ شاید یہ کہ ”دو دیکھو سامنے کھڑی لڑکی کہتے غور و خور سے تمہیں ہماز کریم دونوں کو دیکھ رہی ہے۔“ سدرہ آفاق کی بات پر دھیان دیتے میر نے دالت جبب میں واپس رکھتے ہوئے سراٹھا کر سامنے دیکھا اور ماہا نے دیکھا کہ وہ اسے دیکھ کر ساکت رہ گیا ہے۔ کچھ ابھیں، کچھ ناگواری، کچھ بیزاری یہ تمام تاثرات بیک وقت اس کے چہرے پر پھیلنے لگے۔ اسے یقیناً اس سے یہ خطرہ لاحق ہوا تھا کہ وہ اپنی عادت کے مطابق رونا دھونا مچا کر پھر اس کے جیروں میں کرنے کی کوشش کرے گی۔

”حوی اتم جیسے چھوڑ کر یوں چلے گئے۔ بلیرے واپس آ جاؤ۔“ جیسی کچھ احتجاجیں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کرے گی۔

میر رضا کی آنکھوں میں ”کیس کوئی تماشہ نہ ہو جائے“ کا خوف دیکھ کر اس کا دماغی ہی چا کہ وہ یہاں اسی مکان میں ایک سین کر کی اینٹ کے رے مگر کیا کرتی کہ ماہا اصرعلی قاتلے کر لینے والی لڑکی تھی نہیں۔ اگر واقعی ایسی ہوتی تو

اس کے منہ پر کچھ کر دو تین طمانچے لگائی جس سے اس کی محبت، اس کے غلط، اس کی سادگی اور اس کی وقوف کا فضا اڑا لیا۔ کاش وہ کوئی تماشہ کر پاتی۔

”تم یہاں کھڑی ہو؟“ اور وہاں بھائی اور غزل بھجے سے آکر پوچھ رہی ہیں کہ ماہا کہاں ہے۔“ اس نے اپنے پیچھے فائز کی آواز سنی۔ وہ اسے دیکھ کر دوڑ سے ہی بولنے ہوئے اس کے قریب آگئی۔ اپنے چہرے کے تاثرات کو ہر ممکن حد تک مائل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی طرف مڑی۔

”میں بس یہاں سے لٹھری رہی تھی۔“ فائز نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس کی نگاہیں سامنے کھڑے اسے اس خوبصورت سے جوڑے پر جمیں جو خوشی سے سرشار اپنے پہلے پہلے بچے کی شاپک کے اچھی فارغ ہوئے ہی تھے۔

”ہائے فائز!“ سدرہ آفاق نے وہیں سے مسکرا کر فائز کو بیٹھ لکھا تو وہ فوراً ہی چند قدموں کا فاصلہ عبور کر کے ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔

”بیٹھ سدرہ! کیسی ہو؟“

”بالکل ٹھیک۔“ پھر اسے میر سے ملوانے لگی۔

”میر سے میڈن میر رضا۔“

”تمہیں تعارف کروانے کی ضرورت نہیں، میں انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ فائز کے مسکراتے اور خوش اخلاقی سے ہر پر لہجے میں چھپی طعنے کا اتنی دانتی تھی کہ سدرہ آفاق نے چونک کر اسے دیکھا جبکہ میر نے جڑبڑ ہوتے اپنی ناگواری کو بکھل خوش اخلاقی کے پردے میں چھپا دیا۔ فائز کو ماہا کے دوست کی حیثیت سے شاید یہ بچکانا ہو کر دوستی کے معاملہ میں اسے ماہا کے معیار سے شدید اختلاف رہا کرتا تھا۔ وہ انٹینس دیکھے بغیر ٹ پوچھوں کو دوست بنا لیتی تھی۔

جب وہ اس بات کو سمجھی تھی نہیں، اگر سمجھتی تو میر رضا کو فائز کے ذکر کے دوران یہ ضرور بتاتی کہ فائز عیب ایک برنس نا ٹیکنگ کا انوکھا ہے پھر وہ اس کے دوست سے بھینچا فوراً ملنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ اس وقت اسے ماہا کے ساتھ دیکھ کر غائب ہے۔ اس نے اسے اٹھا کر لایا تھا کہ وہ اس کا کوئی فریضی دوست ہے۔

”میرا مطلب ہے تمہاری شادی پر میں میر صاحب سے مل چکا ہوں۔“ فائز نے مسکراتے ہوئے اپنے ہلنے کی وضاحت کی۔ وہ ابھی کسی طعنے پر لگا ہوا ہی سے مسکراتے ہوئے میر کو دیکھ رہا تھا۔

”ارے میں نے آپ دونوں کو اپنی دوست ماہا میر رضا سے تو ملوایا نہیں۔“ اس نے ماہا میر رضا کہتے ہوئے ایک ایک لفظ بہت چٹا چٹا کر ادا کیا۔

”بہت جلدی ہے۔“ اگر کبھی اس سے اس کے شادی سے پہلے والے نام ماہا اصرعلی سے بلاؤں۔“ وہ میر کی ناگواری اور کوفت اور سدرہ کی تیرت و احتجاجیوں کو انجائے کرتے ہوئے مسکرا رہا اور پھر گردن کھما کر وہاں دیکھا جہاں وہ کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں نے بھی وہیں دیکھا تھا۔ وہ جبکہ کھڑی تھی۔ ان کی باہم گفتگو کے دوران ہی وہ وہاں سے نکل کر جا چکی تھی۔

”لوما تو جلی بھی لگی۔ چلو خبر کوئی بات نہیں پھر کبھی آپ دونوں کو اس سے ملواؤں گا..... بہت اچھی لڑکی ہے، اس ایک ہی خرابی ہے اس میں۔ اسے لوگوں کی بچکانہ نہیں۔ سب کو اپنے جیسا سچا اور منہ سے بھتی ہے۔“ میرے کے چہرے سے اب رسی کی مسکراہٹ بھی مل کر طور پر رخصت ہو چکی تھی۔ وہ اب واضح پر ہی اور طے سے فائز کو دیکھ رہا تھا۔ جبکہ سدرہ سب کچھ سمجھ لینے کے بعد اس کی جڑی صورت حال کو اپنے ساتھ لے کر فائز کو دیکھ کر مسلسل چلتی مٹ پھٹ زبان کو خاموش کرانے کی کوشش کر رہی تھی مگر فائز عیدہ اس کی کوششوں سے نہیں، اپنی مرضی سے خاموش بنا تھا۔ اسے جو بہنا تھا وہ کبہ چکا تھا، اسی لئے سدرہ سے خدا حافظ کہتے ہوئے اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

”اسیدے آپ کو کھجور سے مل کر خوش ہوئی ہوگی۔“ میرے لئے نہایت مجبور ہی اس نے ہاتھ ملایا تھا۔

وہ اپنی گاڑی کے پاس پہنچا تو وہاں، ابھالی اور غزل کے ساتھ بیٹنے اور باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ کن لوگوں سے ملی ہے، اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اپنی دوست کے اس دکھ پر بے انتہا محسوس کرنے کے باوجود اسے اس پر سننے سے شہیہ نہ آیا۔ وہ دوستوں کے غلوں کو پہنچاتی ہے، اسے جانتی اور بات بھی ہے مگر پھر بھی وہ اپنے دکھ کی اور سے تو کیا دوستوں سے بھی شیز کرنا گوارا نہیں کرتی۔

”فائز تم.....“ کھر پٹنے کے بعد وہ قصداً گاڑی سے سب سے آخر میں اترتی اور پیچھے ہی غزل اور ابھالی گیت میں تھیں، اس نے فائز کو کھانا دیا۔

”بے فکر رہو، میں یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گا۔“ فائز نے چڑ جانے والے انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔

”نہیں، میں یہ نہیں کہہ رہی۔“

”پھر یہ پوچھنا باقی ہوئی کہ مجھے یہ سب کب سے معلوم ہے اور میں سدرہ کو کیسے جانتا ہوں۔ میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ میں نے اور اس نے امریکہ میں ایک ہی اسکول میں پڑھا ہے، اس کی کمی کی میری حما کے ساتھ دوستی ہے اور یہ کہ میں نے اس کی شادی میں شرکت بھی کی تھی اور دلہا کی حیثیت..... میرا سنا کہ وہ اساتذہ رہ گیا تھا۔ جب تمہاری آغس سے غیر حاضری کی وجہ میری سمجھ میں آئی تھی۔ میں اسی رات کلوم کے گھر گیا، یہ سوچ کر کہ شاید وہ یہ سب کچھ پہلے سے جانتی ہوئی گھر سے تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا پھر میں نے بھی اسے کچھ نہیں بتایا اور خاموشی سے وہاں سے آ گیا۔ میں نے کلوم کو گھر سے کے قابل سمجھا۔ تم نے آغس سے طویل پھلتی لے کر گھر پر بندھیں، میرا کتنی بار دل چاہا کہ میں کلوم کو ساتھ لے کر تمہارے پاس آؤں۔ ہم دونوں لڑ کر تمہارا دھڑکنا شیز کر دیں۔ لیکن اگر میں ایسا کرتا تو تمہیں تو یہی لگتا کہ تمہارے دوست تمہارا ہاں بیٹھے نہیں بلکہ اصرار لیتے آتے ہیں۔ جب تم ایسا نہیں سمجھتے تو میں میں خاموش ہو گیا۔ حالانکہ کتنی بار میرا دل چاہا کہ تم سے کہوں، ایک بار اپنے دوستوں کے پاس بیٹھ کر کہہ دوں کہ تمہارا دل اور خبردار پھر کبھی تم سے نہیں ملے گا۔“ وہ غصے تو نہیں ہاں اپنے دوست کا بغیر ضرورت اس کی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا۔

”فائز، آئی اسو میری آگ میں سے نہیں برٹ گیا۔ تم مجھ پر اور کلوم پر، اپنے دوستوں پر پورا بھروسہ ہے اور میں یہ بات بہت اچھی طرح جان لیتی ہوں کہ اگر خوشی و شری رشتوں کے حوالے سے میں محروم رہی ہوں تو مجھے

اپنے بعض دوست دے کر کاتب تقدیر نے ان ساری محرومیوں کا ازالہ بھی کر دیا ہے۔“ اس پہلے اس نے فائز سے اپنے آنکھیں چھپانے تھے۔

☆☆☆

پھر اس رات جب وہ سونے لیتی تو ہر رات کی طرح اپنے قریب ایک وجوہ کی محسوس نہیں کی، اپنے گھر ان ہاتھوں کا سہارا نہیں تھا۔ شام نہ ہر رات کی طرح کر دیش بدل کر خود ہی روئی اور خود ہی خاموش ہوئی نہ اس کی تصویر کو اپنے پہلو میں رکھا نہ اس سے باتیں کیں نہ یہ کہہ کہ جب مجھے تمہارے بغیر زندگی نہیں آتی تو تمہیں میرے بغیر کیسے نہیں آتی ہوگی؟ اس کی آنکھیں پانچوں سے بھر گئیں اس کی محبت میں نہیں، اپنی مدد، اپنی ذلت اور اپنی بے عزتی کے احساس پر، اپنے جذباتوں کے بے وقوف ہونے پر، جو میں نے انتظار میں اس نے پہل پہل پیچے اور مرے گوارے وہ انتظار آج سے ختم ہوا۔ اس نے اس کی وہ تصویر جو وہ رات پاس رکھی تھی پر دے کر ڈالی۔

”جیسے تم نے مجھے اپنی زندگی سے کٹ کیا، اسی لیے آج میں بھی تمہیں کر رہی ہوں۔ آج سے تم میرے لئے میرے میرے رشتا میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ شہزادہ اور میری یہ نفرت مرے دم تک قائم رہے گی۔ تمہیں کوئی بددعا نہیں دے رہی، اب مگر میں تمہیں کسی معاف بھی نہیں کروں گی۔ قیامت تک نہیں، روز و شب تک نہیں۔“

وہی اہل بھلائی تھی، وہی اس کی زندگی، وہی اس کے روز و شب، وہی اس کا آغس اور وہی اس کا ایک کرے پر مشتمل گھر اور بھلائی زندگی۔ فرق تو یہ کہ اب اسے کسی کا انتظار نہیں تھا۔ اب اس کی کوئی مع اس سوچ سے شروع نہیں ہوتی تھی کہ شاید آج وہ وہاں آجائے اور نہ کوئی رات یہ سوچے کہ کیا پتا آئے والی اگلی شب وہ اس کے پاس ہو۔ زندگی کے دن، رات اور اس کے معمولات سب دیکھے تھے تہہ تہہ میں صرف اس کی سوچ میں آئی تھی اب وہ اپنے اندر مرے جانے والی زندگی کو گھر سے زندہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ زندگی کو بچانا چاہتی تھی وہ اپنی باب میں اتنی بے وقاحت شامت کرنے کی جتنی بھی اس کے کوئٹز اس کے دھکے پر حیران ہو گیا کرتے تھے۔ اپنی پروفیشنل قابلیت میں اضافے کے لئے وہ شہر کے بہترین انسٹی ٹیوشن کے ایک پروفیسر کو ملا کر انسٹی ٹیوشن میں داخل ہو کر اسٹاٹس لینڈ پاسیور، بیوٹن، ریسپورنڈنٹ وغیرہ سے متعلق اسپیشلائزڈ اور پروفیشنل کورسز لے جا رہی تھی۔ وہ کورسز جہاں اس کی قابلیت کو بڑھا رہے تھے وہیں اس کا اہتمام کیا کرنے کا کام بھی کر رہے تھے اور اسے رات کے ٹکے خود کو مصروف رکھنے کا موقع بھی فراہم کر رہے تھے۔ اب شام میں آغس سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ فارغ نہیں ہوئی تھی۔ اپنے کورسز اٹینڈ کرنے جا رہی ہے، لالہ میری میں بیٹھ کر پڑھ رہی ہے اور رات میں اپنے کرے میں بہت دیر تک جاگ کر کتابوں اور انٹرنیٹ کا سہارا لے کر وہ سب کچھ کی کوشش کر رہی ہے۔ جو بچہ گھر کے دوران سمجھ نہیں آتا تھا۔

اب وہ پہلے کی طرح اندھا دھند پیچھے نہیں خرچ کرتی تھی۔ بلکہ سوچ سمجھ کر ہاتھ بڑھا کر ایک بار اپنی تنخواہ خرچ کرتی۔ ایک بار گھر کو کھاتی تھی، ایک بار گھر کی گئی، بار بار قوا سے نہیں دھرا سکتی تھی۔ اب اس کے دو مختلف جنکس میں الگ الگ آؤٹس تھے۔ اپنی بہت شاندار سی بی بی کا وہ صرف اتنا حصہ استعمال کرتی جتنا اسے اپنے پروفیشنل کورسز کرنے اور ان کورسز سے متعلق ہنگامی کاموں خریدنے کے لئے دیا ہوتا۔ اب ایک اضافی خرچہ اس نے لیپ ٹاپ خریدنے کا ضرور کیا تھا کہ گھر پر نہ دے اور کام کرنے کے لئے اسے لادتی چاہئے تھا۔

اس کے پچھلے پرورش کو دو سال ہی ہوئے تھے اور وہ دوبارہ ترقی پا گئی تھی۔ اس کی محنت، اس کی لگن اور پریشانی قابلیت میں ہوتا مسلسل اضافہ، یہ سب اس کی سفاک شہیں تھیں۔ وہ میرٹ پر فخر پاتی ہوئی ہے، یہ احساس اس کی کوئی خرد احمادی کو دواں لا رہا تھا۔ اگر کسی ایک انسان نے اسے درگزر دیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالکل بے کار، غیر اہم اور بے قیمت ہو گئی ہے۔ وہ خود کو خدا ہی نے نظروں میں سرخو کر کے جن کر رہی تھی۔

☆☆☆

اس کے پر موشن پر فائز اور کلوم خاص طور پر اس کے پیچھے گم تھے کہ وہ اس سختی میں سب کو لڑ پکے دے۔ فائز نے خودی ٹینگ کا پروگرام ترتیب دے ڈالا، جس میں لالچ سمیت دیگر کار خراجے ہمارے ذمہ تھا۔ یوں ان سب نے آنے والا ایک ایڈ فائز ہاؤس پر بلا لگا کر کڑے کر ڈالا۔ اکل، آئی، سہا، بیانی وغیرہ تو سب تھے ہی، ساتھ ہی کلوم بھی شہر اور بچوں کے ساتھ اور دل بھی اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ ٹینگ پر موجود تھی۔

قائز کے ساتھ اس نے زارا اور قائز کی بہن آندرکوبھی اداوائے کیا تھا۔ قائز کی ایک بیٹیہے بیچو زارا سے شادی ہوئے تھے دلی تھی۔ وہ بھتا ہرول پرل تھا تو سب ہی اس کی شادی کے لئے ملے ملے اچھا پرورش تھے۔ کلوم، غزل اور بھائی کی طرح وہ بھی اس کی شادی میں پہننے کے لئے تین چار چھوڑے لے چکی تھی اور اسے زارا کو دینے کے لئے ایک شادناں ساتھ بھی خرید چکی تھی۔ کلک والے دن قائز اور آئینہ کے ساتھ زارا کو بچہ دیکھ کر اس نے تپ ہی سب سے پہلے زارا کی غیر موجودگی کی بابت دریافت کیا تھا۔

”سوئی ماہا! میں تمہارا انوشیمن اسے دے نہیں پایا۔ اصل میں وہ کل یا شاید پرسوں کی غلاٹ سے نیویارک جا رہی ہے تو ظاہر ہے اپنی تاریخوں میں معروف ہوگی۔“ فائز نے مسکراتے ہوئے اس کے استفسار کا جواب دیا۔

”نیو یارک؟ لیکن ابھی تو مینے پہلے ہی تو وہ امریکہ سے لوٹی ہے پھر اتنی جلدی دوبارہ؟“

”تو کیا جو میں نے بعد دوبارہ جانے پر پابندی لگ جانی ہے؟“ وہ اس کی حیرت پر سسکایا۔ وہ گاڑی و دروازے کر رہا تھا۔ ابھی وہ لوگ دھرتے تھے۔ فائزر کا جواب سننے اس کی آنکھ کے چہرے پر نظر پڑی تو اسے وہاں مکہ مکرمہ معمولی سا اثر نظر آیا۔ یہاں بھی یہ دُکراے ناخوش اور دکھی کر رہا ہو، جبکہ فائزر بالکل ناظر اور مطمئن تھا۔

”یعنی وہ امریکہ جا رہی ہے، بیس کے لئے وہاں سیٹل ہونے کے لئے وہ کہتی ہے کہ وہ وہیں پیدا ہوئی، بلکہ بیس اور وہیں تعلیم حاصل کی ہے تو اسے پاکستان میں نہیں دہیں پڑی رہتا ہے۔ اگر کھیلچہ چار سال اس نے پاکستان میں گزار لئے، یہاں پر سیزیشن پڑھ لی تو اس کی مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنی ساری زندگی سیزیشن گزارتا چلتی ہے۔ وہ جا چکی ہے کہ میں شادی کے بعد اس کے ساتھ امریکہ میں سیٹل ہو جاؤں اور وہیں تو جا ہی ہے یا برا۔ میرا پاکستان اور اسے کھردالوں کو چھوڑ کر کسی اور ملک میں سیٹل ہونے کا کبھی بھی ارادہ نہیں تھا۔ چاہے وہ میری جسم بھری امریکہ ہی کیوں نہ ہو۔ سو میں اس کے ساتھ امریکہ میں سیٹل ہونے سے انکار کر دیا۔ بس اس بات پر غماز کبیر وائز نے دوسرا فیصلیٰ تو نہیں الیٹن ان فیصلیٰ ہماری عقلی فوٹ ٹی۔

”افغنیلی جب کہلائے گی جب وہ امریکہ فلاحی کر جائے گی۔ ابھی تو میں کسی ایسے فلم کے دکھایا رہے ہیرو کی طرح سیٹ سائنگر سنتا اس انتقاد میں ہوں کہ شاید وہ لاسٹ مومنٹس، میں ایسا فیصلہ بدل دے اور یہیں رک جائے۔“ بچکے

پچھلے موزوں میں مسکراتے ہوئے قافز نے ایک ایسی بات ان سب کو بتائی جسے سن کر ہمارے ساتھ ساتھ اگلے اور کلثوم بھی ہکا بکا رہ گئے۔ وہ زرارہ اعلیم سے بے تحاشہ محبت کرتا تھا۔

اور اس کی محبت گاڑی میں موجود کسی بھی فرد سے بچھی ہوئی نہیں تھی۔ سب ایسی شاک کی کیفیت میں آئے تھے کہ قارم اؤس تک پہنچے کہ سب اہل خاموش اور کم مہم سے بچھے رہے۔ فائز و زارہ کی ایک دوسرے سے والہانہ محبت، بھراس محبت کے نتیجے میں دورانِ تعلیم ہی ہو جانے والی ان کی فکری جراتیں برسوں تک قائم رہنے کے بعد بھی اس وقت ٹوٹ گئی جب ان کی شادی کی تیاریاں مکمل کے آخری مراحل میں تھیں۔

”تم تو ایسے چپ ہو گئی ہو، جیسے میں نے جہیں کسی کے مرنے کی خبر سنائی ہے۔“ وہ وہاں آنے کے بعد بھی بالکل خاموش تھی جبکہ باقی سب نے اپنے موڈز ٹھیک کر لئے تھے۔

”فائز! تم اسے روک کیوں نہیں رہے؟ اتنی سی بات پر اتنا بڑا فیصلہ؟“

وہ درختوں کے سامنے ایک طرف تھا اور خاموش کھڑی تھی۔ فائز بھی اس کے پاس وہیں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔
 ”جنہیں جانا ہوتا ہے وہ وہاں سے رک جاتے ہیں ماہا؟“ اس کا سوالیہ انداز ایسا عجیبے کہنا جانتا ہو۔
 ”قویہ بات مت کہو۔ تم سب اچھی طرح جانتی ہو کہ روکنے والے روکنے سے رکے نہیں۔ کیا تم روک پائی تھیں
 اسے؟ نہیں؟؟ میں بھی نہیں روک پارہ۔“

”فائز۔“ وہ دکھ بھری نگاہوں سے اپنے دوست کو دیکھ رہی تھی جس کی آنکھوں میں غمزدہ مسکراہٹ کے پیچھے بھی اسے صاف دکھ رہا تھا۔

”اے لنگا سے مجھے اس سے کبھی محبت تھی ہی نہیں۔ اگر میں اس سے محبت کرتا تو آج ہی بات کا ٹیٹو نہ جاتا۔ اس کے ساتھ جانے سے انکار دیتا۔ محبت میں شراکتیں رکھی جاتی ہیں، مگر اس نے رکھیں۔ اگر میرے ساتھ چلوے تو تم سے شادی کروں گی درد نہیں۔ میں اسے غلط سمجھنے کے باوجود اس کی بے جا مدد مان جاتا۔ صرف اس کی محبت کی خاطر اس کے ساتھ امریکہ سیٹل ہونے کے لئے تیار ہو جاتا۔ مگر میں اپنے باپا کا ٹکڑا چٹا ہوں، میرے علاوہ ان کے اور بچے نہیں، جو ان کا بزنس سنبھال سکیں۔

میرے کما، کیا کوپری ضرورت ہے اور میں انہیں چھوڑ کر کہیں اور جا سوں؟ نہیں! ماہ! میں ایسا نہیں کر سکتا۔
حالانکہ پایا کہتے ہیں وہ بیسیج کر لیں گے، میں زارہ کے ساتھ جاؤں۔ شادی کے بعد اس کے کھیل بوسٹل وہ بھی کوئی بات ہمارے دور مان کبھی نہیں ہوتی تھی اس نے اپنی بے خواہش میرے سامنے رکھی اور میرے انکار پر اپنی اس خواہش کو اپنی طرف اور اپنا منہ جھپایا اور تو نہیں کہ میں اس کی فیملی سے دور رہنے کو کہہ رہا ہوں، اس کے والدین بھی یہیں کر رہے ہیں میں اور نہ ہی ہماری معافی ایسی کی شرط کے ساتھ ہوتی تھی جو یہ کہا جائے کہ میں اسے وعدے سے سحر کر رہا ہوں۔

اس نے کچھ لکے لکے کا نام دیا ہے کہ گمشدہ جانے کی حامی بھرنوں تو وہ کر جائے گی اور ہجرا ایک مبینہ شادی کر کے اور حیدر پندرہ روز درکارچی میں قیام کر کے ہم دونوں ساتھ امریکا چلے جائیں گے۔ اور اگر نہیں تو کل دو سبکی یہاں سے چل جائے گی۔“ وہ اب بہت تنگید کی اسے اساری بات بتا رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ کا پردہ بنا دیا تھا اسے فائز نے چہرے پر دکھا کر اب واضح دکھائی دے رہے تھے۔

”اس نے مجھے بتایا ہے کہ اسے مجھ سے پہلے بھی کافی شکایتیں تھیں مگر چونکہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس لئے قصد انہیں نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ اس کے بچے کو مجھ بھرے ساری بات بتاتا چلا گیا تھا۔“

”مجھے تمہیں یہ بات بتاتے دو! یہ بھی افسوس فیل نہیں ہوا، مگر میری سہیلی میں شادی سے ایک مہینے پہلے مجھے چھوڑ کر چلی جانے والی ہے۔ اس لئے کہ میں جا ہوتا ہوں، یہ تمہارے لئے کوئی بھلا سے دار نہیں بلکہ دل کو دکھانے والی ایک خبر ہے۔“

وہ اسے اس کی کس کو بتا رہی اور کس غلطی کا احساس دلاتا چاہا اور بقا، وہ جانتی تھی اور بے ساختہ ہی عمامت سے اس کی آنکھیں جھک گئی تھیں۔ اس بات کے بعد بھر پور ہنگامے دوران کی وقت بھی ذرا غم کا دور نہیں ہوا تھا۔ لچ کے بعد سب نے اسے نکلتے، گاؤں زور پھول دے کر جہان کو رہا تھا۔ کلثوم نے فائز نے، دائی، انکل نے، بیبا بھائی نے، غزل نے سب کے گنگنوں سے تار بے تار ہے تھے کہ بڑی سوچ بچار اور دھڑ دھڑ کے بعد خریدے گئے ہیں کہ ان میں برج چڑھو لیڈر اس کی پسند کی تھی۔

اتنا بے تحاشا چارادار غلوں اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لے آیا تھا اور ساتھ ہی اس کے دل کو ندامت سے بھی دوچار کر گیا تھا۔ اپنی تمہیں اس کے کردہ ہیں اور وہ پھر بھی ہمارے ہیں کا مظاہرہ کرتی ہے۔ رات کی تہائیاں میں چپکے چپکے یہ سوچ کر آنسو بہاتی ہے کہ اس کا کوئی گھر نہیں، اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ یہ سب لوگ، یہ سب اس کے اپنے ہی تو ہیں۔ کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا ان سب کے ساتھ غلوں اور محبت کا رشتہ ہے۔

☆☆☆

وقت کا کام گزرتا ہے، سو وہ گزر رہا تھا۔ بڑی سبک رفتاری سے ساتھ ہاں گھر سبک رفتاری سے گزرتا یہ وقت بے مقصد اور بے مصرف نہیں گزرا تھا۔ وہ اس کے دامن میں بہت سی کامیابیاں اور کامیائیاں بھی ڈال کر گیا تھا۔ ایک لڑکی ہونے کی وجہ سے اسے بہت سی جھگڑوں پر مشغول تھا سا سامان بھی کرنا پڑا تھا۔ اگر اس کی ترقی پر خوش ہونے والے بہت تھے تو حد کرنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔

وہ اب اپنی گاڑی رکھتی تھی اور اسے خود رانڈیڈر کر رہی تھی۔ ہاں گھر اس کا بھی مٹی دھبی ایک گھر تھا۔ کسی ایسے سے علاقے کے ایسے سے باشندے میں رہتا وہ بڑی آسانی سے انفر کسٹنٹی میں گھر اس کی تہائی، اس کی عمر اور اس کی خوبصورتی یہ سب اسے ایسا کرنے نہیں دیتی تھیں۔ کلثوم کے بیٹے میں ایک کمرے کے کمر میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہتا چاہے اس کی پوسٹ کے مطابق نہیں تھا مگر اس ایک کمرے کے مکان میں وہ محفوظ تو تھی۔ باہر قدم قدم پر بھیڑے تھے اور وہ تہا۔ اس کا تحفظ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے خود اپنی عزت اور اہمیت کی حفاظت کرنی تھی۔

☆☆☆

ہاں امتیاز کی بیٹی کی شادی تھی۔ اپنے آہن کے ایک معمولی سے چڑا ہی کی بیٹی کی شادی میں جانے کی کس کے پاس فرصت تھی۔ کسی سینئر انگریز، کسی ڈائریکٹر CEO کی بیٹی کی شادی ہوتی تو ساری مصروفیات بل پر بھی غائب ہو جاتیں۔

مجھے سے زیادہ سب کی شرکت ہاں صاحب کے لئے اہمیت رکھتی تھی مگر وہ اپنے کلبز کو چلنے کے لئے مجبور تو

نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی گاڑی کی موجودگی کے باوجود وہ شادی میں رات کے وقت آکھینے جانے، آنے کا ریسک تو بہر نہیں لے سکتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ انکل یا دائی میں سے کسی سے اپنے ساتھ ملھ کاٹے۔ مگر اس کے ان سے بات کرنے سے پہلے ہی فائز کا اس کے پاس ہون آ گیا۔ وہ شادی میں جا رہا تھا اور اس سے یہی پوچھ رہا تھا کہ گھر اس کا جانے کا ارادہ ہے تو وہ اسے اپنے ساتھ لے جائے۔

فائز کے فون نے اس کا مسئلہ کیا تو وہ جلدی جلدی جانے کی تیاری کرنے لگی۔ فائز کو ان کی سہیلی کو چھوڑے اور اپنے پیپے کے آفس کو جوائن کئے کی طویل عرصہ ہو گیا تھا مگر حقیر خیال اس نے ان تمام عرصہ میں ہاں صاحب کے ساتھ راپڈر رکھا تھا اب ہی تو وہ اسے انوائسٹ کر نہیں بھولے تھے۔

فائز عید کا کتنا خوبصورت ہے۔ اسے زارا کی بد قسمتی پر سے سڑے سے افسوس ہوا۔

وہ دونوں شادی میں پہنچے تو حسب توقع ہاں صاحب کا چہرہ انکس وکھ کر کل اٹھا۔ انہوں نے ان دونوں کا والہانہ استقبال کیا۔ وہ ان کے آنے پر بے پناہ خوش تھے اور ان کا بس نہیں مل رہا تھا کہ انہیں کہاں نکالیں اور کس طرح ان کی خاطر کریں۔ فائز نے ان کی پوچھا کہ تم کرنے کی کوشش کی اور ان سے یہ کہا کہ جہاں باقی سب مہمانوں کو بٹھانے کا انتظام کیا گیا ہے، یہ دونوں بھی وہیں بیٹھیں گے۔

ان دونوں کے بہت شہت سے منع کرنے کے باوجود بھی ہاں صاحب نے کھانے کے وقت ان دونوں کے لئے اپنے کمرے کے ڈرائنگ روم میں کھانا نکالوا دیا تھا۔ کسی امتیازی سلوک کو پسند نہ کرنے کے باوجود وہ دونوں ان کے اصرار کو رد کر کے ان کا دل توڑ نہیں سکے تھے۔ کھانا بہت سادہ سا تھا۔ ایک معمولی سا چڑا ہی اسے اپنی محنت کی جائز کمائی میں سات بیٹیوں اور دو بیٹوں کو تعلیم بھی دلوانی ہو اور پھر ان کی شادی بھی کرنی ہوں، بیٹی کی اس سے بہتر شادی نہیں کر سکتا تھا۔

بظاہر غیر عجیبہ اور لا بے داسا نظر آنے والا یہ انسان اندر سے کتنا حساس تھا۔ دوسروں کے احساسات کی اسے کس قدر پرور دیتی تھی۔ وہ فائز کے اظہار کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ واپسی میں وہ دونوں یوں بہت خوش تھے کہ آج انہوں نے اپنی مصروفیات میں سے چند گھنٹے نکال کر ایک انسان کو خوشی دی تھی۔

”فائز! تمہیں بتا ہے کہ اللہ نے تمہیں بہت پیارا دل دیا ہے۔ محبت اور غلوں سے بھرا ہوا۔“ گاڑی میں روڈ پر ڈالنا فائز اس تعریف پر جیسے پریشان۔

”تمہیں یہ بات آج بتا چلی ہے؟“

”نہیں، پہلے سے پتا ہے۔ تم سے آج کہہ رہی ہوں۔“

”پیارا سا محبت اور غلوں سے بھرا دل تو اللہ نے تمہیں بھی دیا ہے۔ ہم ایک جیسے ہیں جب ہی تو ہم دوست ہیں۔ وہ کیا کہا جاتا ہے کہ انسان جیسا خود ہوتا ہے ویسے ہی اس کے دوست ہوتے ہیں۔“ وہ فائز کی جوابی تعریف پر جو کہ کافی شہید کی کی گئی تھی، بے ساختہ سرکائی۔

”ویسے ماہا! جو تمہیں میری خوبی نظر آ رہی ہے، وہی کسی کو میری سب سے بڑی خرابی نظر آتی تھی۔“

”میں زارا تعلیم کو اس دنیا کی سب سے بڑی نصیب ٹوکی سمجھتی ہوں۔ اسے تم جیسے ایسے انسان کا زندگی بھر کا

ماحول رہا تھا اور وہ۔۔۔ وہ بولے بولے ایک دم ہی خاموش ہوئی۔

”جیسے تم زارا کو بد نصیب کہہ رہی ہو۔ ایسے ہی میں میرے رضا کو کہتا ہوں۔ ہم دونوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کا ساشی بنانے کے لیے غلط انسانوں کا انتخاب کیا تھا۔“ فائز نے عجیبہ طرح سے تھمرہ کیا اور اس نام کو سن کر ایک ہل میں ہی اس کا خوشگوار مسرود رخصت ہو گیا۔ وہ بات کہنے کا فائدہ کب دے رہی تھی۔

”ہاں تمہیں نہیں لگتا، ہم دونوں نے غلط لوگوں کو چنا۔ وہ دو لوگ ہمارے لئے درست انتخاب نہیں تھے جس سے ہم دونوں نے بہت محبت کی، جس سے ہم دونوں نے بہت سی امیدیں وابستہ کیں۔ میری ہم سفر ماہا اصل میں کوئی نازک اور حساس سادہ دیکھنے والی لڑکی ہونی چاہئے تھی اور تمہارا فائدہ میرا جیسا کہ۔۔۔“

”فائز! یہ کیا ہے لڑکی کا تاش شروع کر دی تم نے۔ چلو اور بات چک پر بات کرتے ہیں۔“ اس نے بے ساختہ ہنسنے لگا کہ اس کی بات کا ردی تھی۔ وہ چاہے نہیں گفتگو کو کس طرف لے جانے کا تھا۔

”کسی اور بات چک پر نہیں۔ میں آج تم سے اسی بات چک پر بات کرنا چاہتا ہوں اور میں بہت باتوں سے تم سے اس موضوع پر بات کرنا چاہ رہا ہوں۔ بس صرف یہ سوچ کر ہی پٹان تھا کہ بات کس طرح کروں۔ تمہاری ناراضی سے ڈر بھی تو لگتا ہے۔“

مناسب رفتار سے گاڑی ڈرائیو کرتے وہ ایک ٹھنڈے پر ڈال کر بولا۔

”جس کی زندگیوں میں اب ہماری کوئی اہمیت نہیں، جو میں بھلا کر اپنی اپنی دنیاؤں میں گمن ہیں، ہم کب تک ان کے چلے جانے کا سوگ مناتے رہیں گے؟ مجھے تعجب ہوتا ہے تم اتنے سالوں میں اس سوگ اور جھگ سے گھبراہٹیں نہیں۔ میں تو دو سالوں میں ہی اسکا کیا ہوں۔ ملکاب سوچوں تو یہ سوچ کر خود پر غصہ آتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے دو جتنی سال اس کے لئے نکوادے ہیں جس کے لئے میں کوئی اہمیت رکھتا ہی نہیں۔ جسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ فائز عید پچھلے پورے دو سالوں سے تمہارا خاموش زندگی گزار رہا ہے۔ زارا کو امریکہ گئے دو سال ہو گئے، وہ دوبارہ خوش باش۔ مگر اپنی شادی شدہ زندگی گزار رہی ہے اور میں یہاں تک کام جانتوں کی طرح اس کی یاد میں آجیں بھر رہا ہوں؟ میری زندگی اتنی فائز اور اس کے بعد تو نہیں کہ میں ایک بے بسی لڑکی کے پیچھے اسے برباد کروں۔“

وہ کچھ دھیسے سے یوں بولا جیسے اپنی زندگی کے دو سال سناٹے ہو جانے پر خود سے برہم ہو۔

”تم شادی کر لو فائز! دنیا میں ابھی لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔“ وہ تھکدافیر معمولی جھپکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی، اس جھپکی میں یہ عجیب سی جھلک تھی کہ اس کی چند لمبے کی اوردی بات اسے پسند نہیں آتی ہے۔

”تمہارے سنور سے سے پہلے ہی میں شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں اور میرے ارد گرد موجود لڑکیوں میں ابھی لڑکی صرف ایک ہی ہے اور وہ تم ہو ماہا۔“

اپنی بات مکمل کر کے وہ اب براہ راست اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دیکھنے سے اس کے ذہن میں کب اتنی تھی اور کیوں؟ ان کے درمیان ایسا رشتہ تو بھی نہیں رہا تھا۔

”تم کب تک اس کم ظرف اور گھٹیا شخص کے پیچھے اپنی زندگی برباد کر دو گی ماہا؟ ایسی تمہارا اور اس زندگی؟ زندگی کی سب خوشیوں پر تمہارا پورا حق ہے۔ کیا تمہیں ابھی بھی اس کا انتظار ہے؟“

”نہ مجھے اس کا انتظار ہے اور نہ میری زندگی میں اس کے لئے کوئی جگہ ہے میں اس سے شدید نفرت کرتی ہوں۔ میں اپنی زندگی سے خوش ہوں۔ میں اپنی زندگی میں اب کسی بھی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں چاہتی۔ تم بہت اچھے ہو فائز! تمہارا نصیب یہ نہیں کہ تم اپنی شادی شدہ لڑکی سے شادی کرو۔ تمہیں تو کوئی بہت چار ی بھتیوں سے بھر پور لڑکی ملنی چاہئے۔ چاہے وہ شخص اس قابل تھا یا نہیں مگر میں نے اس سے محبت کی تھی، اپنے دل کی تمام تر چاہیوں کے ساتھ، اب میں کسی دوسرے شخص کو کیا دے سکتی ہوں؟

اس نے بھی جواب دیا تھا گاڑی ان گھٹوں میں دیکھتے ہوئے عجیبہ اور دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”محبت تو میں کبھی کر چکا ہوں زارا کے ساتھ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اب میں اس محبت کی یاد میں اپنی زندگی گزار دوں؟ ماہا! جیسا تمہیں لگتا ہے ایسا ہی میں بھی محسوس کرتا ہوں، یہی کہ اب میں کسی سے محبت نہیں کر سکتا مگر میں ایک نئی زندگی کی شروعات تو کر سکتا ہوں، اس کے ساتھ جسے میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں، جو میری دوست ہے، جو باہل میرے جیسی ہے۔ ہمارا دکھا ایک جیسا ہے ماہا! ہم ایک دوسرے کو دھوکہ دے بغیر، جھوٹ بولے بغیر ایک نئی زندگی کا آغاز اس امید پر کر سکتے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ جب ہمارے دلم بھرتے جائیں گے تو ہماری دوستی محبت میں خود بخود بدل جائے گی۔“ وہ اپنے حراج کے برخلاف اختتامے زارہ و عجیبہ تھا۔

”میں تمہاری طرح نہیں سوچتی فائز! مجھے اب شادی کے نام سے بھی نفرت ہے۔ میں تمہارے، غلام کی قدر کرتی ہوں مگر تم سوسوی جوم چاہے ہو، وہ میرے لئے بالکل ناگن ہے۔“ اس کا انکار وہ ٹوک اور قطعیت بھرا تھا، فائز یک لخت ہی خاموش ہو گیا تھا۔ باقی کاروائی ان دونوں نے خاموشی سے کیا تھا۔ فائز نے گاڑی کو گھر کے گیٹ کے سامنے لارو کر دی تو وہ دروازہ کھلی کر فوراً گاڑی سے اتر گئی۔

”فائز! تم میرے انکار کا برا مت مانا کیلینز۔“ وہ دروازہ کھلی بند کر کے وہ مکڑی کی جھک کر اس سے بولی۔

”بھئی تمہارے انکار کا برا نہیں ماہا ہے، ہاں مگر میں نے اسے قبول نہیں کیا ہے۔ اسنے بے فیصلے لئے مجھ میں نہیں ہوتے ماہا! میں جب زارا تسلیم نہیں کر چکی تو عرض لڑکی کے لئے اپنی زندگی کے دو سالوں کو نکالنا ہوتا تو جسے میں بہت اچھا سمجھتا ہوں اور واقعی بہت اچھی ہے، اس کا جواب بدلنے کا انتظار نہیں کر سکتا؟ ماہا! تم اس بات پر دوبارہ سوچنا ہر مرد تو عرض اور کم ظرف نہیں ہوتا۔ ہر مرد دبیر رضا نہیں ہوتا۔“ اسے جواب میں کہنے کا موقع ملے بغیر وہ گاڑی اشارت کر کے ایک دم ہی وہاں سے چلا گیا تھا اور وہ جیسے تھکے تھکے دم سے چلتی اندر آ گئی تھی۔

اس نے سوچا کہ دوبارہ فائز سے اس موضوع پر بات کرے کی مگر جتنا وہ بات کرنے کے لئے اسے اس موضوع کی طرف لانا چاہتی اتنی ہی وہ بات کو ادر ادر کر کے قال جاتا۔ فائز نے دوبارہ اسے اس موضوع پر آنے نہیں دیا تھا۔ فائز کا اس کے ساتھ دوستانہ اعداد کسی تبدیلی کے بغیر ایسا ہی تھا۔ وہ اس کے ساتھ بالکل پہلے کی طرح تھا اور جیسا کرتا ہوں جیسے آٹھ ماہ پہلے اس نے شادی کا پرچہ لیا تھا۔ اس کے سامنے رکھا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ اپنی روزمرہ، استحال کی اشیاء جس سنور سے پہلے خرید کر تھی ابھی بھی وہیں سے خریدتی تھی۔ حالانکہ اب ڈینس میں اس کا گھر نہیں تھا جو سنور اس کے گھر سے قریب پرانا ہو۔ بس ابھی تک سے خریداری کرنے کی عادت

ہی ہوتی تھی۔ اس لئے کبھی وہ آفس سے واپسی میں اور کبھی چمکی والے دن وہاں آجاتی تھی۔ اپنی ضرورت کی اشیاء اٹھا اٹھا کر وہ تیزی سے اپنی فرامی میں رکھنے جا رہی تھی۔ وہ کارن فیکس کا ڈبا اور دوسری دو تین چیزیں لے کر فرامی میں والے کے لئے سڑکی ہی تھی کہ سامنے سے اندھا دھند بھاگ کر آئی ایک چھوٹی سی بچی اس سے ٹکرائی۔

اماں بچہ کے لئے قصداً تیار نہیں تھی۔ اسی لئے اپنے ہاتھ میں موجود اشیاء کو کوشش کے باوجود سنبھال نہ پائی۔ اگر ایک طرف اس کا سامان گرا تھا تو دوسری طرف وہ بچی بہت زور سے منہ کے مل پٹنے منٹکڑ والے فرش پر گر پڑی تھی۔ ”اوہ بانی گاڈ“ وہ اپنے سامان کو پھوڑ پھوڑا سے ساتھ گھٹنوں کے مل پٹنے بھیجی اور اس بچی کو اٹھایا۔ اس کے نرنے کی آواز اچنی زوردار تھی تو چوٹ بھی کڑی زور سے ہی لگی ہوگی۔

”کہاں چوت لگی ہے بیٹا؟“ وہ گھٹنوں میں ڈیر مارے آسوں لے لہا کو دیکھ رہی تھی اور اماں تیزی سے اس پر نفیس دوڑا یہ دیکھ رہی تھی کہ کہیں خون تو نہیں نکل رہا۔

”اس طرح سے بھانکی تو چوٹ تو لگے گی۔ ویسے بھادو بیچے آتی چوٹ پر دوڑتے تو نہیں۔“ اس کے آسوں صاف کرتے ہوئے اس نے اس کے گال پر پیار کیا۔ بچی نے اس بار خاصی دلچسپی اور توجہ سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ گاٹی ہونٹوں سرخ گالوں اور دونوں گالوں پر خوب گہرے گہرے ڈبیلو رکھنے والی وہ تھی تا شاخ صورت اور صحت مند بچی تھی جو شاید چار یا پانچ سال کی ہوگی۔ اماں کو وہ بہت کیوت لگتی تھی۔ چہرے پر شرات کے ساتھ ڈیر ساری مصیبت لے ہوئے۔ اس نے سرخ ٹکڑ کا کیلیو لیں فراک پہنا ہوا تھا اور بالوں کی سیدھی مانگ ٹھال کر بالکل سامنے کی طرف چھوٹے چھوٹے پیارے سے مہر کپکپ لکھنے لگے ہوئے تھے۔

”یہ اسٹریز کیا اسی ہے؟“ اس نے شرات سے اس کے مہر کپکپ کی طرف اشارہ کیا۔ بچی نے اس کی کم عقلی پر ہنسوں کرنے والے انداز میں زور زور سے لٹی میں سر ہلا دیا۔

”جی نہیں۔“

”چاکلیٹ کھاؤ گی؟“

”جی۔“

”پہلے اپنا نام بتاؤ اور یہ بھی کہ کس اسکول میں پڑھتی ہو پھر چاکلیٹ ملے گی۔“ اسے اس بچی سے باتیں کرنے میں حرا آ رہا تھا۔ ”اماں!“ اس نے اپنی باریک سی آواز میں اسے اپنا نام اور اپنے اسکول کا نام بتا دیا۔ وہ انگریزی بول رہی تھی۔ اسے شاید اردو کو بھی آتی تھی مگر بولتی نہیں۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور پھر اپنی فرامی میں سے دو چاکلیٹ ٹھال کر اس کے ہاتھ میں پکڑائیں جو وہ بھائی کے بیٹے کے لئے ہر بار خرید کر لاتی تھی۔

”اماں! تمہارا نام بھی بہت پیارا ہے اور تم بھی بہت بہت پیاری ہو۔“ اس نے اس کے گالوں کو ہونے سے چھوا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک چاکلیٹ پکڑے بہت خوش کھڑی تھی۔

”ٹھیک یو آئی۔“

”یو آؤ بیکر جیٹا“ وہ اس کے معر ز کے مٹا ہرے پر مسکرائی۔

”ارے یہ کیا کر رہے؟“ ایک ہم ایس ای کی نگاہ بچی کے جھروں کے پاس پڑی سونے کی چین پر پڑی۔ اس کے سینے پر بچی نے بھی فوراً ہی طرف دیکھا۔

”آئی! یہ میری ہے۔“ اماں آتی ہیں میں زمین پر سے جھین اٹھا چکی تھی۔ زمین پر گرے سے جھین میں پڑا لاکھ مکمل کیا تھا اور اس میں لگی دو تصویریں فوراً ہی اس کی نگاہوں کے سامنے آئی تھیں۔

”یہ میرے اماں ہیں۔“ بڑی خوشی کے ساتھ جھکے بغیر یہ سے انداز میں اس نے اماں کو بتایا اور اماں ان تصویروں کو دیکھ کر اپنی خوش مزاجی کو بھر میں بھول چکی تھی۔ اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ عجیبہ اور کرخت چہرے کے ساتھ اس نے اہل حیر رضا کے ہاتھ میں اس کی جھین دے دی۔

”اماں! یہ لے! کہاں چلی گئی تھیں تم؟ میں اب چھپ چھپ ڈھونڈ رہی تھی۔“ وہ فلیپ صورت شاہی اس کی گرفت سے آسٹو جو گھبرائے ہوئے انداز میں وہ بھانکتی ہوئی بچی کے قریب آئی تھی۔ بچی کے مل جانے کے باوجود اس کے چہرے کی ہولکاہوت اور پریشانی غائب نہیں ہو پائی تھی۔

”میں ان آتی ہے باتیں کر رہی تھی۔“ اماں نے بھر اہل حیر رضا کی طرف دیکھا اور نہ اس لالچہ صورت کی طرف۔ وہ فوراً اپنی فرامی کی طرف پوچی اور پھر بغیر خرے تیزی سے اپنی فرامی کا ڈکڑ کی طرف لگی۔ اہل حیر رضا زور سے آواز دے کر اس سے کہہ کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کے پاس آئے وہ یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ مل بپے کر کے وہ تیزی سے اسٹور سے نکل آئی۔

گاڑی ڈرائیج کرتے اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار وہ دو تصویریں آ رہی تھیں اور ساتھ ہی اہل حیر رضا کا من ہوتا اور مصمم چہرہ۔ اسٹیرنگ پر اس کے ہاتھوں کا دباؤ بڑھ رہا تھا اور ایکسپلر پر پاؤں کا۔ اندر سے ہمتی نفرت کی شہید لہرا سے لے گاؤ کر رہی تھی۔ اپنی نامراد اپنی اپنی مردو حیاں اور اپنی خالی گوداں کے کھوں اور اس کی نلرتوں کو بڑھا رہی تھی مگر نفرت کا۔ اس اس خود اپنے آپ پر ہنسے میں بدلے گا۔

اس شخص کی محبت میں اندھی ہو کر اس نے اس کی ایک ناجائز بات کیوں مانی؟ ماں بننے کا اس کا فطری حق جو دنیا کا مذہب معاشرہ اور انسان اس سے نہیں جھین سکتا تھا اس شخص سے چھینے رکھا اور وہ اس کی محبت میں پھنس کر اپنی فطری خواہش کے برخلاف اس کا سن مانا ٹھیل ٹھیل کیے گئی۔ ذراہٹ کر کے اس فیصلے کے خلاف چلی گئی، بڑا وہ سے زیادہ کیا ہوتا۔ وہ اسے چھوڑ دیتا؟ چھوڑ تو اس نے اسے تب ہی دیا تھا جب اس نے اس کی ہر بات مانی تھی۔ آج اسے ماما کہنے والا ایک بچہ وجود تو تھا۔ اگر اس کی اپنی بیٹی ہوتی تو کتنی بڑی ہوتی۔ وہ وہ سال کا حساب لگنے لگے۔ وہ اسکول جاتی ہوتی۔ پھر زندگی میں کرنے کو کتنا کچھ ہوتا تھا۔

”اماں! مجھے پتہ نہیں اور پڑ جاوے۔“

”اماں! مجھے سانس کا اسرا پتہ ملا ہے۔ بائیز میری سیلپ کر دیں۔“

”اماں! میں اسپورٹس ڈس سے چلی چلاؤں؟“

”اماں! میری فریڈ کے پاس اتنا پیارا ڈول ہاؤس ہے آپ مجھے بھی دیا ڈول ہاؤس لاکر دیں ناں۔“ اس نے اپنی برابر والی خالی بیٹ کی طرف دیکھا۔ وہ یہاں بیٹھیں اور پھر آج وہ بھائی کے بچوں سے بھی پہلے اس چاکلیٹ

اور آئیں کریم طواری ہوئی اور وہ اب اس کے برابر اس سینٹ پر اپنا سارا فرائض سامان اپنی گود میں لے رہے خوش اور
گمن بھی می اس سے باتیں کر رہی ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو بڑی خاموشی سے گرے اور اس کے دوپٹے میں
چھپ ہو گئے۔

☆☆☆

ال میر رضا سے ملنا اور ایسا دیکھنا تھا جسے وہ بہت آسانی سے بھول جاتی۔ اپنے سارے دکھ اپنی ساری
عروسیاں اسے سسر سے یاد آتی تھیں، وہ اس واقعہ کو کسی اور سے تو کیا کلام اور فائز تک سے دس نہیں کر سکتی
تھی۔ وہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں بتا پاتی تھی کہ وہ ال میر رضا سے ملی ہے، بالکل اتفاقاً اور اس اتفاق نے اسے
کتنے بہت سارے دنوں تک مضرب کیسے دکھا ہے۔ تجانے وہ اپنے دل کی باتیں اپنے دوستوں سے کسی جھجک کے بغیر
کب کہہ سکے کہ قابل ہو جائے گی؟

☆☆☆

اس واقعہ کو ایک ڈیرہ میہیز گزر چکا تھا جب اس روز صبح وہ اپنے آفس میں بیٹھی کام کر رہی تھی۔ صبح کے
ساتھ نو بج رہے تھے اور وہ اپنے سامنے رکھے چند کاغذات پر دیکھ کر اسے صدمہ لگا۔ اسی وقت اس کی
سکریٹری نے ان کا کام پاس سے رابطہ کیا۔

”سم! کوئی میر رضا صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ اس کی انہیوں نے دیکھا کرتے کرتے جین کو اتنی
جتنی سے دیا کیا اس کی نب ٹوٹ گئی۔ وہ یہاں کیوں آیا ہے؟ وہ اس سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟ اتنے برسوں سے وہ جس
فصل کے نام تک سے نفرت کرتی آ رہی تھی تو اس کی عقل وہ دیکھ کر کہتی ہے؟ بہت مشکل سے اس نے اپنے لمبے
اور اپنے لمبے کی کڑواہٹ کو ایک پریشانی سے تبدیل کر دیا۔ ”میری سکرٹری سے بتائیے کہ ساتھ انتظار کیا۔“
”کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں آپ نے پوچھا نہیں؟“

”سم! وہ کہہ رہے ہیں انہیں آپ سے کچھ پروٹ نومٹ کام ہے۔“ اس کی سکرٹری کی جوابی ناشائستگی سے بولی۔
”ان سے کہیں! ابھی میں بہت ہی ہوں۔ وہ انتظار کریں۔“ اپنا پروٹیشن لپہ پر قرار رکھتے ہوئے اس نے
بات ختم کی۔

”پروٹ نومٹ کا کام؟“ نفرت سے سوچنے اس نے فوریہ لہرایا۔ ہاں ایک پروٹ نومٹ کا معاملہ ان کے
ذریعہ ملے ہوئے نامی باقی تھا۔

Some unfinished business ایک کاغذی کارروائی اس نام نہاد رشتے کو ختم کرنے کے لئے تھیں
الفاظ کی ادائیگی۔ مگر اس کام کے لئے بھی وہ براہ راست اس فصل سے کوئی رابطہ نہیں چاہتی تھی اب وہ وہاں اپنا عمل نہیں
رہی تھی جو اپنے آفس میں صرف اس فصل کی فون پر آواز کریں زار اور طاہرہ پر دی تھی۔ پانچ سال پہلے کی لمبا عملی
اور آج کی لمبا عملی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اسی لئے وہ برسوں سے اعزاز میں اپنا کام نہ لہنا رہی۔ فائز نامی شروع
ہوا تو اس نے ان کا کام پرانی سکرٹری سے کہا۔

”جو صاحب مجھ سے ملے آئے تھے وہ اگر ابھی بھی سوجو ہیں تو انہیں اندر بھیج دیجئے۔“

”نہیں سم۔“ اس نے اپنے سامنے رکھی فائل بند کر دی اور کمرے کا دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ چند سیکنڈز
میں ہی دروازہ کھلا اور اس فصل نے اندر قدم رکھا جسے وہ سسر سے دم تک بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ سراسر اٹھا کر
پڑا تھا قدموں سے چلا اچھائی جیسی اور بہتر ترش فراش والے سیاہ رنگ کے سوٹ میں وہ کسی سینئر یونٹس ایگزیکٹو کی
طرح نظر آ رہا تھا وہ خود سے ملنے کے لئے آئے والے یونٹس ایسوسی ایٹ کی طرف پیشہ ورانہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔
”کیسی ہو ماما؟“ وہ اس کی میز کے سامنے آ کر کھ گیا تھا۔

”آپ مجھ سے کس سلسلے میں ملے آئے ہیں سسر میر رضا؟“ ماما نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری
نہیں سمجھا تھا۔

”یقیناً“ آپ مجھ سے Divorce (طلاق) کی بات کرنے آئے ہیں۔ اگر سبکی بات ہے تو میں سمجھتی ہوں
بہتر یہی رہے گا کہ آپ کا یہ کام اپنے وکیل کے ذریعے کروا دے۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی زندگیوں میں اتنے مصروف ہیں
کہ ہمارے پاس اس طرح کے فضول معاملات میں اچھے کا باگل وقت نہیں۔ آپ اپنے وکیل کے ذریعے مجھے بہتر سمجھا
دیتے۔ It so simple

ماما! تم بلایز اس لکچر میں مجھ سے بات مت کرو جس کی ذمہ داری (طلاق) کے لئے تم سے بات کرنے
نہیں آیا ہوں۔“

وہ اس کی میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے ہوئے آہستہ سے بولا۔
”ایکسیکو یونٹس سسر رضا! میں نے آپ سے بیٹھنے کے لئے ہرگز نہیں کہا۔“ اسے نوکے وقت بھی اس کا لپہ
بوز پر ویشل اور مہذب رہا۔

”میں بہت بڑی ہوں۔ میرا پانچ نام ہے اور اس کے بعد مجھے ایک منگ میں جانا ہے لہذا آپ کو جو کچھ
مجھ کو کہنا ہے وہ مختصر فقرہوں میں جلدی کہہ دیجئے۔“ وہ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے ایک ٹک اس کی سمت دیکھ کر جا رہا
تھا کہ اس منٹ بعد وہ اس کی طرف دیکھ کر دھمکے لکھ میں بولا۔

”ماما! میں، میں جانتا ہوں، میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ میں تم سے فریضہ ہوں۔ میں تمہیں
اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔ جو کچھ ہو اسے ہلا کر ہم بھرے ایک ساتھ اپنی زندگی شروع کر سکتے ہیں ماما!“

”سسر رضا فرسٹ نم فیر First Name Terms تو ہمارے درمیان کب کے ختم ہو چکے۔ میں آپ
کے ساتھ روز بھر جا سکتی لیکن بے بے تکلفی سے ملا کہنا۔ آپ مجھ ہی سمجھتے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔“ وہ
ہولے سے سکرانی۔

”ماما! تم مجھے جو کچھ بھی کہو تمہیں حق ہے کہنے کا۔ میں نے واقعی تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے لیکن میرا
یقین کرو ماما! تم سے دور جا کر میں ایک دن بھی خوش نہیں رہا۔ میری زندگی میں وائٹن آ جاؤ ماما بلایز۔ تمہارے بغیر میری
زندگی بہت اداس ہے بہت دیمان ہے۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بہت غمگین ہو کر آہستہ سے بولا اور وہ جتنا تھکا لاکر
ہوئے بیٹھے کی جیسے میر رضا نے اسے کوئی بہت دلچسپ لطف دیا ہو۔

”آج آپ انہیں اور کا احساس ہو رہے ہیں سسر رضا! جبکہ آپ نے فوت کیا ہو گا کہ میں اپنی باتوں

سے نکل کر آپ کے ساتھ ایک پرچی لکھی ماڈرن اور پکیو دعوت کی طرح لوہیکل دے (مطلق اعزاز) میں بات کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ان جذباتی باتوں میں کچھ نہیں رکھا سسر رضا! آپ جو کہنے آئے ہیں وہ کئیے۔ شفا مہر کے بارے میں۔ اب دیکھیے آپ تو مجھے خیرات کے طور پر فرخبر بخش گئے تھے۔ سڑکیا کروں۔ آپ کی کبھی پیسے کی بھی مقرر نہیں رہی تو یہ احسان کیسے قبول کرتی تھی۔ میں نے سارا فرخبر پچاس ہزار میں اپنے خیرات فرخت کیا تھا۔

حساب کچھ ہی بنتا ہے سسر رضا کے پچاس ہزار میں سے آٹھ ہزار میں اپنے خیرات کے فرخبر کے نکال لوں تو چالیس ہزار آپ کے میرے حصے میں آئے۔ یعنی میرے مہر کے ایک لاکھ دو ہزار میں سے چالیس ہزار نکال چکے کے بعد اب آپ مجھے مہر کے اضافہ ہزار چار دے دیں گے۔ اس کی سکرٹری استہرام اور مٹر ہے اور کات دار تھا۔

"ماہا! میرا ساتھ اس طرح کی ہیومت کرو۔ میں بچہ دل اور پورے غلطی کے ساتھ تمہارے پاس واپس آیا ہوں بلکہ برائی سب باتوں کو بھلا کر مجھے ایک موقع اور دوں۔ میں اپنی سب غلطیوں کا ازالہ کروں گا۔" وہ ایک بار مہر بہت زور سے کلکلا کر بٹ پڑی۔

"آپ کو ایک جائیز سسر رضا! جائیز ندامت ماننے کا یہ دل جذبات اور غلطی ناپ کے الفاظ آپ کو بالکل نہیں نہیں کر رہے ان جگہ آپ کے منہ سے نکلے کے بعد یہ الفاظ بہت کڑے اور بدصوت لگ رہے ہیں۔" وہ اس پر سے نظریں ہٹا کر ان پتیل پر کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔

"اپنی دوسے میں چلتی ہوں۔ آپ کے پاس کرنے کے لئے کوئی خاص بات تو ہے نہیں اور مجھے میننگ میں جانے کے لئے دیوہوری ہے" وہ اپنا سواکل اور دن گلاسز پر سے اٹھاتے ہوئے کرسی پر سے کھڑی ہو گئی پھر اپنا پرس کندھے سے ڈالنے ہوئے اکی پر دستکش سے اعزاز میں بولی۔

"آپ نے بات کرتی ہو تو جائیز اپنے دیکل کے ذریعے مجھ سے رابطہ کیجئے گا۔"

☆☆☆

وہ کمرے سے نکل کر جا چکی تھی اور وہ یہی سے آئے جاتا دیکھتا رہا تھا۔

"آج سولہ فروری ہے۔ بات میں نہیں بھولا اور تم بھول گئیں؟ جہیں کیا گتے ہیں سولہ فروری کے دن تم سے طلاق کی بات کرتے آیا ہوں؟" اس نے کرسی کی پشت سے اپنا سر لٹکا کر بہت کب سے آنکھیں بند کر لی تھیں جب وہ ساتھ تھی تو یہ دن بھی یاد نہیں رہتا تھا اور جب وہ ساتھ نہ رہی تو یہ دن بے سارا خود اپنے آپ کو یاد کر دیا کرتا تھا۔ شاید اس لئے کہ اب وہ یاد دلانے والی ساتھ نہیں رہی تھی۔

"تم جیسا کہ ساتھ اسی طرح اپنی شادی کی کچھ سوئیں چلا سوئیں بلکہ چچا سوئیں ساگرہ بھی مٹانا چاہتی ہوں۔ یو جی تم بھول جاؤ اور یو جی میں تمہیں یاد لاؤں۔" میں اب یہ دن بھی نہیں بھولتا تھا۔ یاد دلانے بغیر میں اس دن کو یاد رکھتا ہوں۔ تم چنانچہ تیس سال بھر میں یہ ایک دن مٹا دینا کہ سب کاموں سے بے نیاز ہو کر نصیحتیں کا اظہار کرتے نہ کیا۔ میں چاہتا ہوں۔ ہم اپنی زندگی کا آنے والا ہر دن اور ہر لمحہ ایک دوسرے کے ہونے کو محفوظ سے ساتھ نہ کیا۔"

پرتق وادی کی اتنی دور اس قدر رانیش لگ رہی تھی۔ اس کے لیے ان پتیل اور آنکھوں میں غرت تھی۔ جن آنکھوں

میں اپنے سے ملتا جلتا اور ادا پناہ پناہ دیکھتی تھی! آج ان میں جھانکتی غرت اسے اندر تک ہلا گئی تھی۔

☆☆☆

"مجھ سے ناراض ہو کر سولے تو مجھیں خیرات دے جائے گی۔"

یہ اس کی امریکہ میں پہلی بار تھی اور آفاق جمال شاندار پیٹ ہاؤس جو انہوں نے شادی کے بعد اسے اور سدرہ کو رہنے کے لئے دیا تھا اور اس پیٹ ہاؤس کے اس پر قبضہ اور قبضی ساز دوسرا مان سے آراستہ کمرے میں وہ نرم اور آرام دہ بیڈ پر لیٹا تھا جب دھکے سروس میں کسی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ وہ سولہ ماہ انہیں تھا، صرف آنکھیں بند کر ہوئی تھیں۔ وہ اصل سے خیرات انہیں رہی تھی شاید جگہ کی تبدیلی کی وجہ سے اس نے فوراً اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے مہار میں موجود جویریہ پر نظر ڈالی۔ اس کے پیلو میں وہ لڑکی سوری تھی ہے بہت خوشی سے یہ حق اس نے خود دیا تھا۔ یہ سوری سدرہ پر اس نے اپنی دلچسپی بنادیں اور پھر آہستہ آہستہ اس کی شکل بدلے گی۔ اس چہرے میں اب ایک دوسری شکل نظر آنے لگی تھی۔ بے ساختہ اس نے اس کے گرد ہاتھ رکھ کر اسے خود سے قریب کیا۔ رات کے اس اندھیرے میں کسی کو کیا پتہ کہ وہ اپنی سولی کو ہی نہیں کسی کے دیکھ رہا ہے۔ احساسات اور جذبات کو ذرا مہار بھی اہمیت دینے والے شخص نے خود کو اطمینان دلایا۔

"ہاں دو سالوں اور سات مہینوں کا ساتھ ہے۔ اس سارے عرصہ کی تمام راتیں اس نے اس لڑکی کے ساتھ بتائی ہیں ابھی اسے زندگی سے نکلے عرصہ کتنا ہوا ہے؟ فقط اڑھائی مہینے اڑھائی سالوں کے ساتھ کو بھلانے کے لئے اڑھائی مہینے تو بہت کم ہیں۔ نفی بات ہے۔ شروع شروع میں وہ بھی دیکھی آئے کی بہت سی باتوں کے ساتھ اس کا خیال بھی آئے گا پھر وقت کے ساتھ وہ ماضی کی وہ یادیں جانے کی جیسے یاد کرنے کا اسے کبھی دھیان بھی نہیں آئے گا۔ سدرہ کے سیاہ رخسار پر اسے ایک دم ہی براؤن اور نکلی گئے گئے تھے۔ اس نے اس کے بالوں پر اسے لپ رکھ دیکھے اور اس کے بالوں میں سے آئی ایک پیاری سی سوٹھی مائوس خوشبو کچھ حیرت کے ساتھ اپنے قریب مہرنا محسوس کرنے لگے۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ سدرہ وہی پیسیہ استعمال کرتی تھی جو وہ استعمال کرتی تھی۔ اب آج جب وہ ہاتھ روم میں نہانے کے لیے اپنی رات کی کینیکٹ کو پوری طرح بھول گیا تھا اس لیے اس نے پہلی مرتبہ سدرہ کے شپو اور کنڈیشنر کو دھیان سے دیکھا۔ وہ وہ نہیں دیکھتا تھا۔ لیکن کیا پتا اس کی خوشبو بھی اس شپو بھی سی ہی تھی۔

وہ ہاتھ روم میں کھڑا ایک پکچر کا اور اہتمام نہ حرکت کر رہا تھا گردنوں اسے یہ سب کرتا دیکھنے والا کون تھا؟ اس نے شپو کی بول افکار اس کا دھکن کھولا۔ وہ ایک بالکل ہی مختلف خوشبو۔ اپنی اوقات پر خود کو سرکش کرتا تھا وہ روم سے نکل آیا تھا۔ امریکہ میں اس کی شاندار زندگی کا آغاز تھا۔ وہ سدرہ کے ساتھ بہت خوش تھا اس کے توسط سے تو یہ پیٹ ہاؤس پر قبضہ زندگی یہ اپنے طبقے کی رمانی سب کچھ تھا۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا اس نے کہ وہ اس طبقے ترین ملائے میں ایک پیٹ ہاؤس میں رہ سکے گا؟

☆☆☆

اس صبح اس نے مجھے یہ کچھ دیکھ کر بھیجی۔ ہاتھ روم میں شیشہ جاتے اس نے دروازہ سے اندر لگا لی۔ "ماہا! میری بلٹیوٹ اور گرسے پیٹ نکال دیتا۔" کہتے ہوئے اسے خود احساس نہیں ہوا کہ اس نے ایک

غلط نام لے رہا ہے۔ وہ جلدی جلدی تھا کہ باہر نکلا اس یقین کے ساتھ کہ اسے اپنے کپڑے تیار رکھے ہیں گے مگر وہاں پر ایسا کچھ نہیں تھا۔ جھنجھلائے ہوئے انداز میں مذہبی منہ میں کچھ بڑا تادہ کر کے نکلا تو ڈانگ روم میں ٹھیل کے آئے جنہی سدرہ نظر آئی۔ یونیورسٹی جانے کے لئے مکمل تیار وہ نڈرہجہ دیکھ رہی تھی۔ پاکستان سے ان دونوں کے ساتھ آنا جیال نے اپنی ایک پرانی ملازمہ بھی بیچ دی تھی اور اس وقت وہی ملازمہ ناشتے کے لوازمات میز پر رکھ رہی تھی۔

”تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے میرا“ اس نے اخبار سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔

”ہاں ہو رہا ہوں۔“ وہ کھوئے کھوئے سے بچے میں بولا۔

”جلدی کرو۔ ورنہ دیر ہو جائے گی۔“ وہ اپنی پلیٹ میں آلیٹ ڈالے لگی۔ وہ اسی کھوئے کھوئے سے انداز میں واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ کچھ دیر وہ عجیب سی کیفیت کا نظارہ دیکھا مگر پھر جلدی جلدی تیار ہونے سے اس وقت کیفیت سے نکل کر ایک مرتبہ پھر اس زندگی کو انجائے کرنے لگا جس کے اس نے ہمیشہ خواب دیکھے تھے۔

☆☆☆

”مالا میری بلیک ڈائی نہیں رہی۔“ بہت جھنجھلائے ہوئے لہجے میں وہ زور سے بولا۔ وہ الماری کے سامنے کھڑا ہر طرف ہاتھ مار رہا تھا۔ سدرہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی میک اپ کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے یہ جملہ نکلنے کی دھمکی، اس نے ہاتھ میں پکڑا اور اس کا رخا کر بہت فٹ سے ڈریسنگ ٹیبل پر پھینکا۔ وہ اس صحنے پر بے ساختہ ہی کھو ہوا اور اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے فوراً یہ احساس ہوا کہ ابھی اس کے منہ سے ایک غلط نام نکل گیا تھا۔

وہ فوراً سدرہ کے قریب آگیا اور اس سے روانی میں منہ سے نکلے اس نام کے لئے معذرت کی۔ وہ اس وقت سدرہ کے ساتھ ایک بہت اہم ذہن میں جا رہا تھا۔ کافی دیر کی منت ساجت کے بعد نہیں جا کر سدرہ کا سوا ٹھیک ہوا مگر یہ صرف اس ایک روز کی بات نہیں تھی۔ ہر روز دن بھر میں بجائے سنتی بار۔

”مالا میرے جو تھے۔“

”مالا میری شرٹ۔“

”مالا میری ٹائی۔“

”مالا میری فائل۔“

”مالا میری شیڈنگ کریم ختم ہو گئی۔“ اب اس کی شیڈنگ کریم، آفزشیڈ، شیمپو، صابن، ٹوٹھ بیٹ ختم ہوتے تو جب تک وہ وہاں دوسرے لاکر نہیں رکھ دیتا۔ وہ خالی نوڈ پر اوپر خالی ہی رہتیں۔ پہلے تو جیسے جادو کے زور سے خالی ہونے کے بعد وہ خود بخود ایک بیچانی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگتی۔

”آج تم دیر تک جاگ کر کوئی کام نہیں کرنے والے ہو۔ یہ کام بھی ختم نہیں ہوگا۔ ہاں اس کے پتھر میں تمہاری صحت ضرور خراب ہو جائے گی۔“ اس کے چھوٹے چھوٹے کام کب ہو جایا کرتے تھے، کبھی پانی نہیں پینا تھا ہاں اب جب وہ سب خود کر کے پڑے تھے تو پانی ہل رہا تھا کہ نہیں کیا کرنا تھا۔ ایک تھکا دینے والا مصروف دن گزارا گزرا۔ رات میں بہت تھکا ہارا اور غم حال، بہت دیر سے گھر لوٹا اور بستر پر پاؤں لٹکا کر جوتوں سمیت یہ لیٹ جاتا تو دو نرم دلام تھانہ ان جوتوں اور مونڈوں کو اتارنے آگے نہیں بڑھتے، اس کے جیروں کو پکے پکے سے دبا کر اس کی

تھکن کو اتارنے کی کوشش نہ کرتے۔ اب صبح اسے اپنی ٹائی کی ٹاٹ بندھی تھی اور نہ دیر ہو جانے پر کوئی اس کے پیچھے بھاگ بھاگ کر اسے اپنے ہاتھوں سے ناشتہ کروانا تھا اور نہ کمرے سے نکلنے وقت کوئی اسے گاڑی اختیار سے چلانے کی تاکید کرتا تھا۔

”تم مجھ پر کیا مہتر پڑھ کر پھونکی ہو؟“ وہ آفس یا کینس بھی جانے کے لئے نکل رہا ہوتا وہ اس کے پیچھے دوڑا نہ تک۔ آکر بائیں کرنے اور خدا حافظ کہنے کے دوران مذہبی منہ میں کچھ پڑھ کر اپنی طرف سے بڑی راز داری اور چالاکیاں سے اسے مطمئن نہ ہو سکے، کچھ پھونکا کرتی تھی۔ کچھ دن اس چیز کو دیکھتے رہنے کے بعد ایک روز اس نے دوڑا نہ پر ہی اسے سمجھ کر اپنے قریب کر کے ایسے پوچھا جیسے اس کی پوری بکلازی ہو۔

”یہ کہ میرے شوہر صاحب کمرے سے جا کر کسی خوب صورت سے خوب صورت لڑکی کو بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھیں۔ ان کے دل، دماغ اور ان کی نگاہوں میں صرف میں رہوں، صرف میرا چہرہ رہے۔“

وہ جواباً شرارتی لہجے میں بولی اور وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی سلاخی اور خیریت کے ساتھ گھر واپسی کے لئے اس پر کچھ پڑھ کر دم کرتی ہے۔ ان چیزوں میں اس نے کبھی یقین نہیں کیا تھا لیکن اس نے مالا کو ایسا کرنے سے کبھی روکنا بھی نہیں تھا۔

کوئی کام کرتے کرتے اسے سدرہ سے کوئی بات کہنا ہوتی تو بے خیالی میں منہ سے سدرہ کے بجائے مالا نکل جاتا۔ سدرہ کے چہرے پر فوراً فٹ سے بھرپور تاثر ٹھیل جاتا پھر ایک بار وہ اس کی ان حرکتوں پر اس سے ٹھیک ٹھاک لڑ پڑی۔ اس نے کہا کہ اس کی مڈل کلاس یہی جیو اس کے کپڑے، دھوئی تھی، اسڑی کرتی تھی، جو تے پالش کرتی تھی، اس کے لئے کھانے پانی اور پھر اسے خود اپنے ہاتھوں سے ملانی تھی تھی، اگر وہ سدرہ آفاق سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ ایسی مڈل کلاس خاتون کرے گی تو اس کی بھول ہے۔ مگر میں ملازمہ موجود ہے۔ وہ اس سے اپنے کام کروانے اور جو کام ملازمہ کے کرنے کے نہیں وہ خود کرتے کہ انہیں خود ہی سراپا نام دے۔ وہ سدرہ کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔

وہ امیر ماں باپ کی اگلیوں اور لاڈلی بیٹی تھی۔ ظاہر ہے، وہ اس کے پیچھے پیچھے بھر کر مڈل کلاس ہیوں جیسے کام نہیں کر سکتی تھی۔ جب ہر کام اور ہر ضرورت وقت پر پوری ہوتے ہوتے یہ کم ہونا بند ہو جائے تو جس کی وجہ سے وہ کام وقت پر ہو رہے تھے، اس کا یاد آنا تو ایک لازمی اور فطری بات ہے۔ مالا کے اتنی کثرت سے یاد آنے میں اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اب پرچکا اسے چھوٹے چھوٹے کام پہلے کی طرح کیے ہوئے نہیں ملتے ہیں۔ سوان کا سون کے نہ ہونے کی وجہ سے دو یاد آ جاتی ہے۔

اس نے خود کو بہت آسانی سے یقین دلایا کہ اپنے چھوٹے چھوٹے کام وقت پر نہ ہونے کی وجہ سے اسے یہ ٹینشن ہے اور اس میں ایسا کچھ نہیں کہ وہ اپنا کوئی زندگی میں کس کر رہا ہے۔ اسے مالا یاد نہیں آتی۔ اس کے ذریعے ان تمام پانے والے اپنے کام یاد آتے ہیں۔

☆☆☆

وہ اپنے خوابوں کے حصول کی جانب کس کا خیالی ہے رواں دواں تھا۔ ایک ہی جست میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ چکا تھا۔ دنیا کے بڑے بڑے مالک کے سینئر مینجرز، سفارت کار، بہت سے ملٹی نیشنل کمپنیز کے سینئر مینجر، یاد،

بوسے بوسے برس ہیں، اونچی پستوں والے امریکی سرکاری ملازمین، وہ آفاق جمال کے توسط سے، ان کے ذریعے سے ان لوگوں سے مل رہا تھا جن سے ملنا بھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ کیا اس آدمی کے کاغذات تھے۔ کہاں کہاں پر اس کی دوستیاں اور تعلقات تھے۔ راجستھن میں بعض ایسی مستقل سیاسی اور سماجی شخصیات تک سے ان کی سلام دعا تھی، جو وہاں کی سیاسی اور سماجی زندگی میں کافی اثر رکھتی تھیں۔

وہ اپنی زندگی کا ایک بھی پل ضائع کئے بغیر ان تمام چیزوں کو اپنے حق میں استعمال کر رہا تھا۔ وہ مصروف تھا، بے انتہا مصروف۔ آفاق جمال کے ذریعے حاصل ہونے والے تعلقات کو اپنے حق میں استعمال کرنے میں، اس کے پاس فرمت کا ایک لمحہ بھی نہیں تھا۔ زندگی میں پیچھے وہ کیا کیا کچھ چھوڑ چکا تھا۔ زندگی میں پیچھے ہو کر وہ لوگ دیکھتے ہیں، جنہیں آگے بڑھنے کی جستجو اور جنوں نہیں ہوتا۔ اسے پیچھے نہیں آگے دیکھنا ہے، بہت آگے۔ اتنا آگے جہاں تک خود اس کے اپنے خیالوں کی بھی رسائی نہ ہو۔

آج تک اونچا اڑنے کے، بلند ہونے کی انتہاؤں تک پہنچنے کے کئی بار ٹکس اس نے خود اپنے لئے کب سیٹ کئے تھے؟ دس سال کی عمر میں۔ ایک دس سال کا بچہ اور ایسی جنونی سوچ؟ ہاں اس نے اس وقت سے بھری رات میں ایسا ہی سب کچھ سوچا تھا۔

وہ ایک نڈل کا اس ٹیکسی سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے والدین کا اس کے بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اپنے سب جاننے والوں کو یہی بتا کر کرتا تھا۔ جو ذرا فری واقف کار اور دوست تھے، انہیں ذرا سی تفصیل کے ساتھ یہ کہ اس کے والد ایک معمولی ملازم تھے اور اس نے اپنا بچپن بڑی غربت اور تنگ دستی میں گزارا ہے۔

ماں تک کو اس نے اپنی ٹیکسی اور اپنے بچپن کے بارے میں سب کچھ بتا کر نہیں بتایا تھا۔ جگ یہ تھا کہ اس کا باپ کپڑے کی ایک ٹیل میں چڑا تھا، جس گھر میں وہ پیدا ہوا، وہ تو پچھلایا ایک کمرے کا مکان، مگر کھانا چانے کے ہرگز لائق نہیں تھا۔ قسٹ حال اور سخت، ایک کمرے کا مکان جو ہر موسم میں اذیت دیتا تھا۔ بارشوں میں اس کی بے بسید چھت اپنے تختی کر کمرے میں سوئی کوئی چیز باقی نہیں رہ پاتی۔ اس کے ہر حرکت پر اس کے پرے پانی سے بھیک جاتے۔

اس نے اپنی ماں کو اپنی پیدائش کے وقت سے ہی یاد رکھا تھا۔ اس کے باپ کو اپنی بھوک سے ہر سال بچے پیدا کروانے کا شوق تھا۔ جن زندگیوں کو وہ دنیا میں لے آیا تھا، انہیں ڈھنگ کی نہ لائے، روٹی اور لباس کچھ بھی نہیں دے سکتا تھا کہ اپنے کنبے میں اضافہ سے وہ بھرپور جانتا تھا۔

جواد رضا اس سے سول سال بڑا تھا اور اس کے اور جواد رضا کے چچ میں ہر سال اس کے ذمہ اور مردہ بھائی بہن پیدا ہوتے رہے تھے۔

سرکاری اسکول میں اس کا داخلہ ہی اس سول سال بڑا تھا۔ جواد رضا کو اس کا روبرو تھا۔ جواد کو دہسنے کا شوق تھا مگر وہ ناچاری جماعت تک ہی بڑھ کر کمرے کے حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی تعلیم کو خیر باد کہہ کر باپ والی ٹیل میں ملازمت اختیار کر گیا تھا۔ ماں باپ کی یہ نسبت جواد کو زیادہ خیال رکھ کر لیتا تھا۔ جیر کو اپنے اس گھر سے، اس ماحول سے، اس زندگی سے ہرچیز سے نفرت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنا پتلا ماریٹا بے شک کر کے چاند لکھتا تھا۔ اپنے اپنے گھٹیا سرکاری اسکول جا رہا ہوتا تو راستے میں چڑنے والے اس بوسے سے انگلیں میڈیم اسکول کو حسرت سے دیکھتا۔ صبح

کے وقت وہاں ایک سے بڑھ کر ایک جیتی جاگتی گزریاں آکر کر رہی ہو جی اور ان میں سے صاف ستھرا، نیا ہی نظام پہنے خوش و خرم بچے اتر کر اسکول کے گیٹ میں داخل ہو رہے ہوتے۔ یہ فرق کیوں تھا، اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ وہ بچے ڈراما تیز کے ساتھ یا اپنے ہاتھوں کے ساتھ جیتی جاگتی گزریاں سے بڑے شاندار اسکول میں آتے اور وہ بھوکے پیٹ، پھل پڑا ہی نظام پہنے، پیدل اس سرکاری اسکول میں جاتے، جہاں کی ہرچیز سے غربت برکتی تھی، جہاں کی ہرچیز اسے بھرکتی تھی۔ اپنے گھر سے، اپنے اسکول سے، اپنی اس غربت بھری زندگی سے اسے نفرت تھی مگر یہ نفرت اس رات سے پہلے کہ اتنی شدید نہیں تھی۔ اس میں ایسا جنون اور ایسا ہافیا نہ پڑی تھیں تھا۔

اوائل کی جنوری کی وہ رات بہت رشتی۔ بارش کی بہت زوردار اور گرج چمک کے ساتھ ہو رہی تھی۔ اس کی ماں بہت سخت بیمار تھی۔ وہ ایک اور بچے کو جنم دینے والی تھی۔ اس کی حالت اتنی خراب ہوئی تھی کہ اسے ہسپتال میں داخل کرانے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کا باپ سرکاری ہسپتال میں بڑی مشکلوں سے اسے داخل کروا پایا تھا۔ ہسپتال والوں نے ہزار منتوں کے بعد اسے داخل کر لیا تو اب اس کے باپ کے پاس بھئی کے علاج کے لئے بالکل بھی پیسے نہیں تھے۔ اس کی ماں مرنے کو پڑی تھی۔ اس کا فوری طور پر آپریشن کیا جانا بہت ضروری تھا اور اس کے باپ کے پاس کوئی چیز نہیں تھا۔

حمیرا کو اس کا باپ اپنے ساتھ لے کر اپنے مالکوں کے گھروں پر پیسے مانگنے جا رہا تھا۔ گھروں پر جیتی ہانت ڈیس اور گاڑی میں بیٹوں منہ میں۔ گھر دہائے صاحبوں نے اسے کرات کرنا پسند ہی کیا تو صرف اس کے باپ کو ڈیکل کرنے اور دھکارتے کے لئے۔ "میں کہاں سے دوں پیسے، میرے پاس کوئی خزانہ ہے۔ تمہاری تو روڑ کی ٹیکسی کا پانی ہے۔"

"صاحب! میں جلدی لوٹا دوں گا، میری بھئی مر جائے گی، میرے بچے بے آسرا ہو جائیں گے صاحب! رقم کریں۔" اس نے صاحب سے اپنے پاس کمرے دس سال کے بچے کی طرف اشارہ کر کے دم کی بھیک مانگی۔

"اسے سچے پیدا کیوں کر داتے ہو؟ جیب میں نکالیں اور بچے پیدا کروانے کا شوق ہے۔" صاحب نے اس کے باپ کو کھاتے سے دھکارتا تھا۔

اپنی قسم کی باوجود اسے یہ سمجھ میں تھا کہ اس کے باپ نے اسے اپنے ساتھ کیوں رکھا ہے۔ بارش اور سخت ترین سردی میں بھی کسی طرح کے گرم کپڑوں کے بغیر ایک دن سال کا مصروف سا بچہ اس حال میں دیکھ کر لوگوں کے دل پیچ جائیں گے، ان کے دلوں میں بھوری اور دم کے جذبات جاگ جائیں گے۔

پھر اس کا باپ ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنے سب سے صاحب کے محل جیسے جگہ پر آ گیا۔ کیا چاکر صاحب کا خیال بھی اس کی گلی بھٹائی بڑا ہو۔ وہ وہاں پہنچے تو چھ کیلیدار نے ان سے "صاحب سوچئے جی" کہہ دیا۔ بہت مایوس اس کا باپ اسے لے کر کہ وہاں سے جیسے ہی ذرا سا پیچھے ہٹا۔ اس نے اس کی گلی ٹانگہ کا آگے کیٹ کھلا اور اس میں سے ایک بہت ہی جیتی جاگتی گاڑی باہر نکلتی دیکھی۔

"صاحب!" اس کا باپ زور سے چلایا۔ اس گاڑی میں صاحب اپنی بیگم اور دو بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کی تیاریاں تاریکی میں کر دے گاڑی جگہ کی تقریب میں جا رہے ہیں۔ اس کا باپ اندھا دھند اس گاڑی کی طرف بھاگا۔

”جو باسزڈ، اندھے ہو گیا، دکھائی نہیں دیتا۔“ گاڑی کو بریک لگاتے صاحب نے دو چار موٹی گالیاں اس کے باپ کو دیں۔ گاڑی کی گرت گئے سے وہ لڑکھڑا کر زمین پر اتر پڑا۔ ستر گیا تھا۔

”صاحب! امیری بڑی بہت پیار ہے، صاحب! مجھے تھوڑے سے پیسے چاہئیں۔ میں جلدی واپس کر دوں گا۔ اپنے بچوں کے سر کا صدقہ کچھ کر ہی بیچکے بیچکے دے دیں صاحب! امیر سے چھوٹے چھوٹے پیسے ہیں۔“ وہ زمین پر سے بڑی مشکلوں سے کھڑے ہوئے رو رو کر فریاد کرنے والے انداز میں بولا۔

جبکہ صاحب کی گاڑی، آس کی آہیں اور فردا سے بغیر، وہ دوبارہ اشارت ہو چکی تھی۔ بسے کسی سے روتا اور صاحب کو پکارتا اس کا باپ اپنے جسم سے ہتے خون اور چٹ کے سبب دوبارہ وہ زمین پر گر چکا تھا۔ حیرنے لیک نظر اپنے باپ کو دیکھا پھر اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا لانا، اس کی دیواریں، اس کا کیت، اس کے پورچ میں کھڑی تین شاندار گاڑیوں کی طرف دیکھا جو تینوں بالکل نئے ماڈل کی تھیں اور چوٹی کا گاڑی جو سب سے چھٹی تھی، وہ وہ گاڑی تھے وہ آدمی ابھی اس پورچ سے نکال کر لے جا چکا تھا جسے اس کا باپ صاحب کہہ کر غائب کر رہا تھا۔ اندھیرے میں بھی اس نے اس امیر کیر شخص کی رخصت ہرے سفردو چہرے کو بخود دیکھا تھا۔ اس نے جو جیتی سوٹ پہن رکھا تھا اسے بھی، زیورات اور قیمتی لباس اس کی بڑی کو بھی اور پچھلی نشست پر بیٹھے اس کے دونوں بیٹوں کو بھی جڑا سی جیتی عمر کے لگ رہے تھے۔

اس نے ان کی آہ میں وہ سر موکشاں بھی دیکھی تھیں جو وہ اسے اور اس کے باپ کو کچھ کر شرفنا انداز میں کر رہے تھے۔ جب اس کا باپ ٹھوکر کھا کر زمین پر گر آیا اس نے اپنے باپ سے زیادہ غور سے ان دونوں لڑکوں کو قہقہہ لگاتے دیکھا تھا۔

جنی لباس پہنے وہ دونوں لڑکے حیر پر ہنس رہے تھے، اس کے باپ پر ہنس رہے تھے۔ اس نے اپنی جگہ جگہ سے پہلی قمیض کی طرف دیکھا۔ لیٹا بازار سے خریدی ہوئی سستی پیچٹ کی طرف دیکھا اور اپنی کھٹیا سی چیلوں کی طرف دیکھا جس پر سوچی سے اتنی بار سلائی کروائی جا چکی تھی کہ اب تنگی میں مشکل تھا۔ اس رات اس سوک پر کھڑے ہو کر اس کا دل چاہا زمین پہنے اور وہ اس میں سا جائے۔ فقیروں کی طرح اس کا باپ اسے مگر مگر ہلکے ہلکے لے جا رہا تھا۔ اس کے داہلے دے کر، اس کی معصوم مغل وکلا کر کوکوں سے خیرات مانگ رہا تھا۔ اس کی بی بی چٹ کھا کر زمین پر سہلہ بھر گئے اور روئے ہوئے اپنے باپ سے اسے غرت محسوس ہوئی، شدید غرت، بے انتہا غرت۔ باپ کے جسم سے بہتا بخانہ دیکھ کر بھی اسے اس پر ترس نہ آیا۔

عجب باغیانہ اور جونی خیالات اس کے دل میں آ رہے تھے۔ جو آدمی ابھی اپنی بڑی اور بچوں کے ساتھ انھیں دکھلاتا یہاں سے گیا ہے، وہ اس نے اس کی ہر چیز چھین لے۔ اس کی گاڑیاں، گھر، ٹیکسٹریاں، بیس، ساری دولت، وہ اس سے سب کچھ چھین لے۔ زمین پر گرے اپنے باپ کو کھانے سے ڈھکے نہیں بڑھا۔ اس نے سہارا دینے کو اپنے باپ کے سامنے اپنا بازو نہیں بڑھا۔ اس نے اسے زمین پر ہزار بے دیا۔

وہ سوچ رہا تھا وہ گاڑی میں بیٹھ کر ابھی یہاں سے گیا ہے تو کیا وہ آسان سے اترتا تھا، نہیں۔ اس کے پاس دولت اس لئے تھی کیونکہ اس نے اس کے حصول کے لئے کوششیں کی تھیں، محنت کی تھی۔ اس نے رضا عرفان کی

طرح نقشہ پر ہر شاہرہ کو صاحب لوگوں کے لئے چاہے بنائے اور فائلیں ادھر سے ادھر لے جانے میں اپنی زندگی نہیں گنوا لیتی تھی۔ اگر وہ ذلیل کیا جا رہا تھا تو خود اپنی وجہ سے اس کے پاس دولت ہوئی، رتبہ ہوتا تو لوگ اسے انسانوں کی طرح فریٹ کرتے، جاہلوروں کی طرح نہیں۔

صبح کے قریب کبھی جا کر اس کی ماں مر پائی تھی۔ ساری رات تو بچے بڑی مشکلوں سے صبح سویرے اس کا دم لگا تھا۔ پانچپن اس کا باپ اور بڑا بھائی اس موت پر ردیوں رہے تھے۔ کم از کم اس کی آنکھوں سے تو ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا تھا۔ وہ سب جانتے تھے، وہ مری رہے، وہ مرنے والی ہے۔ اگر ان میں اس کے لئے کچھ کر سکتے کی ہمت ہوئی تو وہ اسے بھانڈ لیتے۔ بے بسی سے روئے بٹکتے اپنے باپ سے اسے ایسی شدید بغرت ہو رہی تھی کہ وہ انھوں میں اس کا اظہار کر ہی نہیں سکتا تھا۔

اب اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بہت تیز دوڑے گا۔ اتنا تیز کہ اس کی رفتار تک پہنچنا کسی دوسرے انسان کے بس کی بات نہ رہے۔ وہ رضا عرفان کا بیٹا ضرور ہے، وہ جو ادھر رضا کا بھائی ضرور ہے مگر وہ ان جیسا نہیں۔ وہ دنیا سے اپنے لئے سب کچھ حاصل کر لے گا، چاہے جس طرح بھی۔

رضا عرفان کی بی بی کا شکار ہو کر دو سال بعد مر گیا۔ اسے اس کے مرنے پر کوئی غم نہیں ہوا تھا۔ ہاں اپنی ماں کے مرنے کا غم ضرور چند سالوں تک اس کے ساتھ رہا مگر پھر اس نے خود کو یہ کہہ کر اس غم کو دل سے دور کیا کہ جلد یا بدیر اس کمزور اور بیمار عورت نے آخر کار مرنا تو ایسی لذت اور کسبھی کے ساتھ تھا۔ بھوک، غریب، بیماری اور ہر سال دایینوں کے ہاتھوں پہاڑوں والے بیٹے۔ رضا عرفان جیسے شوہر کی اس مجبور بیوی کا انجام بالآخر یہی ہونا تھا۔

وہ تعلیم حاصل کر رہا۔ وہ اپنی زندگی کو سونار کرنے کی جدوجہد کرتا۔ جو ادھر اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کے تعلیمی اخراجات کے لئے وہ اسے پیسے دیکرتا۔ اس کی بڑی کو پرکھا اور دیکھ کر جس ملک کا قمر وہ اپنے سے سولہ سال چھوٹے بھائی کو اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا تھا۔ حیرت جو غصہ، سوئی تو کرایا کر کے اسے تعلیمی اخراجات پر لے کر اسے کوشش کرتا تھا مگر سچ یہ تھا کہ جو لڑکے دیئے پھیلوں کے بیٹروہ اکیلے اپنا خرچ خودیوں اٹھا سکتا تھا۔ جو ادھر اس کی تعلیم سے بہت خوش تھا۔ وہ خودیوں چڑھا۔ کم از کم اس کا چھوٹا بھائی تو اپنی تعلیم حاصل کر لے۔ جو ادھر اس کے ساشی حالات کو بہت قابل رشک نہیں تھے۔ وہ رضا عرفان سے بہتر زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے لئے تعلیم بھی حاصل کر رہے تھے اور انہیں تینوں وقت کھا بھی مٹا تھا۔ چاہے روکھا، سوکھا اور عام سا کھانا ہی مگر وہ جو ادھر امیر کی طرح بھوکے پیٹ نہیں سوتے تھے۔

اسے پھر بھی اپنے بھائی پر ترس آتا تھا۔ کتنے مڑے سے خوشی خوشی وہ بے پیسے جوڑ جوڑ خرچ کرنے والی غربت بھری زندگی کی بات تھا۔ رضا عرفان کی طرح کنویں کا سینڈک۔ ایک دوڑ دینا سے بھی روزدنی آگے بڑھ جائے گی۔ اس دنیا میں صرف اس کی عزت ہے جس کے پاس دولت ہے، حیثیت ہے، دولت سے سکھ، جین، آسائش یہاں تک کر رہنے نا طے کی خریدے جا سکتے ہیں اور دولت نہ دے پر کڑا ہے بھی جا سکتے ہیں۔

اس کی بھائی کو بھی اس کی ماں کی طرح بچوں کی فوج اٹھنی کرنے کا شوق تھا۔ ہر دو ڈھائی سال بعد آنے والے ان جنموں سے وہ بڑھ رہا تھا۔ اسے اس چھوٹے سے ڈر پر نہ گھر میں ڈھک میں بیٹنے کی جگہ نہیں تھی مگر پھر اپنے اس سسٹلے کا کل اس نے غلام جاس سے دوستی کر کے نکالا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا جب اس نے کسی کو اپنے

خانہ کے لئے استعمال کیا تھا۔ ان میں سے کوئی اس کے معیار کے مطابق نہیں تھا مگر غلام عباس سے اسے دوستی کرنی پڑی۔ اس میں اس کا اپنا مفاد پوشیدہ تھا۔ غلام عباس کے باپ کی پرانی کتابوں کی دکان تھی۔ لوگ وہاں سینکڑ بیٹھ کتابیں خریدنے آتے تھے۔ حیر کے لئے وہ جگہ پوری تھی جیسے وہ کسی شاندار لائبریری میں مفت پڑھنے کے لئے جاتا ہو۔ بغیر کسی خرچے کے وہاں اسے وقت بہت می آجی اور اسکی کتابوں سے استفادہ کا موقع ملتا تھا۔ انجینئرسینکڑ بیٹھ خریدتا بھی اس کی استطاعت سے باہر تھا۔ وہاں ابھی ابھی کتابوں کا مطالعہ کر کے ہی اس نے اپنی انگریزی کو بہتر کیا تھا۔ بھڑ کتابوں کے ذریعے اپنے مختلف مضامین کو لکھ خود دیتا کہ اپنے سرکاری اسکول کے اساتذہ کو دیئے فوض بھی اس کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ اکثر وہ مذکر کے غلام عباس کو دات کر دکان پر ہی رکھتے پر مجبور کر دیتا۔ غلام عباس اپنے اور اس کے لئے کھر سے کھانا لے آتا اور پھر کھانا کھا کر دکان بند کر کے زمین پر لیٹ کر سو جاتا اور حیر ساری ساری رات جا کر چر دتا رہتا۔

وہ میٹرک میں تھا جب اس نے ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں نوکری کر لی۔ وہاں کے مالک ایک انگریزی میاں جوی تھے۔ وہ ریسٹورنٹ ایک مینجے کرتے تھے غلام عباس نے والے تمام افراد اچھے بیٹھے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نے وہاں بے مقصد نوکری نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا وہاں کس کلاس کے افراد آتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ غیر معمولی طور پر تیز تھا اور وہاں آنے والے پر شاندار مرد کے اچھے بیٹھے اور کھانے پینے کے انداز کو پوری طرح اپنی نظر میں رکھتا تھا۔ جو مرد اسے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اس نے لباس کیا پہتا ہے۔ وہ بول کس طرح رہا ہے۔ وہ بیٹھ کس طرح رہا ہے۔ وہ دھڑو سے کس انداز میں منتقل کر رہا ہے۔ وہ ان تمام مہنڈ کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جو اسے آنے چاہتے ہیں۔ اپنی لکھتے، پڑھتے میں ابھی انگریزی کو وہ اپنے انگریز مالکوں اور وہاں آنے والے فیرنگلی افراد کے ذریعے بولے میں بھی اچھا سمجھتا تھا۔

وہ صرف ایک سال کام کرنے ہی سے اس نے اپنی انگریزی کو ایسا بنا لیا جیسے کسی کا ٹوینٹ کا پڑھا ہوا ہو۔ میٹرک میں اس نے بورڈ میں پوزیشن لی تھی اور دھر کے سب سے بہترین کا بیج میں میرٹ براس کا داخلہ ہوا تھا۔ اب وہ اس سہانہ اور گھٹیا سرکاری اسکول کی ٹیچا سے نکل آیا تھا۔ اب اس کے اساتذہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور اس بہترین کا بیج میں آنے والے تمام لڑکے بھی اچھے اچھے گراؤں سے تعلق رکھتے تھے۔

پرنس اینڈ مشینیں کا بیلا ہے اور آئی لی اس کے چڑیا کا نام ہے۔ یہ جواد مضامین جانتا تھا پھر بھی اسے اتنا ضرور دیکھ میں آچھا تھا کہ اس کا بھائی کسی بہت اچھی جگہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے مگر اس اعلیٰ تعلیم کے حصول کے ساتھ ہی حیر نے بھائی کے اس گھر کو چھوڑنے کی بھی بات کی، اس سے وہ بولا کہ کیا۔ اپنا گھر ہوتے چھوڑا بھائی کہیں اور کیوں جا کر رہے۔ اس نے حیر کو روک دینے کی بہت کوشش کی مگر اسے دیکھنا ہی نہیں۔

اسے قائل کرنے میں اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا آگے مروہ آنسو اس کے دل پر اثر نہ کر سکے۔ اپنی ذاتی کے لئے تھوڑا سا خود غرض اگر انسان ہو جائے تو اس میں کوئی برائی نہیں بھرے بھی تھا اور خدا کا اس سے بہت کرم تھا یا ہوئے بھائی کی حیثیت سے اس نے اسکول کے دنوں میں اسے ملای تعاون فرمایا تھا تو اپنی مرضی سے۔ حیر نے خود کو بھی اس کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا دیا تھا۔ ہاں جب وہ اسے اس کے اخراجات کے لئے رقم دیتا تو کبھی لینے

سے انکا نہیں کیا تھا۔ غلام عباس کو میٹرک کے بعد اور جو درخشا کا کٹر کے بعد اس نے اپنی زندگی سے باہر کر دیا تھا۔ وہ اپنے پانچ دوستوں کے ساتھ ایک کر کے کا قلیت میٹرک کرنے لگا۔ اس کے پاس ذہانت تھی، ملامتیں تھیں، قابلیت تھی اور زندگی میں بہت کچھ کر دکھانے کا مزہ۔ آئی لی نے اس میں اس کے ساتھ پڑھنے والوں کی اکثریت اور اچھے بیٹھے سے تعلق رکھتی تھی۔ جو چند لڑکے اس کے سٹوڈنٹس وہاں تھے بھی تو ان سے دوستی اور راہ و رسم اس نے کبھی نہیں بڑھائی۔ اس کے تمام دوست امیر گھروں سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ خود اپنا فیملی بیک گراؤڈ کسی کو نہیں بتاتا تھا۔ سوائے اس کے کہ اس کے پرنس کی زدہ ہو چکی ہے اور وہ اپنے بھائی بھائی کے ساتھ رہنے کے بجائے دوستوں کے ساتھ قلیت میٹرک کرتا ہے۔ ایم لی اسے کر لیتا اس کے خوابوں کی زندگی کی طرف لے جانے کے لئے اٹھاتا تھا۔

اس کا ایم لی اسے ہو گیا فارن بینک میں جا ب لی گئی۔ ایک کرشل ایریا میں ایک کر کے کے قلیت سے نکل کر وہ ایک بھر پور پرائی ملاتے میں دو کروڑ کے قلیت میں منتقل ہو گیا جسے وہ کسی کے ساتھ میٹرک نہیں کرتا تھا۔ پچھلے قلیت سے چاہے وہ بہت اچھا تھا مگر پھر بھی وہ قلیت اور وہ علاقہ اس کے معیار کے مطابق نہیں تھا مگر مشکل یہ تھی کہ اس سے بھر ملاتے میں اپنا مشن لی الحال وہ انفرڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے کیریئر کی ابتدا تھی۔ ایک مہ سب کچھ کیے آ جاتا! کتنے سمجھتا تک بچت کر کے کہ اپنی جمع کی کوئی ساری رقم خرچ کرنے کے بعد تو کہیں جا کر وہ ایک گاڑی خرید لیا تھا۔

اپنی جا ب کی ابتدائی مشن وہ وہاں اپنی قابلیت کو بڑی آسانی سے تسلیم کروا چکا تھا مگر اس کے باوجود بھی ابھی زندگی اس کی جگہ نہیں پہنچی تھی جہاں وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا پھر اسے دولی۔ ماما احمد علی..... خوبصورت ایسی کس اس پر سے لگاؤں بنانا کوئی نہ چاہے اور وہ بین ایسی کس کی گفتگو خاموشی سے بے بغیر رہا نہ جائے۔ وہ خوبصورتی اور ذہانت کا بڑا حسین امتزاج تھی۔ فوٹو گیسٹو سسٹو کی اسٹوڈنٹس جو مقرر ہے ایم لی اسے کر کے آئی لی اسے سے پاس آؤت کرنے والی تھی۔

اس لڑکی کا پروفیشنل کیریئر کتنا شاندار ہوگا اور اس سے پہلی ملاقات میں اس کی ذہانت اور قابلیت کو جانچنے کے بعد بھی اس کی طرح اندازہ لگا سکتا تھا۔ اس کے انداز سے کم ہی غلط ثابت ہوتے تھے اور ماما احمد علی اس کے اندازوں کے حساب سے ایک ذہن قاطل ابھی عادات اور اچھے حراج کی حامل لڑکی تھی۔ اسے ماما احمد علی سے اس پہلی ملاقات میں ہی محبت ہوئی تھی۔ کس قسم کی محبت؟ بڑی Calculated..... تمام خانہ نقصان سوچنے سمجھنے اور اچھائیاں بنائیاں چاچھ لینے کے بعد ہونے والی محبت۔

وہ جانتا تھا کہ وہ جس سے شادی کرے وہ اس کی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ اور شاندار کیریئر رکھنے والی لڑکی ہوگا کہ وہ وہاں کر دینی زندگی گزاریں یہی زندگی وہ گزارنا چاہتا تھا۔ ایک ایسی لڑکی جو اس قاطل ہو کر اس کے ساتھ قدم سے قدم لاکر چلے اور زندگی کو خوبصورت تر بن جائے جس میں اس کے شانہ بڑھنا کام کرے مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایک کروڑ بیٹلی گراؤڈ کے ساتھ کسی اچھی فیملی کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کا شانہ خاصا مشکل کام تھا۔

ماما کو کہنے لے لیا اس سے مل کر اس گھر نے اس کی فر دھار آ رہی تھی مگر پھر بھی وہ یہ سوچ کر رہا تھا کہ کہیں اس کے گھر والے اس رہنے سے انکا نہ کر دیں۔ کوئی یہ بھی تو اسے اٹھا کر اپنی بیٹی نہیں دے دے گا۔ اس کے بارے میں پوری چھان بین کی جائے گی غربت بھرے ماحول میں پلا ایک بچہ اسی کا بیٹا اور ایک جائلی، گھوڑا اور غریب شخص بھائی۔ دوستی کی بات دوسری ہے مگر شادی بیاہ کے معاملات میں لوگ حسب نسب اور خاندان کو کس قدر اہمیت دیتے

ہیں وہ ابھی طرح جاتا تھا کہ وہ لڑکی تو بیس لی ہی اسے اس کے مسائل کے حل کے لئے تھی۔ اس کی ماں کو بھی کچھ بوجھ اتار کر بچھنے کی اپنی جلدی تھی کہ اس نے دکی کارروائی کے طور پر بھی حیر کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی ماں کے ساتھ شادی سے ہوگئی۔ یعنی اب وہ لڑکی اس کی زندگی میں آئے، دانی تھی جسے اس کے ساتھ مل کر معاشی میدان میں سرگرم مل جاتا تھا اور زندگی کو خوب صورت بنانے میں اس کی مدد کرتی تھی۔

اس نے تار بنے ہوئے ہی پہلی فرمت میں اس بچے ملائے میں کرائے کا اپنا رشت لے لیا جہاں رہتا اس کا دیرینہ خواب تھا۔

وہ ماں کو بیاہ کر اپنے ساتھ آیا وہ اس کے ساتھ پر بہت خوش تھا۔ اس کا ساتھ اسے اس کے خوابوں سے نزدیک جو کر رہا تھا لیکن وہ ماں اچھلی وہ تو پاگل پاگل تھی کہ وہ جاب نہیں کرے گی۔ وہ گھر پر بیٹھ کر اس کی خدمتیں کرے گی۔ اس کے منہ سے جب سے انکار نہ کر وہ بھلا گیا۔ اس نے ایک ایم لی اے کی ہوئی لڑکی سے نکاح کیا اس لئے شادی کی تھی کہ وہ گھر بیٹھ کر مرنے سے اس کی کمائی اڑائے، اس کے دیئے پیسوں پر انحصار کرے، اس کی کمائی سے گھر کے سارے اخراجات چلا کر خود کو ایک گھگھرا اور شرقی بیوی سمجھے۔ وہ ماں اچھلی کو اپنے لئے ایک بوجھ بنا کر نہیں بدل مل کر بوجھ اٹھانے والی بنا کر لایا تھا اور وہ اس پر بوجھ بننے کی بات کر رہی تھی۔ شکر تھا کہ وہ اسے جاب کے لئے قائل کر سکا، ورنہ اس کے انکار نے تو اس کے اوسان ہی خلا کر دیئے تھے۔ جس جگہ پر رہتا وہ اکیلا اور فزونی کر سکتا تھا، وہاں ماں کے تعاون سے آرام سے رہتے گا۔ اس نے ماں کو بکشا کر بھی اخراجات کس طرح بانٹنے میں نہیں سمجھا تھا کہ وہ واقعی ذہین لڑکی تھی۔ اس کے کھانے بھر بچھ کر تھی کہ اسے کن کن چیزوں کا خرچہ اپنے دے لینا ہے۔ پورے انصاف اور عدل سے وہ دونوں مل کر اپنے گھر کا خرچہ چلا رہے تھے۔ وہ ماں کے ساتھ بہت خوش تھا۔ وہ پاگل دیکھ بیوی کی تھی بیوی اسے چاہے تھی اور وہ محبت اس سے اپنی والدہ جی کی تھی کہ بعض دفعہ وہ اس کی محبت کی شدت پر حیران سادہ جاتا تھا۔ وہ یہ بات بھرتی کر کے اختلاف کے تسلیم کرتا تھا کہ اس میں اور کبھی کوئی لڑائی جھگڑا اور گھبراہٹ ہوئی تو صرف ماں کی وجہ سے۔ وہ اس کی کسی بات سے اختلاف کرتی ہی نہیں تھی۔

کبھی وہ احسان مند ہی اور مروت کا شکار ہوتا اور کبھی نہیں بھی ہوتا۔ کبھی جال اس کی دقت ہوتا جب وہ اس کی خدمت کرتی، اس کے سارے کام کی یاد میں لگن سے انجام دیتی۔ شادی کے ابتدائی دنوں سے ہی اس نے خودی حیر کے سارے کام سارے کام اپنے ذمہ لے لئے تھے اور وہ اس سے اپنے کام کروانے کا بہت عادی ہو چکی ہو گیا تھا۔ وہ صرف معاشی میدان میں اس کی ہم قدم تھی۔ گھر پر اس کی انجام دہی کے لحاظ سے بھی وہ ایک بہترین بیوی ثابت ہوئی تھی۔

کبھی وہ اس کی خدمتوں سے بہت متاثر ہوتا اور کبھی پسوچ کرے نیاز ہو جاتا کہ ماں کی اپنی خدمت اور اپنی محبت کا سبب یہ ہے کہ وہ بے سراسر لاوارث ہے۔ حیر کے سوا اس کا اور کوئی آسرا نہیں۔ ایک کتنی ہی سوچ اس کے اندر ابھرتی، اسے ماں کا کمون اور اس سے متاثر ہونے سے روک دیتی۔ یہ خدمتیں اور یہ محبتیں نظر سے ضرورت کے تحت ہیں۔ مدام تحفہ کا شکار، لاوارث اور تنہا لڑکی۔ اگر اس سے محبت نہیں جانتے گی تو آخر جانے گی کہاں؟ جو ایک رشتہ اسے حیر کی سورت ملا ہے، تحفہ فراہم کرنے کا ظہر ہے اسے وہ کسی بھی قیمت پر کھانا نہیں چاہتی تھی۔

کبھی اگر اسے معمولی بھاری ناز لگتا تھی ہی ہو جاتا تو وہ اس کی تیار داری اور خدمت میں دن، رات ایک کر دیتی۔ اسے ہر مل اس کی محبت کی فکر دیتی۔ اسے لگا کہ کام کی جمن میں وہ اپنی صحت سے غفلت کرتا ہے۔ یہ احساس دل میں رکھنے کے باوجود کہ وہ اس سے اپنی محبت اس لئے جانتی ہے کہ اس کے سوا اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں، اسے بھر بھی اس کی محبت اور والدہ بن چکا تھا۔ حیر رضا کے فیصلے کی غلط ثابت نہیں ہوتے۔ لوگوں کے متعلق اس کی ابتدائی رائے ہمیشہ سو فیصد درست ثابت ہوتی تھی۔ ماں اس کا بہترین انتخاب تھی۔

وہ اس کے ایک یا دو بچوں کی ماں بھی بن جاتی اور آئندہ چندہ یا بیس سالوں بعد وہ دونوں مل کر اپنا وہ خوابوں کا گھر بھی بنالیتے جس کی اسے دونوں نے مل کر خواب دیکھے تھے عمران تمام ملکات کی راہ میں سدرہ آفاق آگئی۔ وہ حیر سے پہلی ملاقات کے ابتدائی گھنٹوں میں ہی اس کی محبت میں جلا ہو گئی تھی اور حیر اس کے باپ کے ایشیئس اور اثر و سرخ کی محبت میں، ہرگز روتے نہ اس کے ساتھ وہ اس کے قریب آتی جاری تھی اور وہ اسے خود سے دور کرنے کے قریب آتی جاری تھی اور وہ اسے خود سے دور کرنے کے بجائے مزید قریب آنے کا موقع دے رہا تھا۔ اس وقت اس اور اس تعلق کی پہلی اگر سدرہ کی جانب سے ہوئی تھی تو اس میں مزید بے تکلفی اور قربت پیدا کرنے میں اس کی کوششوں کا بھی پورا پر دخل تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اس کے اپنے اندر جنگی چہرہ جاتی۔ وہ اس لڑکی کو خود سے دور کیوں نہیں کر دیا، اسے صاف صاف یہ کیوں نہیں بتا دیتا کہ وہ ایک خوفناک شادی شدہ زندگی گزار رہا ہے، وہ خوفناک زندگی؟

کہاں ہے زندگی خوفناک ہے خوفناک زندگی ہے کہ وہ ایک دور کروں کے پاؤں میں کس پر رہتا ہے؟ اپنی من پسند گاڑی خریدنا ہنوز اس کی استطاعت سے باہر ہے؟ یا یہ خوفناک زندگی ہے کہ بس گھر کا اس نے ہن سال کی عمر میں خواب دیکھا تھا، وہ اسے آئندہ میں سالوں بعد تو بھی عمر میں نصیب ہوگا؟ اس کی خواہ جو ماں سمیت بہت سے لوگوں کو کاٹل رنگ لگ رہا ہے، اس کی اپنی ماں کوں میں تو وہ کبھی مرنے سے بچی ہی نہیں۔ بس ایک بھوری کا سودا ہے۔

حیر رضا نے اٹھ لے آیا وہ ان اور اس کی قابلیت دہی ہے کہ وہ ایک دن میں لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کا سکتا ہے۔ پورے ایک ماں دن رات محنت کر کے بھی لاگت دے نہیں کا پاتا۔ وہ ایک لڑکی سدرہ آفاق اگر اس کی زندگی میں شامل ہو جائے تو وہ کہاں سے کہاں جا پھنکے گا۔ سدرہ کی چش تقدیر کا آکر وہ والدہ انداز میں پر تپاک خیر مقدم کر رہا تھا تو گھر ماں کی جھینٹیں اٹھ رہی تھیں اسے اچھا نہیں۔

ان دنوں اس کی خدمتوں پر خوش ہونے اور فرح محسوس کرنے کے بجائے وہ اچھٹے لگا تھا پھر یہ ابھن اس کے رویوں سے بھی بچھٹنے لگی۔ وہ اسے کیا کہہ کر چھوڑے؟ وہ اس کے ساتھ اپنی آگہی ہے وہ اس سے لڑکے اس کی کوئی نڈائی بنا کر بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن وہ ماں کی ان چھانچوں کا کیا کرے کہ یہ چھانچاں اسے وہ زندگی نہیں دے سکتیں، کبھی زندگی وہ جیتا جاتا ہے۔

سدرہ سے شادی کر لی تو ماں کا کیا ہوگا؟ وہ تو پاگل اکیلی ہو جائے گی۔ اس کے سوا تو اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔ تو کیا وہ صرف اس لئے اپنے خوابوں کی زندگی کے منہ بھر لے کر زندگی کی طرف بڑھنے سے ماں کی رہ جائے گی۔ یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر بیٹھے بیٹھتے رہے۔ "ماں کی رہ جائے گی" والے اپنے اس اجتہاد

خیال کے ساتھ۔"

پدمی کسی لڑکی ہے سنبھال لے گی غرو۔

اس کے اپنے اندر سوال جواب ہوتے۔ اس فیصلے کے حق میں اور مخالفت میں دونوں طرح دلائل دینے جاتے۔ وہ ان دونوں ایک ہی جہتوں میں گرفتار تھا۔ اس کی یہ اہمیتیں بلاوجہ اس کا رویہ متعصب کر رہی تھیں وہ خود انہی کے بھی چھوٹی سی بات پر جھگڑا شروع کر دیتا۔

مگر وہ تو اس کی تخیلوں کے جواب میں پہلے سے بھی زیادہ متعصب ہو گئی تھی۔ بہت تلاش اور کوشش کے باوجود بھی جب اسے چھوڑنے کی کوئی مستقل جہاں نہیں ملتی تو آخر کار اس نے بھی لے کر لیا کر اسے بغیر کے ہی چھوڑ دیا۔ سدرہ آفاق بھی لڑکی اسے زندگی میں پھر کسی بھی شکل میں قحطی اور وہ زندگی میں چھینتا نہیں چاہتا اور ہا۔۔۔۔۔۔ اسے اس کے لئے ہنسوں ہے، وہ اسے خوشی سے نہیں چھوڑ رہا۔ وہ ہا کو یہ سب سمجھتا ہے، بہت اچھی طرح۔ اچھے لہجے میں۔ دوستوں کے سے انداز میں۔ وہ اس کا دل دیکھتے پر اس سے مسخرت بھی کر لے گا۔

مگر اس کے بہت اچھے انداز اور نرم لہجے کے باوجود بھی اس بات پر ہا کا رد عمل ناگوار پین اور جھون سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اس سے سختی مشکلوں سے بچتا چھڑا پیا یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ سدرہ سے شادی کے کافی عرصے بعد اس نے ہا سے طلاق کی بات کرنے کے لئے فون کیا۔ جب تو رد دینا پڑا تو اس نے اسے کام کرنے ہی نہیں دیا تھا۔ اب وہ یہ اہم ترین بات کرنا چاہتا تھا۔ ہا اچھل دانتی خود رواری اور عزت نفس سے نا آشنا تھی۔ وہ اس سے طلاق لینے سے انکار کر رہی تھی۔

☆☆☆

سدرہ نے اسے اپنے پرکھتے ہوئے کی خبر سنائی تو اس خبر پر کوئی خاص خوشی محسوس نہ کرنے کے باوجود اس نے مصوٰی خوشی کا اظہار کیا۔ سدرہ چاہتی تھی کہ بچے کی پیدائش کراچی میں ہو۔ اس موقع پر وہ اپنی ہی کو اپنے قریب دیکھنا چاہتی تھی اور وہ بیماری کی وجہ سے امریکہ آگئیں کتنی تھی۔ سدرہ کا چیلہ کراچی چلی گئی تھی جبکہ وہ ہونگیسنسی کے آخری دنوں میں اپنے بہت سے کام چھوڑ کر وہاں جانے پر مصروف آس جہ سے مجبور ہوا تھا اس کی خبر مجھ کو پر وہ خاصی خفا تھی اور ہرفون کال میں اس خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ ابھی اپنے ڈاکٹریت میں مصروف تھا اور بھی کئی طرح کے اہم ترین کاموں میں اس نے خود کو مصروف رکھا ہوا تھا۔ اس کے لئے اس کا کیریئر دینا کے ہر شے سے زیادہ اہم تھا مگر پھر بھی بات کے سدرہ آفاق کو ناراض کرنے کا رسک وہ بالکل نہیں لے سکتا تھا۔

ہا کراچی میں اسے ایک دکان میں مل گئی تھی تو اسے دیکھ کر اسے صرف یہ خوف لاحق ہوا کہ وہ سدرہ کے سامنے اس کے پاس آکر اس کی نہیں نہ کرنے لگے۔ اسے اپنے پاس واپس لانے کے لئے اچھا نہیں نہ کرنے لگے۔ چائیں کئی مئی کی جی تھی اس سے نظرت کرنے کے بجائے وہ ابھی بھی اس کی محبت میں جتا رہی۔ اس میں ابھی مئی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اسے چھوڑ کر چلا جائے۔ اس کی واپسی کی دل و جان سے منتظر تھی۔

سدرہ تو اس کے نام سے بھی غار کھاتی تھی۔ اگر وہ اس کی فون تو لازمی طور پر سدرہ کا موزہ غراب ہو جائے گا لیکن شکر تھا کہ وہ پاس آئی نہیں تھی۔ ہاں اس کے دوست نے ضرور شاہ کے دادا کا کردار اچھا سمجھا تھا۔

کوشش کی تھی۔

اگر وہ باپ بن ہی رہا تھا تو اسے بیٹے کا باپ بننا تھا مگر قسمت نے یہاں اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اسے بیٹی کی کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی مگر صرف سدرہ کی وجہ سے اس نے جھوٹی خوشی کا اظہار کیا اور جبکہ کربکات میں لپٹی اپنی بیٹی کو پیار کرنے لگا۔

"ہم اپنی بیٹی کا کیا نام رکھیں گے؟" اس نے سدرہ کی آواز سنی اور کہیں بہت دور یاد کا ایک دور پہنچ کر لیا۔

"ہم اپنی بیٹی کا نام رکھیں گے۔"

"اہل" ہے۔ یہ ساخت اس کے منہ سے نکلا۔ یہ نام لینے وقت اسے خود اپنی آواز بہت اچھی لگی۔ اس آواز میں کون سے دکھ بول رہے تھے، کون سے غم دور ہے؟

"اس کا مطلب ہے، اہل میرضا۔ ہاں یہ بہت اچھا نام ہے۔" وہ جو باہر اسرائیل میں ملتا مکمل مسکرایا۔

اپنی بیٹی کو جب دیکھا اسے نہانے کیوں اس کا خیال آتا۔ اسے بچے کتنے پسند تھے، خاص طور پر لڑکیاں۔ اگر اس کی بیٹی ہوتی۔ ہاں بن کر وہ تو خوشی سے لپٹی ہو جاتی۔ سدرہ نے اہل کے لئے کورس رکھی تھی۔ اگر وہ ہوتی تو اپنی بیٹی کے سب ناز خیرے خود اٹھائی بالکل اسی طرح جیسے اس کے باپ کے اٹھاتی تھی۔ یہ وہ سدرہ کی باتیں سوچنے لگے۔

ہا اچھل دانتی کا بیٹا ہوا اہل ہے، اہل کا نام ہی ہے۔ جذبات، احساسات، یادیں ان سب کے لئے میرضا کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں۔

☆☆☆

"To Homi with love" یہ حوی کون ہے؟" وہ بیٹے پر اپنے گرد کتا نہیں بیٹھتا ہے۔ بیٹا اپنا کام کر رہا تھا۔ سدرہ نے وہاں اس بیٹھے ہوئی ایک کتاب اٹھائی اور اس کے دوران بیٹھے لگی۔ تیزی سے قلم چلاتے اس کے ہاتھ ایک دم ساکت ہوئے تھے۔ جینک پر یہ بہت اچھی کتاب اسے ہا سے تھم میں دی تھی۔

"میرے دوست مجھے کہتے تھے۔"

"لیکن یہ لکھائی اور یہ انداز کوئی لڑکی کا ہے۔"

"تو کیا میرے دوستوں میں لڑکیاں شامل نہیں ہو سکتیں بالکل اسی طرح جیسے تمہارے دوستوں میں بہت سے مرد بھی شامل ہیں۔"

وہ بلاوجہ جھگڑا ہو گیا۔ سدرہ اس وقت بہت اچھے موڈ میں تھی۔ اس لئے کئی پر دھیان دینے بغیر بولی۔ "یعنی تمہارا تک نیم ہے۔ مجھے کیوں نہیں بتایا؟" میں بھی جنہیں اسی نام سے بلاتی۔ چلو خیر، میں اب جنہیں تمہارے دوستوں کی طرح حوی ہی کہا کروں گی۔"

"نہیں۔" وہ اتنی سختی سے "نہیں" بولا کہ سدرہ قہر سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"میرا مطلب ہے یہ نام مجھے پسند نہیں ہے۔ میرے دوست بھی مجھے اس نام سے چڑنا دیکھ کر جان بوجھ کر

مجھے زنج کرنے کو یہ نام لینے تھے۔" اپنے لہجے کی کاڑواہل کرنے کے لئے وہ فوراً وضاحتی اعزاز میں بولا۔
 "دعہ دیتے اسے یہ نام لینے کا حق۔ جب اس کا برحق جبین کراس عورت کی جھولی میں ڈال دیا تو ایک نام سے لائق فرق پڑتا ہے۔" اس کے اندر کوئی اس سے لا پڑا۔ اپنے اندر سے ابھرتی یہ آواز اسے بہت ڈرائی تھی۔ اس آواز کے پاس بہت سارے دلائل تھے۔ یہ آواز ہر بار اسے لاجواب کر دیتی تھی اور یہ آواز دن بھر میں تجانے تھی بار اس کے اندر گونجا کرتی تھی۔

اسے لگتا تھا کہ اسے اپنے سب کام ہمارے کروانے کی عادت ہو چکی تھی۔ اس لئے جب اپنے وہ سارے چھوٹے چھوٹے کام بدلت نہیں تھے تو ان کاموں کو انجام دینے والی کا خیال آ جاتا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے۔ مگر اب یہاں اتنا سارا وقت گزار لینے کے بعد اس کے جو کام ملازم نہیں کرتی تھی، اس نے بخوشی انہیں خود کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی زندگی کے تمام معمولات بالکل ترتیب اور توازن کے ساتھ انجام پارہے تھے۔ جب وہ کیوں یاد آتی تھی؟ جب کہیں اس کا خیال آتا تھا؟ ایسی ایسی جگہوں پر اس کا خیال آ جاتا تھا جہاں اس کے یاد آنے کی کوئی شک جتنی تھی۔ کسی بہت بڑے دیکر سے ملنے وقت، اپنی بیکری کو کچھ سمجھاتے وقت۔ "تم مجھے اپنی بیکری کی اپائنٹ کرلو۔ میں تمہارا سارا کام بالکل ٹھیک ٹھیک کیا کروں گی۔"

"خوش! مجھے پتا ہے، آسانوں سے بھی اونچے تمہارے معیار پر مگر بلیر چکھو دو تو اپنی اس خوشی پر پوری طرح خوش ہولو۔" اس کا کیریز اور انچائیوں کی طرف مسلسل پر داز کئے چلا جا رہا تھا اور ہر کامیابی پر جب وہ سوچتا کہ ابھی اپنے معیار سے وہ کافی نیچے ہے تو آواز اسے اس کے سامنے سے پنا کا احساس دلاتی، ابھی جو خوشی ملی ہے اس پر تو خوش ہولو۔ ہاں کل سے بھر بلیر یوں کی طرف اور تیز آواز شروع کر دیتا۔"

☆☆☆

آفاق جمال اس کی برقی کی رفتار پر حیران تھے۔ ان ہی کے کانٹیکس کو بہت خوبصورتی سے استعمال کر کے تھوڑے ہی وقت میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ انہیں لگتا کہ چند سالوں میں تو وہ انہیں پیچھے چھوڑ چھا جاکہاں سے کہاں پہنچا ہوا ہوگا۔ ان کے سہارے، ان ہی کی جیسا کہوگا پکڑ کر اس نے چٹنا شروع کیا تھا اور محض چند سالوں ہی میں وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ ان جیسا کہوگا کے بغیر اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکے۔

وہ آسانوں کو اپنے فائدے کے لئے اپنی ہولت سے استعمال کر لیا کرتا تھا کہ آفاق جمال جیسا شاندار بینکنگ کیرپیزر کئے والا انسان اس کی قابلیت اور ذہانت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا۔

وہ جائزہ جانتا، سبج اور ملنے کے پکڑ میں نہیں پڑتا تھا۔ ہاں مگر کام ہمیشہ اس طرح کرتا کہ وہ جائزہ اور سبج نظر آتا۔ اس کا کیریز و دیکھنے والوں کو فائدہ سے واضح نظر آتا اور وہ ہر لحاظ سے ایک ایماندار دیکر۔ آفاق جمال خود کو بہت ذہین چالاک سمجھتے تھے مگر وہ تو اس معاملے میں ان سے بھی آگے تھا۔ لوگ اس پر اعتبار کرتے اور وہ بڑی مہارت سے انہیں ڈبل کر اس کرتا۔

کبھی وہ انہیں دھوکہ دیتا تو وہ اسے اس کی اوقات یاد دلا کر اس سے سب کچھ چھین کر داکاں پاکستان نہیں بھیج سکتے تھے۔ وہ یہاں اپنی جڑیں مشہور کر چکا تھا۔ ان کے کانٹیکس اب ان سے زیادہ میر رضا کے کانٹیکس

تھے۔ وہ سدرہ سے اگر کبھی اپنے خدشات کا اظہار کرتے تھے تو وہ ان کی یہ بات مانتی نہیں تھی کہ میر کبھی اسے دھوکہ دے سکتا ہے۔

☆☆☆

"تم اپنے گھر کے لان کے ایک حصے میں صرف گلاب ہی گلاب لگا نہیں گے۔ سرخ، گلابی، سفید بہت سے رنگوں کے گلاب۔"

اس کے خوابوں کا وہ مگر جو میں سالوں بعد بھی وہ نہیں بنایا یا فقط ساڑھے چار سال کی مختصر مدت میں ہی چکا تھا۔ وہاں کی کٹس کٹش، وہاں کا انٹیریر ہر چیز، بھرتی تھی۔ ہر لحاظ سے اس کے معیار کے مطابق۔ بالکل انہیں ہونے چاہئیں۔ شیشے جیسے شیشے کے اور لان میں لگا لگانے والی کھاس بھی ایڈجسٹ ہوئی چاہئے۔ اس شاندار مکان میں ہر چیز شاندار تھی اور اس کے لان میں ڈھیر سارے گلاب بھی تھے۔ ایک قطعہ میں صرف گلاب ہی گلاب کھلے تھے جو اس نے خاص طور پر کبکڑا ہاں لگوائے تھے۔

"جس نے گلابوں کی بات کی تھی، جب اسے کوئی اہمیت نہیں دی تو اس کی خواہش کو اہمیت دینے کی بھی کیا ضرورت تھی؟" سبیل کے بعد جب وہ امریکہ سے پہلی بار اپنے گھر کو دیکھنے آیا اور اپنے اندر پیچھے اس دس سال کے پچھلے پرانے پکڑے سے پہنچنے لگے کی خوشی پر مسکرایا جب مسکراتے ہوئے اس نے گلابوں کے بارے میں سوچا تو اندر سے وہی ملامت کرنی آواز اس کی ساری مسکراہٹ جبین کر لے گی۔ وہ اپنے گھر کے ہر کونے میں غور اور خوشی کے ساتھ بھر پور تھا مگر کبھی خوشی اس موقع پر اسے ہونی چاہئے تھی۔ وہ اس سے کسوں دور تھی۔

ہر چیز اس کے خوابوں کے عین مطابق تھی اور وہ اپنے خواب کی تعبیر میں کھڑا خوشی کو ڈھونڈ رہا تھا؟ یہ کھو تو اس کی زندگی کا سب سے یادگار گھر تھا۔ آج جب یہ گھر اس کی دہڑس میں ہے تو وہ پس کھڑا ہے جیسے یہ گھر زندگی کے دوسرے عام سے گھروں جیسا ہی تو ہے۔

سدرہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ اس گھر کو دیکھ کر خوش تھی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا گھر نہیں تھا۔ ہاں یہ اس کے شوہر کا پہلا ذاتی عالی شان گھر ضرور تھا مگر وہ اس طرح کیسے خوش ہو سکتی تھی جسے وہ ہوتی جس کے ساتھ مل کر اس نے اس گھر کا خواب دیکھا تھا چوسا گھر کے حصول کے لئے اس کے ساتھ جدوجہد میں پوری طرین شریک تھی جو ہمیشہ ایک گھر کے لئے تڑپتی تھی اور جس نے "اپنا ایک شاندار سا گھر ہو" والا اس کا خواب بڑی بھجوں سے اپنی جگہوں پر سجایا تھا۔ وہ سدرہ کے ساتھ اپنے بیڑم میں داخل ہوا تھا۔

"اگر کسی دن کو مجھ سے زیادہ ذہین لڑکی ملے گی تو میں اور میرا خیر تو مند دیکھتے رہ جائیں گے۔" ہاں، وہ اور اس کا خیر ہی تو دیکھتے رہ گئے تھے۔ آج اس بیڑم میں وہ ایک دوسری لڑکی کو اپنی بیوی کی حیثیت سے ساتھ لے کر آتا تھا۔

"میں اپنے گھر کو اگر نہیں کرنا چاہتی۔ میں اپنے گھر کو اگر نہیں چھوڑنا چاہتی ہوں۔"

"اپنا گھر؟" تھکے تھکے سے وہ اپنا گھر کا لفظ استعمال کرتی تھی۔ وہ گھر جو ان دنوں کے لئے سے گھر بننا تھا۔

"تم جیسا کہو گے میں دینا کروں گی۔ میں شام میں کوئی اور جاہ کرلوں گی اور سڑے کو کبھی کچھ کر لیا کروں گی۔ میں اب جنہیں بالکل بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔"

معالے میں اسے کس قدر زچ کر دینے کی اہلیت رکھتی تھی وہ جانتا تھا۔ فی الحال اس نے اہل کے جانے پر کسی درمغل کا اٹھائیں کیا۔

دوسرے دن کو چھین لے گا، چاہے جس بھی طرح۔" ہمارا کا دل تو اتنا پیارا ہے کہ وہ اہل کے لیے سدرہ سے بھی اچھی ماں ثابت ہوگی۔ سدرہ کوئی کیا ہے، گوئیں کہ دم و کرم پر تو چھوڑ رکھا ہے، اس نے بچی کو۔ ہمارا تو اسے بہت پیار ہے، بڑے ناز و محبت میں پالے گی۔" اس نے ہمارے بارے میں بہت یقین سے سوچا۔

وہ ہمارے پاس جاے گا۔ ہو سکتا ہے وہ خود ہی بہت ناشائس کا اٹھیا کرے، وہ اسے مائے لگا۔ وہ اس سے معافی بھی مانگ لے گا۔ اب جب اس کے پاس دولت، مرتبہ، مقام ہے کچھ ہے تو بس صرف ہمارے ہی کی کمی ہے۔ یہی دور ہو جائے پھر وہ پورے دل سے خوش ہوگا۔

ہمارا اور وہ دونوں مل کر اپنے خوابوں کے گھر میں رہیں گے اور ہاں اہل بھی تو۔ اہل بھی ان دونوں کے ساتھ رہے گی۔ وہ اپنی بچی کو سدرہ کے پاس تو کسی قیمت پر نہیں چھوڑے گا۔ وہ سدرہ کے اپنی زندگی سے نکلنے کے فوراً بعد ہی ہمارے پاس چلا جانا چاہتا تھا۔

گھر اس کے جانے کے بعد اگلے تین ماہ اسے سب امریکہ میں گزارنے پر پڑے کہ اپنے پرورشنے کے حوالے سے کچھ بہت اہم کام نمٹانے کے ساتھ ساتھ اسے سولہ فروری کا بھی انتظار تھا۔ وہ ہمارے پاس واپس سولہ فروری کے دن جانا چاہتا تھا۔ وہ یہ جان کر کتنی خوش ہوگی کہ میرے اس دن کو اسے اہتمام سے یاد رکھا ہوا ہے۔

ان تین ماہ میں اس نے سدرہ سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا، ہاں اہل سے ضرور وہ فون پر بات کیا کرتا تھا۔ آفاق جمال نے اسے سدرہ کے کراچی پیکیج کے ایک دن بعد ہی فون کیا تھا، وہ یقیناً اسے خوب کھری کھری ستا اور اسے دھمکانا چاہتے تھے۔ گھر اس نے ان کی فون کا اہل نہ پائے تھے نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا جب تک سدرہ اور اس کی شادی برقرار ہے، آفاق جمال مصلحتاً خاموش رہیں گے۔ جس روز اس نے سدرہ کو طلاق دے دی پھر وہ اپنے تاجہ و باد کرنے کے لیے اپنے سارے وسائل، تمام اثرو و سوغ اور ساری طاقت استعمال کر لائیں گے۔ اسے آفاق جمال کی طاقت کا بالکل ٹھیک ٹھاک اندازہ تھا اور ان کی طاقت کے جواب میں اپنی طاقت کا بھی۔ اس بڑے اور دشمن شیرے متا پیے کی جو صورت حال مغرب پر اسے درپیش آنے والی تھی وہ اس کے لیے خود کو بہت پہلے ہی سے بہت اچھی طرح تیار کر چکا تھا۔ وہ آفاق جمال سے بالکل خاص غفبت تھا۔

جس روز وہ کراچی جانے کے لیے جہاز میں سوار ہوا، اس کا دل اس کو میر عاشق کی طرح اچھٹا اور چھٹائیں مارنے لگا جو ایک عمر کی جدائی کے بعد اپنی محبوب سے ملنے والا ہو۔

☆☆☆

شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے جب ہمارا کی سیکریٹری اس کے پاس آئی۔

"سرا ہمارا سیم کا ابھی فون آیا تھا۔ وہ میٹنگ ختم ہونے کے بعد آؤں واپس نہیں آئیں گی۔" وہ پچھلے چار گھنٹوں سے اس کے کیمین میں بیٹھا اس کی واپسی کا منتظر تھا۔

"اس نے جو باتیں کچھ لیلے والے انداز میں مروتیلا دیا مگر کرسی پر سے اٹھائیں۔" فخری اوقات ختم ہونے

پر اس کی سیکریٹری اب یقیناً اپنے گھر روانہ کی گئی تھی۔ جب سیکریٹری کی اپنی باس سے فون پر بات ہوئی تھی تو پھر اس نے یقیناً اسے یہ بھی بتایا ہوگا کہ "سیم" اور "جوا" سب سے آپ سے ملنے کے لیے آئے بیٹھے ہیں، وہ ابھی بھی آپ کے کٹن میں موجود ہیں۔" اور یہ بات بھی یقینی نظر آتی تھی کہ ہمارے اپنی سیکریٹری کو میر کے حلقے کچھ دہلیات جاری نہیں کی تھیں، اگر کی ہو تو سیکریٹری میر کو اس کی مرضی پر یہاں بیٹھا چھوڑ کر بھی آؤں سے جاتی۔ وہ میر کو اپنی جگہ جم کر بیٹھا دیکھ کر شائے اپکانی کیمین سے باہر چلی گئیں۔

ہمارا بس آئی۔ اسے لازمی طور پر آتا ہے۔ اس سے گفتگو کو باہر چھوڑ کر وہ بھی اپنے گھر نہیں جاسکتی۔ وہ ہمارے بات سے بغیر یہاں سے ہرگز نہیں جاتے گا۔

گود یہ توقع ہے کہ یہاں نہیں آتا کہ ہمارا اس کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرے گی۔ لیکن اگر وہ ایسا کر رہی تھی تو وہ اس صورتحال کا فائدہ چیشانی سے سامنا کرے گی۔ کتنی دیر کی ہوئی اس کی ناشائس؟ وہ اس سے آئی ہے خفاشا محبت کرتی ہے کہ زیادہ دیر تک اپنی ناشائس پر قائم رہی نہیں پائے گی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، آؤں میں لوگوں کا شور اور کاموں کی گہما گہما فتن ہوئی جلی جارہی تھی۔ سوسائٹے بچے تو آؤں میں مکمل سناٹا پھیل چکا تھا۔

شاہد اب اکا کا کوئی لوگ وہاں موجود تھے۔

ہمارا کا کیمین مکمل اندیرے میں ڈوبا تھا۔ وہ اسی اندیرے پر بیٹھا رہا۔ اس نے اٹھ کر ٹیبل لائٹ آن کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ساڑھے سات بجے اسے تدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی گولیڈور میں چل رہا تھا۔ وہ اس طرف بڑھتے ایک ایک قدم کو اپنے دل سے ہم آہنگ رہا تھا۔ کیونکہ آ رہا تھا۔ اس کا دل جانتا تھا۔ چند منٹوں بعد اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ اندر قدم رکھنے ہی اس نے سوچے ہوئے پر تیزی سے ہاتھ چلائے تمام لائٹس آن کر دی تھیں۔ یک دم ہی کر رہی رہی تھی نہ کیا اور وہ اسے گھنٹوں سے اندیرے میں بیٹھے رہنے کے سبب یک دم روشنی ہو جانے پر فوراً اپنی آنکھوں کو سمجھ سے کھول نہیں پائیں۔

"آپ ابھی کیمین میں ہیں؟" میر کو معلوم تھا کہ یہ ایک معنوی حیرت ہے، وہ جانتی تھی کہ وہ ابھی بھی یہاں موجود ہے تب ہی تو ساڑھے سات بجے اپنے آؤں واپس آئی تھی۔ وہ ابھی کھول کھلے سے قائل ہوئے ہی فوراً کرسی پر سے کھڑا ہوا اور ہمارے کیمین سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"ہمارا تم مجھے جو مراد آیا جانتی ہو، وہ میرے مجھے معاف کر دو۔" وہ طنز سے لگا ہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

"تم سے دور جا کر مجھے بتا چلا کرتے ہو؟" وہ جانتا میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ جس طرح تم مجھ سے محبت کرتی ہو، اسی طرح تم بھی مجھ سے محبت کرتا ہو، صرف تم سے۔"

"اور یہ محبت کتنے نوس تک برقرار رہے گی؟" کتنے دنوں بعد وہ دن آئے گا جب تم مجھے بتاؤ گے کہ چوک تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو، اس لیے کسی اور کے پاس جا رہے ہو۔" وہ پردہ طے سے براہ راست غصے کی طرف آئی تھی۔ کم از کم اس نے اسے "تم" کو کہا تھا۔ اس کے لیے اس وقت بھی بہت تھا۔

"اب ابھی نہیں ہوگا ہمارا تم میرا اختیار کر دو۔"

"انتہا کر دو تمہارا؟ اس شخص کا جس نے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی اور میرے اوپر سے

آسان سمجھ کر لیا۔ میں تمہیں کتنی بے وقوف نظر آتی ہوں میرا رضا؟ کتنی؟ تم پر وہاب میں مرتے دم تک بھی اعتبار نہیں کروں گی۔ کلثوم کتنی ہے اور بالکل جاک کتنی ہے کہ لوگ کچھ عرصہ کوئی جانور پالیں تو اس سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ کہیں جانے لگیں تو اپنے پالتو جانور رکھوالی کے لئے کسی عزیز یا دوست کے پاس چھوڑ جاتے ہیں۔ تمہاری لگا ہوں میں تو میری پالتو جانور جتنی اہمیت بھی نہیں تھی۔“

وہاب اس پر چلا رہی تھی۔ جس لمحے میں اس نے کبھی میرے بات نہیں کی تھی، اس میں کر رہی تھی۔

”میں رات بھٹک گیا تھا! ما! میرے قدم بھٹک گئے تھے مگر رات بھٹکنے سے کیا ہوتا ہے ما! رات بھٹک کر بھی میں آیا تو تمہارے ہی پاس ہوں۔ میری منزل تم ہی ما۔“

”تم اور غلط فیصلہ کرو گے؟ تمہارا کوئی فیصلہ غلط نہیں ہوتا میرا رضا! تم جیسا شاطر اور چالاک انسان ہر کام سوچ سمجھ کر اور باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ کرتا ہے۔ مجھ سے شادی پلاننگ کر کے کی، مجھے چھوڑا پلاننگ کرنے کے بعد اور اب واپس آئے ہو تو کچھ پلان کرنے کے بعد ہی آئے ہو گے تم اور رات سے بھٹکے ہو؟“

”ما! تم میرا یقین کیوں نہیں کر رہی ہو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ بالکل سچی محبت۔ اب سے نہیں بلکہ جب ہم ساتھ تھے تب سے۔ مجھے خود اپنی محبت کی مثالوں کا ادراک نہیں تھا۔“

”تم کسی سے محبت نہیں کرتے میرا رضا! تم کسی سے محبت کر رہی نہیں تھکے۔ تم ہر کام اپنا فائدہ نقصان دیکھ کر کرتے ہو۔ انسانوں کی اہمیت تمہاری لگا ہوں میں ہے جان اور خیر چیزوں سے زیادہ نہیں۔ اپنے سوا تم کسی سے محبت نہیں کرتے۔“ وہاب اس کے اکتانہ اعزاز کے جواب میں تحاروت اور خضر سے بولی۔

”ما! جو وقت ہم نے ساتھ گزارا تھا، کیا اس وقت کا کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں جسے یاد کر کے تمہیں یہ احساس ہو کہ میں سب کچھ ہی تم سے محبت کرتا تھا؟ ہماری زندگی کتنی خوب صورت تھی ما!۔“ وہ دمٹ بھرے انداز میں اسے پرانے وقتوں کی یاد دلانے لگا۔

”ہم نے زندگی کب شینر کی تھی میرا رضا! ہم نے تو صرف ایک اپارٹمنٹ شینر کیا تھا۔ پھر جب اس اپارٹمنٹ شینر کرنے والی کا نہیں ضرورت دہری تو تم کہیں اور شفٹ ہو گئے۔“ وہاب اس کی آنکھوں میں دیکھ کر غرائی۔ ”ہم یورپ یا امریکہ میں نہیں رہتے، اس لئے نکاح کے دو بیول پر ماحول تھے تو درہمہاری نظر میں ہمارے رہنے کی حقیقت یہی کہ میں تمہارے ساتھ تمہارا اپارٹمنٹ شینر کرتی تھی، تمہارا ہر شینر کرتی تھی، تمہارا بیڈ شینر کرتی تھی۔ دن میں تمہاری فلیٹ میٹ اور رات میں میری حیثیت ایک میسرین کی ہو جاتی تھی۔ یہی کی حیثیت تو تم نے مجھے کبھی دی نہیں۔“ تم میری ہی تھیں ما!۔ خدا گواہ ہے میں نے سچے دل سے تمہیں اپنی یہی کی حیثیت دی تھی۔“

”یہی کی حیثیت؟ یہی کو اپنے پیچے کی بان سے نہیں نہیں روکا جاتا میرا رضا! ما! میسرین کو ضرور روکا جاتا ہے۔“

”ما! خدا کے لئے بس کرو۔ مت استعمال کرو اپنے لئے اسے کھلا لفظ۔“ اس کے لفظ دل پر ایسی چوٹ لگا رہے تھے کہ وہ چلا تو اٹھا تھا۔ بدل ہی گئی تھی وہ۔ کتنی زبان استعمال کر رہی تھی۔

”تمہاری یہی وہ ہے جو تمہاری بیٹی کی ماں ہے اور جسے چھوڑ کر تم مجھ سے نہجانے کیا لینے آئے ہو۔ خصلت

ہے شاید یہ مردوں کی، ایک عورت پر اکتفا کر کے نہیں بیٹھ سکتے۔“ وہ اس سے زیادہ تیز آواز میں چلائی۔

”یہی میں ہزار بار بیان ہوں تب بھی ظالم سے ظالم شوہر تک اسے چھوڑنے وقت یہ ضرور سوچنا ہوگا کہ یہ اکیلی ہے۔ میرے بغیر یہ تمہاری کہاں کہاں جائے گی؟ کیسے جینے گی؟ پروا کی کتنی تھی تم نے میری؟ میری عزت اور آدمی کی؟ پروا کرتے کیوں کیوں، میں تمہاری بیوی تھی جب۔ آج کس دھڑائی سے میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ میں تمہاری دیکھ دیکھ کر بھتا حیران ہوں کہ تم۔“

وہاب نے کسی سے اس کی سمت دیکھے چلا جا رہا تھا۔ وہ اس سے نفرت میں ابھی انتہاؤں تک پہنچ چکی ہوگی، ایسا تو اس کے دم نگاہ میں بھی نہیں تھا۔ اس کی جوتی محبت تھی، کبھی تھی، جراتی محبت کے بدلے میں اس سے اور کچھ تو کیا محبت بھی نہیں باقی تھی۔ پھر وہ ختم کیسے ہو سکتی؟

”تمہیں مجھ سے محبت ہے یاں ما! میری خاطر تم اپنی اس محبت کی خاطر ہی مجھے صاف کر دو۔“ وہ ایک قدم مزید آگے بڑھا کہ اس کے بالکل نزدیک ہو گیا۔ وہ فوراً پیچھے ہٹتی۔ اس نے اپنے قدم ایک سینکڑہ میں پیچھے ہٹائے۔ اس کے قریب ہونے کا وہ ایک سینکڑہ بھی نہیں لگا تھا۔ وہ وہاں وہ اس سے اتنے ہی فاصلے پر کھڑی ہو گئی تھی۔

”محبت تو کیا، میرے دل میں تم جیسے مادہ پرست، موقع پرست، دھوکے باز اور گھٹیا انسان کے لئے کسے سے کوئی جگہ نہیں ہے۔“

”جموٹ بولی ہو کر۔“ وہ صفے سے چلا ہوا۔ ”جموٹ ہے یہ ما! ہر اسرار جموٹ۔ میں تمہارے اس جموٹ کو کبھی نہیں مانوں گا۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت نہ رہی ہوتی تو تم اتنے سارے سارے سبکوں اس رہنے کو چرا دیتے۔ یہی تم فرمت میں مجھ سے سلاطین کا مطالعہ کر کے انکا ادراک میرا تعلق قسم کر رہتی۔ یوں اتنے برسوں سے تمہارا زندگی نگرار رہی میں۔“

”میرے دل میں تمہارے لئے محبت کا تو کیا نفرت کا بندہ بھی نہیں ہے میرا رضا! جذبات انسانوں کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ تم جیسے جانوروں کے لئے نہیں۔ میرے دل میں تمہارے لئے کوئی بندہ نہیں ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر خوف و خطر بولی۔

”میں ابھی بھی نہیں مانوں گا تمہارا جموٹ۔ اگر تم ایسا ہی سوچتی ہو تو کبھی مجھ سے سلاطین کا کیوں نہیں کہا؟

کیوں ہمارے رہنے کو چرا دینے یا یاد ہے یہ رشتہ میں نے تمہاری خواہش پر چرا رہنے دیا تھا۔“

”وہ اس نے جا کہ جب تم آسمان تک کی بلندیوں کی سر کرنے کے بعد واپس زمین پر میرے پاس آؤ گی۔ انہیں خوش فہمیوں سمیت تو میں تمہیں تمہارے منہ پر درکسوں، بالکل اسی طرح دھکار سکوں جیسے تم نے مجھے دھکارا تھا۔ کیا اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا تھا مجھے تم سے؟“

وہ بولوں پر سچا مسکراہٹ لے کر استہزائیہ انداز میں زور سے فسمی۔

”روہونا کیا گناہ رہا ہے میرا رضا؟“

”ما! مجھے صاف کر دو جلیز۔ تمہیں کیا لگتا ہے مجھے انہی غلطیوں کا احساس نہیں؟ صفے میں ایسا بائیں مت کھو جو تمہارا دل میرے لئے محسوس بھی نہیں کرتا۔ تمہاری محبت کی شدت سے کیا میں واقف نہیں؟ میری محبت میں کوئی کمی ہو سکتی ہے مگر تم جو محبت مجھ سے کرتی ہو وہ بالکل سچی اور کبھی نہ ختم ہونے والی ہے، یہ میں ابھی طرح جانتا ہوں۔“

وہ بھرندم بڑھا کر اس کے نزدیک ہوا اور آہستگی سے اس کے ہاتھوں کے اوپر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی ہلکی سی نمی تیرنے لگی تھی۔ اس لڑکی کی بگمائی اور اس کی نفرتیں دل کی طور سے اس نے بہت نفرت بھرے انداز میں فوراً اپنے ہاتھ پیچھے کئے۔

”جین تم بہت پہلے کھو چکے ہو میرا رضا! اس نے ہلکی الفاظ سے تنبیہ کی۔ اس کے چہرے پر بے ساختہ غصہ تھا۔
 ”ہاں تم۔“ وہ اپنی آنکھوں کی کوئی کونہ کرکھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے تنبیہ کی بات کاٹ دی۔
 ”میں تم سے محبت نہیں کرتی اور تم سے طلاق چاہتی ہوں اور اگر تم جیسا میری کئی بات کا یقین نہیں تو محبت میں ابھی دے دیتی ہوں۔“ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپڑے پر وہ تیز رفتاری سے کوئی ٹبر ملانے لگی۔ وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ اس کی طرف دیکھ جا رہا تھا۔ وہ کیا کرنے جا رہی تھی؟ وہ کسے کال کر رہی تھی؟

”کیونکہ تازہ! میں ہالہ بول رہی ہوں۔“

حسیر بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ دونوں پر کبہ رہی تھی۔
 ”تازہ! تم نے آٹھ نو ماہ کی شادی کا جو پر پوزل میرے سامنے رکھا تھا، وہ مجھے قبول ہے۔ میں تم سے شادی کے لئے تیار ہوں۔“

جس پہاڑی چوٹی پر وہ بڑے فخر سے، سرفرازی اور کامرانی سے سر کشاڑا تھا، اس پر اسے کسی نے بہت زور سے دھکا دیا تھا۔ وہ لڑھکا ہوا پیچے جا رہا تھا۔ پیچے اور پیچے ایک گہرائی کی طرف۔
 ”میں چاہتی ہوں، ہماری شادی سادگی سے ہو اور جلدی ہو۔ تم اپنے ماں باپ سے ہمارے رشتے کی بات کرو۔“
 اس کے کان اس مانوس آواز اور اپنی لہجے کو سن ضرور رہے تھے، پچکان نہیں پارے تھے۔ مگر کھانسی کے اندر بھی گلوں کو کالنے اور دل کو چیرے پر بے رحم اور مساک لفظ اس کی ساتھیوں کی رہی تھیں۔
 ”آکیا اب یقین میری بات کا یا محبت کے طور پر تمہیں اپنی شادی کا دعوت نامہ دیتا ہے گا۔“ وہ فون پر بات ختم کرنے کے بعد اس کی طرف نظر اور حقارت سے دیکھنے لگی۔

”میں فائز عید سے شادی کر رہی ہوں میرا رضا! اور تم سے جو واحد چیز میں چاہتی ہوں، وہ طلاق ہے۔ امید کرتی ہوں تم مجھے شعل کی طرف جانے پر مجبور نہیں کرو گے۔“

اسے لگ رہا تھا اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے ہیں۔ اپنا چہرہ، گردن اور گیان سب اسے جھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ ایسا کب ہوا؟ آخر کب؟ اب وہ لڑکی محبت کرتے کرتے اس سے نفرت کرنے لگی، زندگی کی بازی ہار جانے والا شخص اب کیسے؟ وہ خاموش تھا۔ وہ اپنے کانوں سے بندے، ہینکس اتارنے لگی اور سب سے آخر میں اپنی انگلی میں پہنی انگلی اس نے پیچھے کر اتاری۔ وہ تینوں چیزیں اس کی غمی میں تھیں۔

”آج میں تمہارا اور اپنا ہر شے ختم کر رہی ہوں۔ ماں، احمق اور حیرانہ، جس کہانی کے دو کردار تھے، وہ کہانی آج ختم ہوئی۔“

اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے کیا اور اس کی کھلی ہر تھلی پر وہ تینوں زیرو ڈال دیئے، جو کبھی اس نے بہت محبت سے اسے اپنے ہاتھوں سے پہنا ہے تھے اور جنہیں وہ کبھی خود سے جدا نہیں کرتی تھی۔

کہانی ختم ہوگئی؟ کیا واقعی کہانی اس طرح ختم ہو جاتی ہے؟ بس ایک ہلکی سی جھک جھک ختم؟
 ”جب میں تم سے ہر شے ختم کر رہی ہوں تو پھر اب مجھے، تمہیں کچھ کہنے کا کوئی حق تو نہیں ہے۔ پھر بھی بغیر کسی حق کے تمہیں ایک نصیحت کرنا چاہتی ہوں۔ تم دنیا میں کسی سے محبت نہیں کر سکتے، تم کسی سے نہیں سکتے، سوائے اپنے بھراپائی بنی کے ساتھ وہ سلوک مت کرنا جو دوسروں کے ساتھ کرتے ہو۔ تم کسی کے نہیں ہوئے، تم ازم اپنی بنی کے تو ہو جاؤ۔ ورنہ جس لہجے میں آج میں تم سے بات کر رہی ہوں، اسی میں آج سے میں سال بعد تمہاری بنی کر کے گی۔ پھر کیا کرو گے؟ پھر کیا کرنا جاؤ گے؟ پھر تو تم مرا خرا کر زندہ رہنے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔“
 وہ اس کے سامنے سے ہٹتی اور پردہ قدرتوں سے چلتی اپنی ہیز کے قریب جا کر کھڑی ہوگئی۔ ”خدا حافظ میرا رضا! ہمیشہ کے لئے۔“

دروازے اور حیر کے درمیان وہ کھڑی تھی۔ درمیان سے ہٹ کر اس نے اسے جانے کا راستہ دے دیا تھا۔ مرا خرا کر باقاعدا انداز میں کھڑی اور اسے اپنی زندگی سے نکل جانے کو کہہ رہی تھی۔ نہ اس کے چہرے پر کوئی رنج و مال تھا نہ آنکھوں میں کوئی آنسو۔ وہ حیر اور کھانسی کے آنسو بچکانے بغیر اپنی زندگی سے وداع کر رہی تھی۔

قلب منظر گھر بھر کے لئے

اس کی رخصت کا بیگم درپیش ہے

دھل شیریں سے گل رنگ ماحول میں

اک کہانی کو انجام درپیش ہے

آخری بار میں بھر کے میں دیکھ لوں

کیا خبر بھر بھی میں نہیں دیکھ لوں

شام فردا خیر بار ہو کہ نہ ہو

کس کو معلوم پھر گل گلین نہ گلین

لہکی ساعت کہاں، ایسا منظر کہاں

رنگ ہی رنگ ہے روپ ہی روپ ہے

جھاؤں آج کل کی لوں کھڑی وہ گھڑی

پھر سوز و غم ہی وہو پ ہے

اس کے اور ماں کے سچ جو چیز حائل ہو رہی تھی وہ اس کے آنسو تھے۔ وہ اسے دیکھ لیتا چاہتا تھا، بہت اچھی طرح مگر اس کے آنسو اس کے چہرے کو دھندلا کر کے دکھا رہے تھے۔

”اچھا میں چلا جا ہوں۔ پھر کبھی تمہاری زندگی میں۔ آؤں گا بھی نہیں۔ بس ایک بار، صرف ایک بار آخری بار مجھے ایک پیار بھرے مانوس لہجے میں جی جی کہہ دو اور توں کچھ بھی نہیں مانگ رہا تم سے۔ صرف ایک چوڑا سا لفظ ہا!“

ای پیار سے صرف ایک آخری بار مجھے جی کہہ دو۔“

اس کے ہونٹ بے ضرور تھے، مگر ان سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی اور اگر اس کے منہ سے یہ منت بھری آواز

نکل بھی جاتی تو کیا وہ اس کی یہ خواہش پوری کرتی؟ اس پر سے لگا ہوا چکر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی زندگی کی بازی ہار کر بیٹھا ہے جا رہا تھا۔

اس نے دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ کو آگے بڑھایا تو اس کا دل کسی جھوٹے سے بچنے کی طرح جھٹکنا شروع کر دے گا۔

”مجھے نہیں جانا یہاں ہے۔“ اس نے دروازے کو کھول لیا اور ہاتھ قدم رکھنے لگا۔

”مجھے چھوڑ کر مت جاؤ حوی!“ وہ خوشی سے جھوٹا سا مسخ بہت تیزی سے پلٹا۔

مکھم کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہیز کے پاس اس سرد اور ساٹ انداز میں مکڑی خوشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چلنے جانے کی منتظر۔ وہ پھر دروازے کی طرف پلٹا اور ایک دم اسے یوں لگا جیسے وہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آگئی ہے۔ اس کے بالکل پیچھے آکر مکڑی ہو گئی ہے۔

”میں فراق کر رہی تھی حوی! تم نے مجھے اسے دکھائے، اتنا رویا کیا۔ میں تمہیں تھوڑا سا سمجھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ چلو مجھ زندگی کو وہیں سے شروع کرتے ہیں، جہاں پر ہم الگ ہوئے تھے۔“

اس بار وہ پلٹا نہیں۔ مکھم کر اس کی طرف دیکھا نہیں۔ یہ صرف وابہ ہے۔ یہ حقیقت تو نہیں سکتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اسے اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لئے نکال رہی ہے۔

”پٹنی اپنی دوسری حوی!“ وہ اس کے گلے میں بائیں ڈال کر سکر رہی تھی۔

اور اسے ہاں آج تو سولہ فردی تھی۔ اسے یاد کیوں نہیں رہا۔

”ہاں واقعی یہ تو میری غلطی ہے۔ مجھے یاد دلانا چاہیے تھا۔“ وہ شہر ات سے ٹھکھلکائی تھی۔ اور حیرت رشا کے لبوں سے نکلی آہیں اور سسکیاں لگتی تھیں۔

ان کی زندگی میں سب کچھ تھا۔ پھر ظلم ہوا کہاں سے شروع ہوا تھا؟ اس کی اپنی وجہ ہے، اس کی طبع، اس کی حس، اس کا لالچ۔ آسان بچنے جانے کی اس کی خواہش۔

اب کیوں نہیں ہوتے خوش؟ تو کیا وہ سب کچھ جو زندگی سے اپنے لئے پانا چاہتے تھے۔ کیا ہوا جو اس لڑکی کو کھو دیا جس کی بغیر زندگی کا کوئی ٹپا کچھ سے نہیں بچا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ زندگی کے پچھلے سارے پانچ سالوں کو حرفِ طلق کی طرح مٹا دے۔

تسمیر کی اس گرم دہر جب وہ اخبار اپنے سامنے پھیلائے۔ چہا تھا اور وہ اس کے بالوں میں تیل کی باش کر رہی تھی۔ وہ نکلتا تھا کہ ہالہ سے کیسے بات کرے۔ کاش وہ اپنی بلر سے مل جائے۔ اس بار وہ ہالہ سے سدرہ کے بارے میں کچھ نہ کہے گا۔ اب کی بار وہ اس دن کچھ لکھ نہیں ہونے دے گا اور سدرہ آقا کا لکھے روز آفس میں صاف صاف بتا دے گا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ زندگی مجھے ایک موقع دے دو۔

زندگی؟ میں ایک اور موقع کیوں نہیں دیتی؟

انہی آنسو بھری لگاؤوں سے اسے آخری بار دیکھ لینے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا۔ یہ۔۔۔ سچ اس پر ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا تھا۔

”کیا آج چاند گرہن ہے یا یہ لاموں کی رات ہے؟“ وہ کھلے آسمان کے نیچے کھڑا اس عمارت کو اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جس میں سے وہ ابھی باہر نکلا تھا۔

”الہی تاریکی، اچھا تمہارا اندھیرا اور اداسی، نفسا کی جیسے کسی کی موت پر لوح پر مدہ رہی ہیں۔ کون مرا ہے آج؟“ بہت دیر تک وہاں کھڑے ہو کر روتے رہنے کے بعد وہ اپنی گاڑی کے پاس آگیا۔

”تم نے آج کبلی بارہم ہے کچھ مانگا ہے۔ ہمارے اسے برسوں کے تعلق میں کبلی بارہم نہیں پائیں نہیں کر دوں گا۔ جو تم مجھ سے چاہتی ہو وہ میں تمہیں دے دوں گا لیکن ہا! اسے برسوں میں آکر اپنی کبلی بارہم نے مجھ سے کچھ مانگا ہے ہی لیا تھا تو جدائی کیوں؟ میرا ساتھ کیوں نہیں؟“ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے بہت گھٹت خود وہ انداز میں گاڑی شارت کر دی۔

وہ راتے ملے کے گھر کسی طرح پہنچا، اسے بالکل پتا نہیں تھا۔ اسے بس یہ پتا چل رہا تھا کہ زندگی میں دور دور تک اندھیرا ہے۔ زندگی میں اتنی بھاگ دوڑ اتنی مشقت، اتنی افراتفری، اتنی چالاکیاں، اتنی ہوشیاری، اتنی دغا بازی کس کے لئے؟ آخر کس کے لئے؟ یہ جالیٹان مقبرہ نوے اور آٹھین سننے کے لئے؟ چہا تھا کروٹنے کے لئے؟ وہ ایک بار پھر ضبط ہو کھو جاتا تھا۔ مضیاں سمجھ کر وہ زمین پر جھٹٹا چلا گیا۔ وہ چھوٹی کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اس جالیٹان محل میں آج وہ جاتا تھا۔ اس کے آنسو صاف کرنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ اس کا غم باٹنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ آج جب اپنے دل پر چوٹ لگی تھی تو احساس ہوا تھا کہ جن دلوں کو اس نے توڑا تھا، جن لوگوں کو اس کی وجہ سے ٹکھنیں پٹنی تھیں انہیں بھی ایسا ہی درد ہوتا ہوگا، اسے صرف اس لڑکی کا ساتھ چاہیے۔ اس صرف ہالہ اصل چاہیے پورج میں کوئی گاڑی آکر کرکری تھی۔ روتے روتے اس نے سرفراہ کر اس طرف دیکھا۔ اہل گاڑی سے اتر رہی تھی۔ جب وہ پاکستان آیا تھا، سدرہ، اہل کو ڈرامیڈ کے ساتھ اس سے ملنے کے لئے پہنچ دیا کرتی تھی۔ وہ اہل کو میر سے ملنے سے نہیں روکتی تھی۔

اہل اس لان میں دیکھ کر دیا نہ دار بھاگتی ہوئی اس کی طرف آگئی اور اس کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔ ”ہیلو پاپا!“ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اسے سلام کی جگہ بولو کہنے پر فکڑن ضرور۔ ان لوگوں میں اہل کا آجانا کیا جان فزا گا تھا۔ اس ممکن اور جس میں جیسے کہیں سے تازہ ہوا کا جھوٹا آگیا تھا۔ میر نے بچی کے ماتھے پر بچا کر کیا۔

”پاپا! آپ دور رہے ہیں؟“ اہل نے اس کی غمزدی پر اٹھ لگے ہوئے مصورت سے پوچھا۔

”ایک غمزدی تھی بہت اچھی، بہت پیار کرنے والی۔ آج پاپائے اسے کھو دیا ہے جیٹا۔“ اسے اپنے ساتھ لگا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا۔

وہ اپنے ننھے سے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف ضرور کر رہی تھی مگر اس کی کچھ نہیں نہ باپ کی بات آتی تھی اور اس کا روتا۔

”آج اس نے مجھے میری بہت بد صورت چھل دکھائی ہے اہل! بہت بد صورت بہت کرہ۔ میں ہاتل میں اتر رہا ہوں۔ اپنی کس کس لٹلی کو یاد کروں؟ کس کس پر روؤں؟“ وہ چار سال کی بچی کیسے سمجھی ان لفظوں کا ملبوم جو باپ کو کوئی تمل کوئی دلا سدر سے پاتی۔

”تم کسی کے نہیں ہوئے، کم از کم اپنی بیٹی کے تو ہو جاؤ۔ اپنی بیٹی کے ساتھ وہ سلوک مت کرنا جو دروسوں کے ساتھ کرتے ہو۔“ کچھ دیر پہلے کی بات یاد آچک اس کی ہاستوں میں کھینچی، اس نے کھینچ کر اہل کو اپنے بازوؤں میں چھپایا اور اس کے بالوں پر دالہ انداز میں چار کرے لگا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو، میں صرف خود سے محبت کرتا ہوں۔ صرف اپنے بارے میں سوچتا ہوں۔ دوسروں کے احساسات تو میرے لئے کچھ معنی رکھتے ہی نہیں۔ تمہارے پاس دواہن کیا تو بھی صرف اپنی خوشی کا سوچا اور اہل اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ اسے اس کی ماں سے بچھن لوں گا۔ اپنے سپانہ لانے اعمال میں ایک اور کچھ بھگواؤں گا۔ ایک ماں سے اس کی بیٹی کو بچھن کر تمہارے پاس دواہن کیا تو اس عورت کے بارے میں ایک ہلکے نمونہ سوچا۔ جو میری بیوی، میری بیٹی کی ماں ہے، اپنی محبت بھینسی تھی تو اعلیٰ طرزی اور دوست قلبی بھی بھینسی تھی۔ خود غرضی اور محبت ایک ہی دل میں ساتھ ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں؟“

وہ اٹھ کر سیدھا کھڑا ہوا اہل کو دھمکی اٹھالیا۔ وہ اس کے رخساروں پر پیار کر رہا تھا۔

اللہ نے اسے ایک بھٹوں سے بھرا گھر اور ایک جان بچھاوڑ والی بیوی دی تھی۔ اس کی اوقات سے بہت زیادہ۔ وہی ناشرہ، لکھا، اللہ کی عطیوں کی قدر نہ کر سکا۔ گزرتے وقت کے ساتھ شاید باپ بھی اسے معاف کر دے مگر وہ خود اپنے آپ کو کیسے معاف کر پائے گا؟ اس کے دل کی عدالت اسے مجرم قرار دے چکی تھی۔ اب تو ساری زندگی ہنساتوں اور بچھتاؤں کے ساتھ گزاری تھی۔

”میں اللہ سے دعا کروں گا کہ میری بیٹی میں سب عادتیں تمہارے جیسی دھمکی والے دے تمہارے جیسا بھٹوں سے بھرا دل، تمہارے جیسا غلوں۔ تمہارے جیسی ساری تمہارے جیسی عروت۔ کچھ تمہارے جیسا ہو بس قسمت تم سے مختلف ہو۔ اس کے نصیب میں کوئی غم نہ رہا ہو۔“

اس نے اپنا نام بہت نفرت سے لیا تھا۔

اہل کے چہرے پر اب بیزاری نظر آنے لگی تھی۔ ایک گھبراہٹ اس نے اہل کے خود کو اس ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، جس میں وہ موجود تھا۔

”اہل! اماں کے پاس چلیں؟“ وہ بیٹی کی خاطر سکرایا۔ اہل نے بہت خوشی سے فوراً زور دھو کر اسے اقرار میں گردن ہلائی۔ اس نے اہل کو گودے سے اتار کر دواہن پیچھے کھڑا کیا اور جہاں اس کا ہاتھ پکڑ کر پھرج کی طرف آگیا۔

”میں تمہارے بغیر کبھی جیوں گا مجھے نہیں معلوم مگر میں نے پھر بھی جینا تو ہے۔ اپنی بیٹی کی خاطر۔“ گاڑی اشارت کرتے ہوئے اس نے سوچا۔ اہل جوش و خروش سے بولتی اسے بتانے لگی کہ اسے کون کون سے دوستوں کے قصے سنا رہی تھی اور وہ گاڑی چلا رہے دھیمائی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا رخ آفاق جمال کے گھر کی طرف تھا، جہاں اسے اسے سدرہ کو دواہن اپنے گھر لانا تھا۔ اپنی بیٹی کی ماں کو دواہن اپنے گھر لانا تھا۔

”اماں! میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ خوش رہو۔ میرے ساتھ نہ دیکھی کی اور کے ساتھ کسی تم خوش رہو۔ جو زیادتیوں میں نے تمہارے ساتھ کیں، بغیر غلامی ان سب کا ازالہ کر دے۔ میں بدقسمت تھا میری قدر نہ کر سکا۔ مگر وہ تمہاری دل سے قدر کرے۔ وہ تمہیں کوثر کر چاہے۔ وہ تم سے بے انتہا محبت کرے۔“

اس کے لبوں سے بے آواز وہ کچھ دعا میں نکل رہی تھی، جو ساری کی ساری اس لڑکی کے نام تھیں، جو اسے محبت کرنا سکھا رہی تھی، جو اسے غلوں اور مردود کا معنی سمجھا رہی تھی۔

”فائزہ عید! تم بہت خوش نصیب ہو۔ دنیا کی بہترین عورتوں میں سے ایک عورت تمہیں ملے جا رہی ہے۔ اس کا ہمیشہ بہت، بہت خیال رکھنا۔ دیکھنا اس کا دل بڑا نڈک ہے۔ میرے دینے زخموں سے چور چور ہے۔ تم اس دل کو کبھی کوئی گھیر مت پہنچانا۔“

اس کی آنکھوں سے پھر آنسو نگرے لگے تھر تھر آنسو ہاکی جدائی کے دکھ پر بہنے والے آنسو نہیں بلکہ اس کی دائمی خوشیوں کی سچے دل سے دعا میں لگنے والے پیار اور سچے آنسو تھے۔

☆☆☆☆

”وہ دواہن آئے گا۔ وہ دواہن آئے گا کلام! میری محبت اتنی بے اثر تو نہیں ہو سکتی۔“

اور وہ دواہن آ گیا تھا۔ اس کا یقین غلط نہیں تھا۔

چاہے ساڑھے پانچ سال بعد بھی، لیکن وہ دواہن آ گیا تھا۔ پھر اس آئے والے کو لوٹا کیوں دیا تھا؟ کیا اس لئے کہ اس سے نفرت بہت شدید تھی؟

محبت اور نفرت، یہ دو جذبے ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اتنے قریب کیوں ہیں؟ جس کے بارے میں ایک عریک پر یقین رکھو کہ ہم اس سے نفرت کرتے ہیں زندگی کے کسی عجیب سے موڑ پر جا کر چاہے انکشاف ہوتا ہے کہ وہ نفرت تو صرف ایک دکھاوہ تھی۔ خود کو بھلانے کا ایک بہانہ۔

”تمہیں اپنے دل کی بات بتاؤں کلام! جس روز وہ دواہن آئے گا۔ میں واقعی جھپٹی ہر بات بھلا کر اس کے ساتھ اپنی زندگی وہیں سے شروع کروں گی جہاں پر وہاں ساتھ چھوٹا تھا۔“

کھینچنے کی سالوں سے جس شخص کے بارے میں اسے یقین رہا تھا کہ وہ اس سے نفرت کرتی ہے، شدید نفرت، بے انتہا نفرت۔ وہ نفرت اس ایک ٹپ میں کہاں غائب ہو گئی تھی جب وہ اس کے پاس آ کر بولا۔

”میری زندگی میں دواہن آ جاؤ اماں! تمہارے بغیر میری زندگی بہت اداس ہے، بہت دیران ہے۔“ اور وہ اپنے کھنکھوں کے مین مطابق ہر بات بھلا کر اس کے ساتھ اپنی زندگی کا سطر وہیں سے شروع کرنا چاہنے لگی جہاں ان کا ساتھ چھوٹا تھا۔ وہ دواہن لڑکی اور اس کی جونی محبت، وہ تو آج بھی وہی تھی، اسی مقام پر زندگی کبھی اسے نہیں ملتی تھی۔ وہ تو جن بھری ہوئی تھی، اسی جگہ اسی انتظار میں تھی میں پاگل ہوئی وہ لڑکی تو نفرت کبھی کرتی ہی نہیں تھی، نفرت تو وہ بیوی کرتی تھی جسے اس کے شوہر نے دھوکا دیا تھا، راجہ جیٹو چھوڑ گیا تھا۔ اس سے یہ وفا کی تھی۔ وہ بیوی اپنے شوہر کو کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی مگر وہ لڑکی اس کی محبت، نفرتوں سے بہت پرے تھی۔ پاگل پن کی حدوں کو چھوٹی اس کی جونی محبت، انا پرستی سے بہت آگے تھی، بہت دور۔

کیا محبت صرف انہوں سے کی جاتی ہے؟ خوبیاں دیکھ کر اچھا لیاں جا بھینے کے بعد۔ محبت اگر کچھ ہے تو کبھی کم نہیں ہو سکتی، کبھی نہیں ہو سکتی۔ وہ محبت جو ایک بیوی تھی اور جو اب پرست بھی بہت تھی، چاہے اس دواہن پر جتنا شور مچا لیتی مگر اس لڑکی کی محبت کو برا نہیں کہتی تھی۔ ٹھیک تو کہہ رہا تھا میر، اگر وہ واقعی اس سے نفرت کرتی تھی تو

اچھے برسوں میں کبھی اس سے طلاق نہ ملے گی کیونکہ میں کیا؟ اس کے پہناتے وہ زہر، جو آج اسے لوٹنے سے ہیں، کیوں انہیں کبھی خود سے نہیں کھانسی پانی، محبت ہی کی وجہ سے ناں۔

وہ پھر سے اس کے ساتھ اپنی زندگی کو وہیں سے شروع کر دیتی، مگر وہ ایسا نہیں پائی۔ اس نے نہیں کروہ ایک دوسری عورت کے لیے بسا ہے مگر کوجا زنا نہیں جانتی تھی۔ اسے سدود آفاق سے کوئی بھوری نہیں تھی۔ جس عورت نے اس کا گھر اجاڑا تھا، اس کا شوہر بھی تھا، اس کے خوابوں کو سدود کیا تھا، وہ اس سے بھوری نہ کھتی؟ اسے اس کا شوہر وہاں لوٹا؟ ایک دیوانہ کی طرح تھی وہ مگر بات سدود آفاق کی نہیں بات الیہ رضا کی تھی۔ جو اس کی بیٹی نہیں، جس کی وہ اپنی نہیں، پھر بھی اس کے ساتھ کچھ برا کرنے کا وہ تصور نہیں کر سکتی تھی۔ پھانے کیے مارش تھا، جو اسے اس مصوم بچی سے لکھی محبت میں جتا کر گیا تھا جیسے وہ اس کی اپنی اولاد ہو، سرخ ٹکڑا کیلوس فرارک ہمیں، وہ کیوت ہی، بھولی بھائی اور مصوم بیٹی۔

”یہ میرے ماں، پاپا ہیں۔“ اس کے کانوں میں آج بھی وہ پیاری سی آواز گونج رہی تھی۔ وہ اہل سے اس کا گھر چھینے جیتی؟ وہ اہل سے اس کے ماں باپ کیسے چھین گئی؟ اہل کیا کیسے کر دیتی اور وہ اسے مصوم پر؟ میرا کر اہل کو اپنے ساتھ لے کر اس کے پاس آتا تو وہ ماں سے محرم ہو جاتی اور اگر اسے اس کی ماں کے پاس چھوڑ کر اس کے پاس آتا تو باپ سے۔ ہر دو صورتوں میں نقصان تو اہل ہی کا ہو رہا تھا۔

مگر سے محرم، ماں باپ، ان بھٹیوں کو تری اہل، مکمل نہیں ایک اور ماں اہل دین جانے۔ ایک گھر کو تری، رشتوں کو تری، بھٹیوں کو تری، ماں اہل کو تری جو پھر کی ایک رشتے میں اپنا ہر رشتہ دھوڑے۔ پھر کل وہ ماں اہل کی میر رضا کی پیش کرے، انجانیں کرے کہ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ اپنا ایک رشتہ، واحد رشتہ چھین جانے کا خوف اسے ہلہ ہلہ بیٹے اور ہلہ ہلہ کرنے کی اذیت دے۔ اس کے پاس ایک گھر ہو، ماں باپ ہوں۔ انجھوں سے آزاد سیدھی اور ہوا اس کی زندگی ہو، اس کی اپنی ایک مضبوط شخصیت ہو تاکہ اگر کوئی میر رضا اسے راہ میں جتا چھوڑ جانے کی بات کرے تو وہ اس جانے والے کے سامنے اپنی انا نہ نکالے۔ اس کے آگے ہاتھ نہ جوڑے، اس کے پاؤں نہ چکڑے، بلکہ اس چھوڑ کر جانے والے کی طرف بھی مڑ کر دیکھے گی نہیں۔

وہ ماں اہل، اتنی خود غرض کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ اہل سے اس کا گھر کیسے چھین سکتی ہے۔ وہ مصوم بیٹی جس نے ابھی دنیا میں کچھ بھی نہیں دیکھا، وہ اس سے اس کا گھر چھینے کا اس سے اس کا باپ چھیننے کا کل کیسے کر سکتی ہے۔

”آج تمہارے پایا کو جو کچھ کہا، بھٹی نفرت کا اظہار کیا، جیسے بڑے الفاظ استعمال کئے اور اسے ماپوں لوٹنے کو جو فائز عید سے شادی کا فیصلہ کیا، سب تمہاری وجہ سے کیا ہے اہل! ماں نہیں ہوں تو کیا ایک متا مبرا دل بھی نہیں ہے میرے بیٹے میں؟ میں نے تمہارے پایا کو وہاں تمہارے پاس بھیج دیا ہے اہل۔ میں نے تمہارا گھر لوٹنے سے بچا لیا ہے اہل، تاکہ تم ماں بھی نہ بن جاؤ۔ تم ایک گھر، کچھ رشتوں اور بھٹیوں کی تلاش میں در بدر نہیں پھرو گی۔ رشتے نہیں دھوڑے نہیں پڑیں گے، وہ تمہارے پاس موجود ہوں گے۔

وہ کھڑکی کھول کر کھڑکی ہوئی تھی اور باہر اندھا ہونے کے باوجود اسے نیچے کھلے آسمان سے وہ شخص کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کی شکل صاف نظر نہیں آ رہی تھی تو اس کے آنسو کیے نظر آتے۔ مگر وہ پھر بھی یہ

بات تاکتی تھی کہ وہ گاڑی کے پاس کھڑا ہو رہا ہے۔

”جہیں اپنے دل کی بات متاؤں کلٹاؤں، جس روز وہاں آئے گا۔“ وہ کھڑکی پر کھڑک کر دارو قطارو پڑی۔ وہ وہاں آئے والا، وہاں جانے والا تھا۔ اسے جانے کو خود ہی تھا، مگر اب اسے جانا دیکھنا اپنی بہت اور حوصلے سے بہت زیادہ لگ رہا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ آٹھ سال قبل سولہ فروری کو جڑنے والا ایک رشتہ سولہ فروری ہی کو ٹوٹ بھی گیا تھا پچاس موم بھیاں ایک پر سناٹا کی کیسے؟

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں بہت بڑا سا ایک بچک کروں گی۔ اتنا بڑا کلاس پر پچاس موم بھیاں لگا لی جاسکیں۔“ ”بہت جلدی ہے کچیس سال گزروانے کی، کچیس سال بعد تم بولو بھی تو ہو جاؤ گی۔“ اس کی گاڑی اشارت ہوئی۔ اس کے بلوں سے ایک آواز آئی۔ ایک سسکی، بندی دل پھر اسے پکارنے کو بچلا۔ اس نے اپنے بلوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ رو رہے ہوئے دیکھ رہی تھی کہ اس کی گاڑی گیت سے باہر نکل چکی تھی۔ ”میرے اللہ۔۔۔“ فیض ہمیشہ خوش رہے، ہمیشہ سکھی رہے تو اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دیتے۔ میرا کوئی حق اس کے ذمہ نہیں۔ اپنا ہر حق اسے معاف کرتی ہوں۔ میں نے اسے معاف کر دیا تو ابھی اسے معاف کر دے۔ اس سے کوئی سخت حساب مت لینا۔ اسے کوئی سزا مت دینا۔ دل دنیا میں نکل روز مشرق میں۔ اس پر رحم فرما میرے اللہ۔۔۔ اس پر رحم فرما۔“ وہ بے ہوش کیپکاتے ہوئے سے وہ اللہ کو پکار رہی تھی۔

بہت دیر تک وہ روئی رہی۔ اس فیض کے لئے، اس کی ان یادوں کے لئے جو بھی اس کی تھیں۔ وہ آج انہیں آخری بار یاد کر رہی تھی تاکہ کل جب وہ فائز عید کے ساتھ اپنی اپنی زندگی شروع کرے تو اپنی سوچوں اور اپنی یادوں میں بھی اس کی یاد دہار ہو کر نہ سکے۔ اس کا دل بے سوچ کر طہنیں تھا کر اس نے فائز سے محبت کا کوئی جھوٹا اظہار نہیں کیا۔ وہ اپنی اپنی زندگی کا آغاز کسی جھوٹ کے ساتھ نہیں کرے گی۔

وہ اس کا قلعہ دوست پر سے یقین کے ساتھ کھتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی دوستی خود بخود محبت میں بدل جائے گی۔ بہت کا تو پتا نہیں کہ اس کے ساتھ اپنی اہل تنک قلعہ اور فائز اور دوسرے دم تک رہے گی۔ وہ اپنی یادوں اور اپنے خیالوں میں بھی کسی اس سے بے وفائی نہیں کرے گی۔ فائز کے دل پر زارا کی بے وفائی کا جو کجرا زخم لگا ہے، وہ اس زخم کو اپنے پیار اور اپنی فوج سے بہت جلدی بھرے گی۔

اس نے زندگی میں بہت سے خواب دیکھے تھے۔ ایک گھر کے، رشتوں کے، محبت کے۔ اس کا صرف محبت کا خواب ہی تو ٹوٹ کر کھرا ہے، اپنی سارے خواب تو اکی سلاطین ہیں۔ اپنے ایک گھر کا خواب، اپنا کھانے والے کچھ رشتوں کا خواب اور سب سے بڑھ کر اسے ”ماں“ کہہ کر بلانے والے ایک ننھے سے وجود کا خواب۔ اسے اپنے ان سارے خوابوں کی تعبیریں حاصل کر لیں۔

اس نے اپنے چہرے پر سے سارے آنسوؤں کو مٹا ڈالا پھر ہنسی کندھے پر ڈال کر وہ اپنے آنسو سے باہر نکل آئی۔ وہ صرف آنسو سے نہیں نکلتی تھی، وہ یادوں کے حصار سے بھی نکل آتی تھی۔ وہ زندگی کو ایک جانموان دینے کا وہی تھی اور اس سے عفو مان میں وہ بیٹے کل کا کوئی ٹیڈل نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اب آرام سے رہنا تو لائف کو انجوائے کر رہا ہوں۔ ان دنوں کچھ کھنے پڑھنے سے زیادہ ہی شغف ہو گیا ہے۔ اس لئے سارا دن اپنی مٹھی میں کتابیں پڑھنے میں گزارتا ہوں۔ اپنے یورپ اور افریقہ کے ممالک کے دوروں کے نتیجے میں وہاں کے حالات اور اپنے تجربات پر مبنی دو عدد دستاویز لکھ چکا ہوں۔ آج کل کچھ قریبی دوستوں کے مشورے پر اپنے مختلف موضوعات پر لکھے گئے آرٹیکلز جو اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں کو کتابی شکل دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہیں دینیس میں رہتا ہوں۔

وہ ان سے بڑی مرحوب اور مہتر نظر آ رہی تھی۔

”اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔“ وہ اس سے مخاطب ہوئے۔

”آپ جیسے عالم فاضل اور انجمنیکل کے سامنے میں اپنا کیا تعارف کرواؤں۔ بہرحال میرا نام اجلا شیریار ہے اور میں نے انٹرس ویلی سے فائن آرٹس میں گریجویشن کی ہے۔ ان دنوں ایک آرٹ اسکول میں چاب کر رہی ہوں۔ میں بھی دینیس ہی میں راقی ہوں۔“

”اچھا تو میری نئی دوست ایک آرٹسٹ ہے۔ یہی میں تو پہلی نظر میں جان گیا تھا کہ تم بڑی مینڈلز لڑکی ہو۔“ وہ اپنی تعریف پر مسکراتی ہوئی بولی۔

”اقتی نئی بھی نہیں ہوں جتنا آپ بکھر رہے ہیں۔ اس جنوری میں، میں پورے چھبیس سال کی ہو گئی ہوں۔“ وہ اس کے صاف گوئی سے اپنی عمر بتاتے ہی پرائس پڑے اور بولے۔

”میرے آگے تو چھوٹی سی بچی تھی ہو۔ خرم یہ بتاؤ تمہیں مجھ سے دو تکی کا مسکھو ہے۔“ وہ جواب میں اپنا سر اٹھاتے میں ہلاتے ہوئے بولی۔

”کیا اب تک ہماری دوستی وہیں چلی؟“

”جہاں باقاعدہ دوستی تو نہیں ہوئی ناں۔ اب تم دوستی کرنے کے لئے بان گئی ہو تو میں جہیں بتاؤں کہ میں دوستی میں بھی ویلنٹر شپ کا فعال ہوں۔ لہذا میری پہلی ویلنٹین تو یہ ہے کہ مجھے روئے بسور سے چہرے بہت زہر لگتے ہیں اس لئے اگر مجھ سے ٹریڈ شپ کر لینی ہے تو جب بھی مجھے طبیعتی مسکراتی نظر آؤ۔“ ٹھیک ہے۔“ وہ اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے بولی۔ اس نے لکھ چکے ہوئے ان کے ہمدردانہ ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا اور گردن ملا دی تو انہیں نے بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دہاتے ہوئے چھوڑ دیا۔ پھر کچھ مردہ اس سے فائن آرٹس اور اس کی چاب کے بارے میں بات کرتے رہے۔ اذان سے کچھ پہلے وہ اٹھے تو ابلا بھی ان کے ساتھ ہی نکری ہو گئی۔ دونوں چہل قدمی کرتے ہوئے پارک سے نکل آئے۔ پارک سے باغی مینٹ کی داک پر ان کا گھر تھا۔ سڑک کے کنارے پہ پے کفرے ہو کر انہوں نے اسے اشارے سے اپنا گھر دکھایا اور چلے گئے تو وہ بھی آگے بڑھ گئی۔

اگلے روز وہ پارک آئی تو وہ اسے داک کرتے ہوئے نظر آئے۔ اس انجمن میں بھی ان کی فریڈلکس انجمن زبردست تھی۔ چوتھ قدم اور مضبوط ذہیل ڈول۔ ان کی نو کرکھی ہوئی تھی نہی چال میں مست رفتار نظر آ رہی تھی۔ گہری اور چمک دار آنکھیں جو خفا جھٹکنا کی طرح اپنی طرف کھینچ لیں۔ دائرے نے ان کے چہرے کو ایک عجیب سے نورانی ہالے میں لے رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر انہوں نے دور سے ہاتھ ملا کر دوش کیا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی تیر تیر دموں

سے چلتی ان کے پاس آگئی اور بولی۔

”السلام علیکم۔“

”وہیکم السلام کسی ہو چنا؟“ وہ شفقت سے مسکرا کر بولی۔

”میں ٹھیک ہوں اگل آپ کیسے ہیں؟“ ”میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ آؤ آج بیٹھے کے بجائے تم بھی میرے ساتھ داک کرو۔“

اسے آفر کرتے انہوں نے چلنا شروع کیا تو وہ بھی ان کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی۔ کافی دیر تک وہ دونوں داک کرتے رہے اس دوران انہوں نے آپس میں بہت ساری باتیں کیں۔ ایک دوسرے کی پسند و پسند وغیرہ کے بارے میں آگاہی حاصل کرتے رہے۔ بات کرتے کرتے اچانک ان کی نظریاں ٹھٹری پڑی تو ہولکا کر بولے۔

”مارے مجھے، وہ وہ تو مجھ سے خفت ناراض بیٹھا ہوا ہوگا۔“ اس کی حیران شکل پر نظر پڑی تو مسکرا کر بولے۔

”میرا چاہتا ہے اوہیں۔ اسے آٹم میں پیارے الو ہی کہتا ہوں۔ اب کہیں تم اسے کوئی احمق ہی مخلوق کی نہ کہ لیتا۔ بڑا چمکنس اور لائق ہے۔ یہ بات صرف میں ہی نہیں اسے جانے دے تاں لوگ کہتے ہیں۔ بچپن سے لے کر آج تک زندگی کے ہر میدان میں اول رہا ہے۔ پڑھائی میں تو خیر اچھا تھا ہی لیکن اسپورٹس میں بھی اس کی کارکردگی نہایت شاندار تھی۔ اسکاوش اور سونگٹ میں اس نے بیٹھ سی فرسٹ پرائز حاصل کیا ہے۔ اس جیسا ڈیڑھ کلوں اور ہوی نہیں سکتا۔ بڑی ہی قلبی نیچر کا مالک ہے۔ اپنے ارادوں میں اہل اور قلبی فیصلے کرنے والا ولیر، مڈر اور مستقل مزاج۔ ہارنا تو جیسے اس نے سکھایا ہی نہیں ہے۔ آکسفورڈ میں بھی اپنی ذہانت اور ریاضات کے جھنڈے گاڑ کر آیا ہے۔ اس کے وہاں کے پروفیسرز آج بھی اسے یاد کرتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے علاوہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے اور اب میرا اتنا پیلا ہوا بڑا ہی دوستی میں رہا ہے۔ مجھے اس نے رہنا نہ منت دلوا دی ہے۔“

ان کے لہجے میں اپنے پوتے کے لیے محبت، فخر، ایمان اور کیا کیا کچھ نہ تھا۔ وہ ان کے چہرے پر کھمبے ہوئے ان رنگوں کو بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی اس کے لئے اس لہجے میں محبتیں اور چاہتیں جتانے والا کوئی نہ تھا۔ وہ کسی کو مزید اذیت نہیں تھی۔ کسی کو اتنی فرصت نہ تھی کہ اس کی خوبیوں کو سراہا اور اپنی دلیا نہا نہا جہت کا اظہار کرتا۔ وہ ایک عجیب سے تانس اور دکھ کو اپنے دل میں گھر کرتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ جبکہ وہ اس کی کیفیت سے بے خبر کھڑے تھے۔

”آج رات جلدی گھر جانا ہے۔ تم جلدی میں ہوا یا کسی روگ؟“ ان کی بات پر وہ ایک گہری سی سانس لے کر بولی۔

”نہیں میں بھی آپ کے ساتھ ہی جا رہی ہوں۔“ کل کی طرح وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے باہر نکل آئے۔

ان کے گھر کی اجڑتی سے کنارے انہیں خدا حافظ کہتی وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ پھر ان سے روز پارک میں ملنا جیسے معمول میں آگیا تھا۔ وہ دیکھ داک کرنے آئے تھے سو ابلا بھی انہیں جرات کر لیتی اور پھر تھوڑے دیر بعد گھنٹاں کی منت میں گزار کر جب وہ واپس لوٹتی تو خود کو بہت ترنارہ اور خوش محسوس کرتی۔ ان کی کچھ اپنی دلچسپی ہوئی کہ اسے بڑھت کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ عام بڑے افراد کی طرح انہیں جی نسل میں تنگدوں خرابیاں نظر نہیں آتی تھیں۔ وہ کبھی تنہی کرنے کے لئے باہر جیٹن کپ کے پیش نظر ہمارے زمانے میں تو ہیں ہوتا تھا یہاں کل کی سل تو زنی دیا تھا ہے۔ جیسے ٹھہرے میں نہیں بولا کرتے تھے۔ جہاں انہیں اپنے

زمانے کا ہیڈوک، فلپس اور لٹریچر پسند تھا وہ نئی نسل کے بھی بہت سے گھوکاؤں کو پسند کرتے تھے۔ اس دور کی عمدہ اور معیاری فلپس اور سبب بھی ان کی سن پسند تھیں۔ اسی لئے اسے کبھی بھی ایسی محسوس نہیں ہوا کہ وہ دل سے یوڑے شخص کے ساتھ وقت گزار رہی ہے۔

کیمپ اور راترینٹ تک کے بارے میں ان کی مطواعت اتنی آپ تو ذہن فیض تک کہ وہ خود ان سے بہت کچھ سیکھ رہی تھی۔ انہوں نے اس سے کبھی بھی اس کے گھر یا گھر والوں سے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ زیادہ تر وہ لوگ جنرل ٹاکس پر باتیں کرتے رہتے۔ اسے ان کی یہ عادت بہت اچھی لگتی تھی کہ وہ ہالچر کے تجسس میں جلا ہو کر اس سے پزل باتیں نہیں پر چھا کرتے تھے اور یکدہ اپنے گھر کے حوالے سے کوئی بات کرنا بھی نہیں چاہتی تھی اسی لئے ان کی اس عادت سے بہت خوش تھی۔ خود وہ البت باتوں باتوں میں اکثر اپنے بڑے کا ذکر کرتے تھے۔

بات چاہے کبھی بھی موضوع پر بوری ہوئی اس کا کسی نہ کسی طرح سید اوپس لوڈی سے ٹک جڑ دیا جاتا تھا۔ اگر کھانے پینے کی بات بوری ہوئی تو وہ کہتے "اوپس کوئی فوڈ اور مختلف قسم کے سلاڈ کھانے کا بہت شوق ہے۔ کھانے کی چیز پر جتنے کر پہلے اپنا آدھا پیٹ تو سلاڈ سے بھر لیتا ہے۔ اسی لئے ہمارے خانہ سال بے چارے کو اس کی وجہ سے مختلف کھانے پکانے کی کتابوں اور دی وی پروگراموں سے استفادہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ اسے روز بڑی سے نئی طرح کی سلاڈ کھا سکے۔"

اگر کتابوں کی یاد پڑنے پر جانے کی بات بوری ہوئی تو کہتے۔

"اوپس کو کبھی میری طرح کتابوں سے عشق ہے۔ روزانہ رات کو سونے سے پہلے کچھ نہ کچھ ضرور پڑھتا ہے۔ چاہے وہ کوئی ٹیکرین ہو یا کوئی کتاب۔" وہ اپنے بڑے سے والدین کا پیش کرتے تھے۔ اسی لئے یہاں نہ ہوتے ہوئے بھی وہ ان کے پاس موجود ہوتا تھا۔ ان دونوں کے بیچ وہ ایک تیسرے فرد کی طرح پیشہ ساتھ رہتا تھا۔ اس روز بھی وہ ان کے ساتھ راک کر رہی تھی ان کی باتیں بغیر رہی تھی۔ گفتگو کا موضوع بعض لوگوں کا اپنی کسی بھی عادت کو لے کر اس طرح اختیار کر لینا تھا۔ اپنی عادت کے مطابق وہ اپنے بڑے کا ذکر کرنا نہ بھولے اور بولے۔

"اوپس کی ایک بھی عادت مجھے پسند ہے۔ حالانکہ اس نے کبھی میرے سامنے سرگرم نہیں کیا، لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ سوئف کرتا ہے۔ ویسے اپنی نفس کا اور اپنی ہمت کا خیال رکھتا ہے روزانہ صبح باقاعدگی کے ساتھ ابکس سٹار کرتا ہے۔ شام میں سوئف کرتا ہے اور پختے میں دو تین بار سکواش کھیلنے بھی جاتا ہے مگر سوئف کے باز نہیں آتا۔" ان کی بات بڑے غور سے سنتے ہوئے وہ ایک دم بول پڑی۔

"وہ آپ کیا کی بات نہیں مانتے۔؟"

"فہمیں خیر اسکی تو کوئی بات نہیں۔ دراصل اس نے کبھی میرے سامنے سوئف کی ہی نہیں ہے اس لئے میں اسے کبھی کوئی نہیں پایا۔"

اتنے عرصے سے اس کے بارے میں سنتے سنتے اسے اب وہ نوجوان بندہ بڑا جانا پہچانا سمجھنے لگا تھا۔ اسے یونی خیال آیا کہ وہ ہمیشہ اپنے بڑے ہی کا ذکر کرتے ہیں کبھی بیٹے اور بہو کی کوئی بات نہیں کی۔ اسے اس خیال کے پیش نظر وہ بول اٹھی۔

"آپ کے چٹا اور بھوکیا کپس دوسرے ٹک میں رہتے ہیں؟"

اس کے سوال پر ایک باریک ماسایہ ان کے چہرے پر نظر آیا تھا۔ ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ ایک دم ویران اور برسوں کا بابر نظر آنے لگا تھا۔ ان کے کچھ کے بغیر ہی اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا اور وہ بڑی شرمندگی میں گھر کی کڑی تھی۔

"آئی ایم سوری میں نے آپ کو کبھی کر دیا۔"

اس کی بات پر وہ ایک دم چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے اور بڑے دھکی اعزاز میں سر سے بولے۔
"یہ دکھ تو ہر لمحہ میرے ساتھ ہے۔ لیکن بعض اوقات میں اپنے تمام دکھ اور رنج و الم اپنے سے وابستہ دوسرے افراد کی وجہ سے دل کے کسی نہاں خانے میں چھپانے پڑتے ہیں۔ لیکن اس طرح کرنے سے بھی اس دکھ کی شدت کم تو نہیں ہو جاتی۔ آج صبح میں زندہ ہوں تو صرف اوپس کی وجہ سے ورنہ برسوں پہلے جواں بیٹے اور بہو کی موت کی خبر سن کر ہی شاید میں مر گیا ہوتا۔" اس کی اتنی بہت ہی نہیں ہوئی تھی کہ وہ ان ہنسی مسکراتی زندگی سے بھر پور آنکھوں میں ٹھنکی دیکھ کر اس لئے چپ چاپ سر جھکانے ان کی بھرائی ہوئی آواز سن رہی تھی۔ پھر وہ ایک دم اپنی آنکھیں رزوکر صاف کرتے ہوئے اس سے بولے۔

"آج میں تمہیں اپنے بارے میں بہت ساری باتیں بتاؤں۔" وہ ان کی طرف نظر ڈالے بغیر ان کے ساتھ چلتی چلتی پر آکر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے سادہ آسمان پر نگاہیں جمائے بول رہے تھے۔

"کبھی ہمارا ایک محبت جرات آشنا نہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں، میں سمیو اور دانیال رہا کرتے تھے۔ سمیو میرے ماموں کی بیٹی تھی۔ ہماری شادی بزرگوں کی مرضی سے ملے جی ٹی گھر اس میں ہم دونوں کی پندہ بھی شامل تھی۔ وہ بہت اچھی تھی۔ بڑی ہرور، نیک دل اور خدمت گزار، ایسی بچی قسمت والوں ہی کو کھلا کرتی ہے۔ اس نے میری زندگی میں شامل ہو کر اسے ہر لحاظ سے مکمل کر دیا تھا۔ میرے کیے بغیر میرے دل کا حال جان لینے والی وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔

پھر ہماری زندگی میں دانیال آ گیا تو جیسے ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں پھیل گئیں۔ ہماری زندگی خوشیوں اور مسرتوں سے بھر پور تھی۔ وقت گزرتا گیا دانیال بڑا ہو گیا۔ وہ بڑا چن اور قابل تھا بالکل میرے الپس کی طرح۔ ہم دونوں میاں میں اپنے اپنے بیٹے کی کامیابیوں پر فخر کیا کرتے تھے۔ وہ تھا بھی بہت اچھا بڑا فرما ہر دار اس نے تمام زندگی کبھی مجھ سے یا اپنی ماں سے اونچی باتیں نہیں کی تھیں۔ کبھی ہمارا کہا نہیں ٹالا اس کے اطلاق اور اچھی فطرت کے اپنے چارے سبب ہی گاتے تھے۔ جب وہ اپنی زندگی میں ہر لحاظ سے سیٹ ہو گیا تو ہم دونوں نے اس کی شادی کے بارے میں سوچا۔ سمیو اپنے طور پر خاندان کی دو عین لڑکیوں کو اس کے لئے پسند کرتی تھی۔ مگر اس نے اپنی پسند سے شادی کرنے کا فیصلہ نہ کیا تو مجھے تو کوئی اعتراض نہ تھا مگر سمیو روایتی ماؤں کی طرح اس بات پر ناراض ہو گئی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میرے بیٹے نے کسی چیز کے لئے خود کی تھی۔ میرے بھانے بھانے کے باوجود سمیو اپنی خند سے ایک اونچ پیچھے نہ جھکی۔ مگر اس موقع پر دانیال بھی حد درجہ خند اور سرکش ثابت ہوا۔ اس نے فیصلہ نہ کیا کہ شادی کرے گا تو سب سے ورنہ کسی سے بھی نہیں کرے گا۔ بالآخر میرے بہت بھانے اور مہانے پر سمیو اس شادی کے لئے تیار ہو گئی

لیکن دل سے وہ دانیال سے سخت ناراض تھی۔

بیکن نبھو بن کر ہمارے گھر میں آئی تو چلا چلا کر ہمارے فرمایا رہ گئے جسے کسی غلط چیز کے لئے خمد کی تھی۔ وہ اپنی بیکری تھی کہ میں بتائیں سکتا۔ جس صورت میں تو لا جواب تھی۔ اپنی عاقبت میں بھی بے پناہ تھی۔ وہ بیٹوہری میں دانیال سے دو سال جو نیز تھی کہ اس کی سادگی اور مصومت، کیونکہ گنگا ہی نہیں تھا کہ اس نے اتنا سارا پردہ چا ہوا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ میو کی ضد بھی جاتا رہا اور وہ دو سو ساں ہو کے بھاگے ماں بچی نظر آئے۔ پھر ہمارے گھر کی رونقوں کو دور دانا کرنے کے لئے اویس آ گیا۔ وہ مختار فرشتہ اپنے ماں باپ اور دادی کی آنکھوں کا تار تھا اور میری تو بات ہی کیا تھی مجھے تو اس کے ایک عجیب سائنس ہو گیا تھا۔ شاید اس کی بے تحاشا صحبت خدا نے میرے دل میں اسی لئے ڈال دی تھی کہ اس بن ماں باپ کے بچے کی پرورش مجھے کرنی تھی۔ دانیال اور بیکن کے ہوتے ہوئے بھی وہ ہر وقت میرے ساتھ رہا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ رات کو سوئی میرے پاس تھا۔

پھر جب وہ دو سال کا ہوا تو ایک روز چانک میو بھی مجھے ہو گئی۔ اس وقت تو اس نے چلنے جانے پر میں بہت اپ سبب ہوا تھا مگر خدا کے ہر کام میں کوئی نیکو صفت ہوتی ہے۔ اچھا ہوا جو وہ بیٹے اور بھوکہ دیکھنے سے پہلے اس دنیا سے چلی گئی۔ اس کے جنازے کو اس کے جوان بیٹے نے کندھا دیا تھا وہ خوش قسمت تھی اور میں بڑا ہی بد نصیب جس نے اپنے جوان بیٹے کے لئے کواچے کندھے پر اٹھایا تھا اور قسم یہ کہ مجھے پھر بھی جینا تھا اپنے اویس کی خاطر۔ دانیال کے دوست کی شادی تھی جس میں شرکت کے لئے وہ اور بیکن حیدر آباد گئے تھے۔ اویس مجھے سے مانوس ہونے کی سبب میرے پاس ٹھہر گیا تھا۔

شادی میں شرکت کر کے واپس آتے ہوئے ان کی گاڑی کا ایکسپرنٹ ہو گیا تھا۔ ایکسپرنٹ اتنا شدید تھا کہ دونوں موقع پر ہی دم توڑ گئے۔ یہ اطلاع کر کے میرا جواں ہوا وہ بیٹیں نہیں کر سکتا۔ بس یہی ہوا کہ اس دنیا میں، میں انکیلا ہو گیا تھا۔ میرا آشیانہ تنکا ہو کر ٹھہر گیا تھا۔ میرا دل مرنے کو چاہنے لگا تھا۔ مگر مجھے جینا تھا۔ اپنے دانیال کی لڑائی کی حفاظت کرنی تھی۔ وہ پانچ سال کا مصمم بچہ ہے تو شاید اپنے نقصان کا کچھ سے انداز بھی نہیں تھا۔ اسے تو اس وقت یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ کتنی بڑی نعمت سے محروم ہو گیا ہے۔ بس پھر اویس کی خاطر میں نے خود کو سنبھالا۔ وہ بچپن ہی سے بڑا حساس بچہ تھا میرے کہے بنا میرا ہر دکا اس نے اپنے اندر ادا کر لیا۔ مہر دوں کو ایک دوسرے کے سامنے اپنی بات کی وضاحت کے لئے الفاظ استعمال نہیں کرنے پڑتے وہ مجھے اور میں اسے مکمل طور پر جانتے ہیں۔ ہماری محبت بڑی زانی اور انوکھی ہے۔

ان کی آنکھ سے بہنے والے اس واحد آنسو کو اس نے اپنے ہاتھ سے پونچھ دیا تھا اور پھر اپنی انگلی کی چوہ پر ٹھہرے اس آنسو کو کچھ کران سے بولی تھی۔

”آپ بہت عجیب انسان ہیں۔ اتنے دکھا کر بھی اسے خوش اور مطمئن نظر آتے ہیں۔ تقدیر سے شام کی نہیں آپ کو خدا سے کوئی شکوہ نہیں۔“

اس کی بات کے جواب میں ایک جھمی ہوئی اویس کی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیلی تھی۔

”خدا اسے بندوں سے بہت مارتا رہے۔ اس نے اگر مجھ سے بچنے لیا تو اس سے کئی مٹا ہوا کہ وہ اب بھی

تو ہے اور جو اس نے لیا وہ بھی تو اسی کا تھا۔ اس کی تو عاقبت تھی کہ اس نے ایک اچھی بیوی اور فرما ہوا دینا مجھے دیا تھا اور اب بھی اس کا کام و کرم مجھے اپنے گھر سے میں لے ہوئے ہے۔ میرا اویس میرے پاس ہے اور میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں۔“

مجھ کو بعد جب وہ اپنے گھر جانے والے راستے کی طرف بڑھ رہی تھی تو اس نے محسوس کیا کہ وہ جو ہر دم خدا سے اور اپنی قسمت سے ناراض رہا کرتی تھی اچانک بدل گئی ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ دنیا میں صرف وہی دیکھی اور تجا نہیں اس سے بھی بڑھ کر غرور اور تجا لوگ موجود ہیں لیکن وہ اپنے نکو سے نکو کر لیتے ہیں اور خدا کی رضا میں راضی ہو جاتے ہیں۔

کتنے عرصے بعد اس روز وہ سکون سے سوئی تھی۔ وہ اپنے رب کی شکر گزار تھی جس نے ایک اتنے اچھے شخص سے اسے ملوایا جو اسے دوست راستہ دکھا رہا ہے اور اسے زندگی کی طرف واپس آنے میں مدد دے رہا ہے۔ پتہ نہیں کیا تھا کہ وہ تین روز سے پارک میں نہیں آ رہے تھے۔ اس کے نہ آنے سے وہ بڑی بے عمل اور اداس کی ہو رہی تھی۔ روزانہ بڑی آس سے پارک آتی اور مغرب کے وقت تک بیٹھ کر ان کا انتظار کرتی رہتی مگر وہ نہ آتے۔ آہستہ آہستہ اس کی اداسی پریشانی میں بدلتی جا رہی تھی۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ روزانہ شام کے وقت پارک آنا ان کا برسوں پرانا معمول ہے اور اب وہ اپنے معمول سے ہٹ گئے تھے تو وہ مگر مند ہو گئی تھی۔

ان جا رہیں تو وہ ان کی اتنی عادی ہو گئی تھی کہ ان سے ملنے بغیر اسے کسی ملی جھن نہیں آ رہا تھا۔ جب پانچویں دن بھی وہ اسے پارک میں نظر نہ آئے تو وہ خود کو دکھ نہیں پائی اور چلتی ہوئی اسی سڑک پر ٹوٹ گئی جس پر وہ روز مڑا کرتے تھے۔ انہوں نے اسے اشارے سے دکھا کر بتایا تھا کہ کار سے پانچواں مکان ان کا ہے۔ وہ دل ہی دل میں ان کی خیر و عافیت کی دعائیں مانگتی پانچویں مکان کے سامنے پہنچ گئی۔ ان کا گھر بھی ان کی شخصیت کی طرح عالیشان تھا۔ گوداں ہلال تمام ہی مکانات اچھے بنے ہوئے تھے۔ وہ ٹینس پچے پر مشغول تھے۔ آئی۔ ٹی۔ فیر تھا۔ لیکن ان کا گھر دیگر گھروں کے مقابلے میں بہت خوبصورت تھا۔ گیٹ پر موجود چوکیدار سے وہ ابھی ان کے بارے میں پوچھنے ہی والی تھی کہ اندر سے ایک گاڑی بڑی تیز رفتاری سے گیٹ کے پاس آ کر ہارن بجائے گی۔ چوکیدار نے اسے جھوڑ جلدی سے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ اتنی دیر میں وہ نیم پلیٹ پر چلی حروف میں لکھا ”سید میٹر لودھی“ پڑھ کر کنگزم پر چکی گئی کہ وہ درست جگہ پہنچی ہے۔

گاڑی گیٹ سے باہر نکلتی تو اس نے اس امید پر گاڑی کی طرف بنوڑ دیکھا کہ شاید وہ اس میں موجود ہو کر اندر موجود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے سے نوے کو دیکھ کر اس کی امید لاپیسی میں بدل گئی۔ وہ جو تیز رفتاری سے گاڑی آگے بڑھا دیتا جا پتا تھا اسے گیٹ پر ٹکڑی ایک انجان لڑکی کو دیکھ کر کیا گما جو دیکھ بھی اس کی طرف رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی وہ اس سے بولا۔

”فرمائیے آپ کو کس سے ملنا ہے؟“

”انکل جیس گھر پر؟“ اس کی بات پر وہ ایک لمبے کو حیران ہوا تو وہ فوراً ہی اپنی بات کی وضاحت کرتے

ہوئے بولی۔

”مجھے بشر اکل سے ملنا ہے۔“

”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ باہل میں ایڈمٹ ہیں۔“ وہ ایک سرسری ہی نگاہ اس کے چہرے پر ڈال کر گاڑی سٹارٹ کرنے لگا تو وہ بے ساختہ وہ قدم آگے بڑھ کر اس کی گاڑی کے بالکل پاس آ کر کھڑی ہوئے ہوئے بولی۔

”کیا ہو گیا ہے انہیں؟“

”کچھ بات ٹریل ہو گئی ہے اس وجہ سے پھولنا نہ کر پڑا ہے۔“ اب کے لہجہ بڑا ہے زار اور کونٹ زود تھا۔ وہ شاید کہیں جانے کی جلدی میں تھا اور یہ بلاوجہ کی انکار پڑی اسے پسند نہیں آ رہی تھی اسی لئے چہرے پر بڑے ہی بے حودت سے حشرات نظر آ رہے تھے جیسے وہ کہنا چاہتا ہو کہ ”لی! لی! مجھے صاف کر دو دروازہ جلدی میرا بیچا چھوڑ دو۔“ اس کے بے زار سے انداز کو دیکھنے کے باوجود وہ ہلکا سا ہلکا بول پڑی۔

”کس باہل میں ایڈمٹ ہیں؟“ اسے باہل کا نام بتا کر وہ تمام تر حودت بالائے حلق رکھتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا گیا تو وہ بھی جیسے تھکے تھکے قدموں سے جلتی داہیں اپنے گھر آئی۔

کچھ لوگوں کے ساتھ آپ تمام عمر گزری مگر آپ کے اور ان کے درمیان کوئی جذباتی وابستگی اور ہم آہنگی پیدا نہیں ہو پائی اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک لمبی ہی ماہیت بن جاتے ہیں جن سے ایک باہل کر بار بار ہلکے دل چاہتے لگتا ہے۔ جن سے کوئی رشتہ نہ ہوئے کے باوجود بھی ایک اپنائیت سی محسوس ہوتی ہے۔ کچھ ایسی قسم کا تعلق جو گیا تھا اس کا سید بشر دوسری کے ساتھ۔ وہ جو اس کے کچھ بھی نہیں کتے تھے اور جنہیں وہ چار ماہ پہلے تک جانتی بھی نہیں تھی آج ان کی حالات کا سن کر بے قرار ہو گئی تھی۔

گھر آ کر اس نے باہل فون کر کے وہاں کے حالات کے نام کے بارے میں معلوم کیا تو یہ چلا تھا کہ صبح آٹھ سے دس اور شام پانچ سے سات بجے تک ہلنے کے اوقات مقرر ہیں۔ اس کا نہیں نہیں چل رہا تھا کہ وہ اذکر پہنچ جائے اور ان کو دیکھ کر اپنے دل کی تسلی کر سکے۔ مگر ان سے ملنا اب کل سے پہلے ممکن نہ تھا اس لئے وہ اپنے بے چین دل کو وہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے انہوں کی بے اعتنائیاں سنیں تھیں رشتے ناٹوں پر اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا اور اب جو ایک پر خلوص اور بھروسہ سے انسان نے اسے دوبارہ زندگی کی طرف لانے کی کوشش کی تھی اور وہ کسی حد تک بھل بھی گئی تھی کہ ان کی پیادری اسے انجانے سے دوسروں میں جتلا کر لئے گئی۔ اس شخص کو وہ کسی قیمت پر کھو نہیں چاہتی تھی۔

ابھی تو وہ انہیں اپنے بارے میں کچھ بتا بھی نہیں پائی تھی۔ ابھی تو اپنے ان سے ڈھیر ساری باتیں کرنی تھیں اپنے دل کا تمام بوجھ ان کے سامنے بٹا کر تھا۔ ابھی تو اس نے انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ان سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے۔ ابھی تو وہ ان کے ہونے کو ڈھنگ سے محسوس بھی نہیں کر پائی تھی کہ جدائی کا گچھڑ جانے کا عفریت اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔

اس رات وہ اپنے رب کے حضور رو کر اور گونگڑا کر اپنے اس جنس اور پیارے سے انسان کے لئے دعا نہیں مانگتی رہی تھی۔ صبح وہ جلدی جلدی دو چار تھکے گل کر اور سکر فون کر کے کہہ دیا کہ انہیں آئیے گی۔ باہل چلی آئی دل ہی دل میں دعائیں مانگتی کہ سب خیر ہو وہ بالکل ٹھیک ہوں۔ اپنے معمول کے مطابق بننے سکر راتے اور قہقہے

نکھرتے ہوئے ہوں وہ روشن سے روم نمبر معلوم کر کے اپنے مطلوبہ کمرے کے سامنے پہنچ گئی۔ سب سے پہلی تسلی تو اسی بات سے ہو گئی تھی کہ وہ آئی کی یو سی نہیں تھے۔ یعنی خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ دروازے پر ہلکی دھک دے کر اس نے اندر سے ”نیں کم ان“ کی آواز سنی تو دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ بیٹھ پرکھوں سے ٹک لگائے بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے بیڈ کے دائیں طرف کرسی پر بیٹھا وہ شاید انہیں ناشائستہ کر رہا تھا۔ دروازے پر دھک ہونے پر وہ دونوں ہی سر گھما کر رو کر دیکھنے لگے تھے۔ اس پر نظر پڑتے ہی ان کے چہرے پر سکر اہٹ نمودار ہو گئی تھی۔

”آہ میری بیٹی! ان ہے۔ اسے کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتا میں گل سے تمہیں بہت یاد کر رہا تھا۔“ انہیں اداش بلانے اور باتیں کرنا تو کھاس کی کب سے بے ترحیب درجہ نہیں معمول پر آئی تھیں۔

”السلام وعلیکم کیسے ہیں آپ۔“ وہاں موجود اس بندے کی وجہ سے وہ لمبی کھڑی ہوئی قابل اعزاز میں ان کی خیریت پر پچھنے لگی درندہ تو اس کا پاس چار ہاتھ کر ان کے سینے میں من چھپا کر بہت سا روئے اور کہے۔

”اب دوبارہ کبھی پیار مت ہوئے گا۔“
”السلام۔ السلام۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ان لوگوں کو تو شوق ہے مجھے پیار بنا کر بستر پر ڈالنے کا۔“ وہ اپنے برابر بیٹھے بندے کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

”تم کھڑی کیوں ہو بیٹی! وہ پر تکلف اعزاز میں سامنے موجود صوفے پر بیٹھنے کی تو وہ ٹوکتے ہوئے بولے۔“ وہاں اتنی در دیوں بیٹھ رہی ہو۔ یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو۔“ وہ اپنے بیڈ پر اس کے لئے جگہ بنانے لگے تو وہ کچھ بھیجی ہوئی ان کے بائیں طرف ڈراما سٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ شاید اس کے آنے سے بہت ہی خوش ہوئے تھے۔ اسی لئے بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھمتے ہوئے بولے۔

”اوسیں یا جالا ہے۔ میں نے تم سے ڈکر کیا تھا ان کا بارک میں میری ایک بہت ہی پیادری سی دوست بنی ہے۔ وہ بھی ہے۔“

وہ اس کے بالکل سامنے بیٹھے شخص سے مخاطب ہوئے تھے۔ جو اتنی دیر سے اپنے پایا جانی کے لئے باعث مسرت بن جانے والی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے دھیان آیا تھا کہ کل جب وہ باہل جانے کی جلدی میں گھر سے نکل رہا تھا تو سبھی لڑکی گیت پر کھڑی تھی۔ اس وقت اسے باہل پہنچ کر پایا جانی کے ذاتی معالج ڈاکٹر شروت حسین بخاری سے ملنا تھا۔ اس لئے وہ بڑی بے حودتی سے اس سے ڈھنگ سے بات کہے بغیر چلا گیا تھا۔ عام حالات میں وہ اس بات کی مطلق پروا نہیں کر رہا تھا کہ کوئی اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔ اگر کوئی اسے مٹرو اور ٹھنڈی سمجھتا تھا تو اس کے بلا سے۔ وہ نہ ہر کسی سے بے تکلف ہوتا تھا نہ ہر ایک کو خود سے قریب ہونے کی اجازت دیتا تھا۔ اس کے انہیں رویوں کی بدولت وہ اپنے سطلے میں مٹرو مشہور تھا۔ لڑکیاں بالخصوص اس کے مٹرو رات انداز پر بڑا چڑا کرتی تھیں۔ مگر یہاں مسئلہ اس لڑکی کا تھا جو اس کے پیارے پایا جانی کو پیادری تھی اس لئے اسے اپنے گل کے دویچے پر فحوس ساہو رہا تھا۔

”بولیگی ہیں آپ؟“ اپنی عادت کے برخلاف وہ بڑی خوش اخلاقی سے سکر کر اس سے مخاطب ہوا۔ شاید کل کے رویے کا ازالہ کرنا مقصود تھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ ایک سرسری سی نظر اس پر ڈال کر بولی۔ وہ ان سے اتنی بے تکلفی سے باتیں کیا کرتی تھی مگر اس کی موجودگی کے سبب کچھ بڑی بڑی ہو کر بیٹھی تھی۔

”چہ بے ادبیں یہ اچالا بولی زبردست آراش ہے۔ اس کے ہاتھ کے سنے ایک سپر دیسکو تو حیران رہ جاؤ گھ سے تو اس نے وعدہ کر رکھا ہے کہ میرا ایک شاندار سا پورٹیفائل بنائے گی۔“

وہ شاید اس کی جھجک محسوس کر گئے تھے اسی لئے ماحول میں بے تکلفی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی اس تقریف سے وہ بری طرح شرمندہ ہو گئی تھی جبکہ وہ مسکرا کر بولا۔

”یہ آپ کا شوق ہے یا پروکھ؟“ اس کے جواب دینے سے پہلے وہ دوبارہ بول اٹھے۔

”بھئی اس نے فائن آئرس میں گرہیں بکھین کر رکھا ہے اور بہت پریشانی قسم کی چیخیں ہی سہجہ ہے یہ آرت اسکول میں پڑھاتی ہے غیر سے میری بیٹی۔“

انہیں شاید دوسروں کی تعریفیں کر کے انہیں آسان پر چڑھانے میں بہت مزہ آتا تھا اس لئے دل کھول کر اس کی تعریف کر رہے تھے جبکہ وہ سرخ چہرے کے ساتھ کچھ شرمندہ سی بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے اپنے بارے میں بات ہونا چاہیے وہ تعریف ہی کیوں نہ ہو ہمیشہ ہی کچھ پریشان سا کردار کرتی تھی۔ انہیں اس کا ایک خیال آیا تو بولے۔

”تمہیں میرے یہاں ایلمنٹ ہونے کا کیسے پتہ چلا؟“ ان کے اس سوال پر ایک لمحے کے لئے اس کی نظریں سامنے بیٹھے شخص کی طرف اٹھی تھیں پھر وہ سکون انداز میں بولی تھی۔

”میں آپ کے گھر گئی تھی۔ وہیں سے پتہ چلا تھا۔“ اویس نے چہک کر اس کی طرف دیکھا تھا شاید وہ اس کے چہرے پر موجود تاثرات سے کچھ اندازہ لگا جاتا تھا۔

”اچھا تو تم گھر گئی تھیں۔ یعنی یہ کرم نے مجھے سنایا تھا۔“ وہ مسکرا کر بولے تو اس نے گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

”پاپا جانی باتیں اپنی جگہ لکھیں آپ پلیز تا مشا تو کریں۔“ وہ دودھ کا گلاس ان کی طرف بڑھاتا ہوا بولا تو وہ بڑی سے دلی سے گلاس ہاتھوں میں لے کر بیٹھ گئے۔ انہیں ٹھیک ٹھاک دیکھ کر اس کے دل کی تپلی ہوئی تھی اس لئے اب اسے اپنا بیٹاں مزید رکنا ہوا بے عمل محسوس ہو رہا تھا۔ ان دادا پوتے کی پرائیویسی میں مداخلت اسے ابھی نہیں لگ رہی تھی اس لئے اپنا سائیڈ میں رکھا ہوا میک کھمے پر ڈالنے ہوئے بولی۔

”اچھا اگل میں ملتی ہوں۔“

”اپنی جلدی، ابھی کچھ دیر تو اور دو۔“ وہ بڑی بے ساختگی میں اس کا ہاتھ تھام کر بولے تو وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

”مجھے کچھ کام ہے۔ میں انشاء اللہ کل پھر آؤں گی۔“ وہ ان دونوں کی گفتگو سے بے نیاز اخبار اکر پڑھنے لگا تھا۔ اس کی معذرت کے جواب میں مجبوراً انہوں نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دی تو وہ کھڑی ہو گئی۔

”تم جاؤ گی کیسے؟“ ان کی فکر مند سی پر وہ مسکرا کر رو گئی۔

”میں اپنی گاڑی میں آئی ہوں۔ جانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”اچھا خدا حافظ۔“ اس کی بات پر انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ بھیرا اور بولے۔

”بہت اچھا لگتا تھا۔“ وہ ان کے شکر ہے کے جواب میں بہت کچھ کہتا جا رہی تھی مگر سامنے موجود اس اخبار کے پیچھے چھپی شخصیت کی موجودگی اسے مکمل کر کچھ نہیں کہنے دے رہی تھی اس لئے خاموشی پر اکتفا کرتے وہ دروازے کی طرف بولیں۔ اسے دروازے کی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ ایک دم اخبار رکھ کر کھڑا ہو گیا اور دروازے کے باہر تک اس کے ساتھ آتا ہوا بولا۔

”خدا حافظ۔“ وہ حیران نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی چونکہ ایک اکڑ اور بد دماغ سا شخص محسوس ہوا تھا اور آج اتنا اخبار اور مہمان نوازی کی حیرت کو بھینچا ہوا ہے خدا حافظ بھی گویہ در میں آگے بڑھ گئی تھی۔

اگلے روز وہ ان سے ملنے شام کے وقت آئی تھی اور یہ دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی کہ وہ اپنے گھر آئے۔ انہوں نے بڑی کرگوشی سے اس کا استقبال کیا تھا۔ کل کی نسبت وہ آج ان سے کافی دیر تک باتیں کرتی رہی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں جس پر اویس کو دم ہو گیا ہے کہ وہ بیمار ہو گئے ہیں۔

”بالکل بالکل ہے۔ یہ اویس ذرا سالی بی بی یا بی ہوں اس نے تھکے جا دیا جیسے میں کتنا خطرناک بیمار ہو گیا ہوں۔ اصل میں مجھ سے محبت بھی تو بہت کرتا ہے ہاں شاید اس لئے میرے لئے اچھی فکر کرتا ہے۔“ اسنے دونوں سے میرے ساتھ لگا کر بیٹھا ہے۔ اس وقت بھی میں نے زبردستی گھر بھیجا ہے کہ جا کر قیودی دیر آرام کر کے آؤ۔ حالانکہ میں نے کتنا کھمایا ہے کہ سچے آتی جلدی اوپر جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے تھک رہا ہے بچوں کی بھی شادی اور کراہی ہیں۔“ وہ اپنی عادت کے مطابق بیٹھے بیٹھے اس میں مصروف تھے۔ حالانکہ ان کے چہرے ہی سے کزردی اور بیماری ظاہر ہو رہی تھی مگر شاید انہیں اپنی تکلیفوں کا اشتہار اٹھانا پسند نہیں تھا اسی لئے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کر رہے تھے۔ اس روز وہ ایک گھنڈا ان کے پاس بیٹھی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ زبردستی یہاں سے ڈسچارج ہونے کا پروگرام بنا چکے ہیں اس لئے شاید وہ کل گھر چلے جائیں۔

”زیست ہی تو کرتا ہے وہ میں گھر پر بھی کر سکتا ہوں۔“ وہ مطمئن انداز میں بولے تھے۔

اگلے روز اس اوپر میں میں مصروف وہ فیصلہ ہی نہیں کر پائی کہ ان سے ملنے جانے یا نہ جانے۔ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ باہر چلے سے ڈسچارج ہو گئے ہیں یا نہیں۔ وہ دن تو بچی گزر گیا۔ اس سے اگلے دن جمعہ تھا۔ اسی لئے وہ اسکول کی چھٹی جلدی ہونے پر گھر واپس آ رہی تھی۔ گاڑی گھر کی طرف موڑنے سے خیال آیا کیوں نہ ان کے گھر پر معلوم کر لیا جائے کہ وہ واپس آ گئے ہیں یا نہیں۔ اس سوچ کے ذہن میں آئے کی وہ دیر تھی کہ وہ فوراً گاڑی ان کی گلی میں موڑ گئی۔ ان کے گیٹ کے سامنے گاڑی روک کر اس نے چونکدار سے ان کی موجودگی کی بابت دریافت کیا اور جواب اثبات میں آیا تو اس سے کہا۔

”اندر جا کر اٹکل کو بتا دو کہ میں آ چکا ہوں۔“

چونکہ انہوں نے وہاں سے گزرتے کسی گھام کے ساتھ پیغام بھجوایا تو اس سے بولا۔

”آپ اندر تشریف لے جائیے۔“ اس کی بات پر وہ گیٹ سے اندر داخل ہو گئی اور بغور اندر گردا گرد کا جائزہ لینے

گئی۔ لان میں موجود پردوں کی بہتات سے وہ ابھی اچھی طرح لطف اندوز بھی نہیں ہو پائی تھی کہ ملازم بھاگتا دوڑتا اس طرف آیا اور اس سے بولا۔

”آپ جلدی سے اندر چلیں وہ اسے ناراض ہو رہے ہیں کہ آپ کو باہر کیوں کھڑا کیا ہے۔“ اسی ہی لمحہ میں وہ گھر کے مختلف حصوں سے گزرتی آخر کار لانچ میں سے اوپر جاتی میز جیوں پر حتمی ایک کرے میں داخل ہوئی۔ وہ شاید آپ خود ہی کرے سے باہر نکلنے والے تھے اسی لئے کھڑے ہوئے نظر آئے اسے دیکھ کر ان کے چہرے پر مسکراہٹ نکلی گئی۔

”آؤ بیٹا بیٹھو۔“ اسے بٹھا کر وہ ملازم کی طرف متوجہ ہوئے۔

”صرف نام ہی کے اخلاق ہو۔ ورنہ اخلاق اور تیز چمکو کر بھی نہیں گزری۔ بتاؤ ذرا اتنی دھوپ میں بچی کو باہر کھڑا کیا ہوا ہے۔“ ان کی ڈانٹ کھا تا وہ بے جا رہا باہر جانے لگا تو فوراً بولے۔

"میری بیٹی کیلک دفعہ میرے گھر آئی ہے۔ بڑی اچھی سی خاطر تواضع ہوئی چاہئے۔" وہ انھیں منع کرنا چاہتی تھی کہ وہ صرف کھڑے کھڑے ان کی خیریت دریافت کرنے آئے ہے مگر وہ سمجھنے کے موڑ میں بھی نہیں تھتے۔ اس نے جانے کے لئے زیادہ زور دیا تو بولے۔

”کیا گھروالے پریشان ہو رہے ہوں گے؟“ اگر ایسی بات ہے تو یہاں سے فون کر کے بتا دو کہ تم میرے پاس ہو اور اب میرے ساتھ لُچ کر کے ہی جاؤ گی۔“

”میرے لئے کوئی پریشان نہیں ہوتا۔ میں اگر سارا دن بھی گھر سے غائب رہوں تو کسی کو قطعاً کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

وہ پہلی مرتبہ اپنی ذات کے حوالے سے ان سے کچھ بولی تھی۔ انہوں نے اس کی بات کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا صرف ایک گہری نظر اسکے چہرے پر ڈالتے ہوئے بولے۔

”مہجرو فکر کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ آرام سے بیٹھو۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ تم اسکول میں سے سیدھی بیٹیں آ رہی ہو ایسا کروم نہ ہاتھ دھو کر فریض ہو جاؤ۔“ انہوں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ کئے بغیر اسے آرام سے موضوع بدل دیا کہ حیران ہو گئی۔ وہ جتنا پر تکلف ہونے کی کوشش کر رہی تھی وہ اسے اتنا ہی مگر کارفرمانے پر تلے ہوئے تھے۔ وہیں ان کے ہاتھ روم میں نہ ہاتھ دھو کر اس نے ان کے ساتھ ان کے کمرے میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ وہ اسے اصرار کر کے مختلف چیزیں کھلا رہے تھے۔

”یہ برائی لو، یہ سچن لو۔ اچھا سوچ ڈال تھوڑی اور لے لو“ ان کے اسے اصرار پر مجبور ہو کر اسے اپنی روٹھ سے ہٹ کر کچھ زیادہ ہی کھانا بڑھ گیا۔ وہ خود پر ہیزی کھانا کھا رہے تھے۔

کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے انہوں نے آپس میں بہت ساری باتیں کیں۔ وہ تین گھنٹے ان کے ساتھ گزار کر جب وہ واپس جانے لگی تو وہ اس سے کہنے لگی۔

”میں تو اس بینڈ ریٹ کے ہاتھوں تنگ ہوں۔ ادیس ہاسپٹل سے لانے پر صرف اس شرط پر راضی ہوا تھا کہ میں گھر مکمل آرام کروں گا۔ اسی لئے آج کل پارک جانے پر بھی باندی عائد ہے۔ جتنا تم آئی ہو تو بتا دیجھاں جا

”ہے۔ کیا تم کل بھی آؤ گی؟“

کے پاس آتے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اس روز بھی وہ ان کے گھر آئی ہوئی تھی۔ ادھر ادھر کے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے کچھ عی و دگر زری تھی کہ اخلاق ان کے لئے ناشتے کے ٹے سجائے چلا آیا۔ اسے دیکھ کر انہوں نے نکو و اسو

منہ بنایا اور بولے۔

"تو کیا تاج مسج میں نے دودھ، اب یہ ناشتہ کیا تک بنتی ہے۔" وہ بڑی عاجزی اور خوشامد انداز میں فرے ان کے سامنے رکھتا ہوا بولا۔

"اوس بھائی کا چار روپوں آچکا ہے کہ پایا جانی نے ناشتہ کیا نہیں۔ اگر آپ نے ابھی بھی ناشتہ نہیں کیا تو وہ مجھ پر بہت ناراض ہوں گے۔"

"کیک تو اس لڑکے نے ہرانا تک میں دم کر رکھا ہے۔ زبردستی اوٹ ٹانگ چیزیں کھائے چلا جاتا ہے۔ صبح بھی مجھ سے ناراض ہو کر گیا تھا کہ میں اس کے سامنے ناشتہ کیوں نہیں کر رہا۔" وہ بڑی بے زاری اور ناراضگی سے بول رہے تھے۔

"اگلہ دو ٹیکہ تو کیتے ہیں۔ آپ کو اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہئے۔ تھوڑا سا کچھ لیں۔ پلیز میری خاطر۔"

ان کا دیا مان اور صبر اس سے ایسے پتلے ہوا گیا تھا جو اس نے اس سے پہلے کبھی کسی سے نہ کئے تھے۔

"یہ پیٹھیں..... بد مزہ کھانے تو میں کسی کی خاطر بھی نہیں کھا سکتا۔ شک آگیا ہوں میں یہ بد ذائقہ اور پرہیزی چیزیں کھا کا کر۔" وہ کسی چھوٹے سے بچے کی طرح رو رہے تھے۔ انداز میں بولے تو وہ مسکرا دی اور بولی۔

"چھو آپ مجھے تائیں آپ کا کیا کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ میں آپ کی پسند۔ مطابق کھانا بنا کر لاؤں گی۔" وہ انہیں کسی بچے کی طرح ڈیل کرنے لگی تو وہ کچھ حیرانی سے بولے۔

"تم بناؤ گی؟"

"جی میں بناؤں گی۔ آپ نے کیا مجھے بالکل ہی چھوڑا ہر سلیقہ کھو گیا ہے۔ جلدی تائیں کیا بناؤں۔" وہ کھڑی ہو گئی تھی جیسے اب یہ ہم دوسرے کمرے کی طرف لے جائے گی۔

"مجھے اہر کی دال چاول اچار کے ساتھ کھانا ہیں۔ خوب مرچوں والی دال جس پر اصلی کھجی کا بھار لگا ہو۔"

وہ منہ میں پانی بھرتے ہوئے بولے۔

"اوہ بعد میں اویس سے ڈھٹے کھاؤں کہ میرے پایا جانی کو اصلی کھجی اور اچار کیوں کھلایا ہے۔" وہ جتنے ہوئے بولی تو وہ بھی مسکرا دیئے اور کہنے لگے۔

"چلو اصلی کھجی نہ کسی کورن آئل کا بھجرا بھی چلے گا۔" اخلاق چیپ چاپ کھڑا ان کے مذاکرات سے محفوظ ہو رہا تھا۔ انہیں تھوڑی دیر انتظار کرنے کا کہہ کر وہ اخلاق کے ساتھ ہی کچن میں آگئی۔ وہاں موجود خانا سال نے اسے حیران ہو کر دیکھا تھا۔ گزشتہ چند روز سے گھر میں پابندی سے آئی اس لڑکی کا صاحب سے کیا رشتہ ہے یہ بات وہاں کے تمام ملازمین کے لئے سوالیہ نشان تھی۔ یہ گھر جس میں کسی عورت کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہاں تک کہ ملازم بھی سارے مرد ہی تھے، وہاں انہوں نے کبھی مرچیدگی لڑکی کو آتے دیکھا تھا۔ گردن اس سے پہلے یہاں صرف بطور مالومر تھوڑی بہت دو کڑی خواتین یا لڑکیاں آتے دیکھی گئی تھیں۔ اخلاق اسے وہاں چھوڑ کر چلا گیا اور وہ خانا سال سے چیزوں کے بارے میں پوچھتی جلدی جلدی پکائے میں مصروف تھی۔ دال چڑھ گئی اور چاول اس نے جن لئے تو سوچا کہ اس کے پکے میں تو تھوڑی دیر لگے گی جبکہ وہ بھوکے پیٹے ہوئے ہیں۔ اس خیال کے آتے وہ سوچنے لگی کہ انہیں کیا دے۔

کاٹی دیو غور کرنے کے بعد اس نے ان کے لئے گریپ فروٹ کا جوس نکالے کا سوچا۔ وہ سٹریس پر پریس میں گرہ پب فروٹ کا جوس نکال رہی تھی جب اسے لاؤنج سے آتی اور خانا سال کی جویفینا اوس کی تھی وہ اخلاق سے کبرہا تھا۔

"پاپا جانی نے کچھ کھایا؟" وہ ایک دم گھبرا گئی تھی۔ پتہ نہیں اس کی اپنے گھر میں کتنی بے تکلف آمد کو وہ پسند بھی کرتا تھا یا نہیں۔ اس شخص کے چہرے پر موجود تاثرات سے وہ کبھی بھی نہیں جانتا جانی کتنی تھی کہ وہ اس کے لئے کس انداز سے سوچا ہے۔ لیکن اسے لگتا تھا کہ وہ شاید اسے پابندی کا ہے۔

اخلاق سے کچھ کہہ کر وہ کچن کی طرف آگیا تھا۔

"شاید پاپا جانی کے لئے کھانا نکالوں میں....." وہ بڑے مصروف انداز میں بولتا ہوا کچن کے چھوڑے میں آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اپنا جملہ اوصاف چھوڑ کر اسے حیرانی سے دیکھنے لگا تھا۔ شاید اتنا بے تکلف مہمان اس نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ہی دیکھا تھا۔ ایک لمبے کوتا سے ایسا لگا کہ یہ گھر جالا کا ہے وہ یہاں مہمان ہے۔ وہ اسے استحقاق سے کچن میں کھیل کے پاس کھڑی ہو گئی۔

"السلام علیکم۔" وہ اپنے آپ بھی بے ادب محسوس کر رہی تھی۔ مگر بہر حال اس نے سلام کرنے میں پہل کر دی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" اس کے چہرے پر پہلی شرمندگی دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ وہ شاید توقع نہیں کر رہی تھی کہ اس وقت بھی گھر آ سکتا ہے اور اب اسے سامنے پا کر وہ کبھی ٹپل کر رہی تھی۔

"خیریت سے ہیں آپ؟" وہ اس کی شرمندگی نظر انداز کر کے بڑے عام سے انداز میں بولا تو اس نے گردن ہلکا کر ہی خیرت سے آگے کر دیا تھا۔

اسے مزید شرمندگی سے بچانے کے لئے وہ وہاں سے پلٹ گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی اچالانے کب سے اٹکی ہوئی سانس بحال کی تھی۔ ہاٹ بیٹ کو ٹال کر دئی وہ جگ اور گھاس لڑے میں رکھ کر ان کے کمرے کی طرف چلی آئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ انہیں جوس پا کر فوراً گھر مسدھارے گی۔ لیکن بغیر دروازہ ٹوک کے وہ آرام سے اندر داخل ہوئی تو وہ ویڈیو پران کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا میری قسمت میں بیٹھنے کی اس شخص کے سامنے شرمندہ ہونا لکھا گیا ہے۔ کیا سوچ رہا ہو گا وہ کہ میں کتنی ال مسرور اور ان کچھ لڑی ہوں۔" وہ اپنے بے یقینی پان کوکوں کر رہ گئی تھی۔ وہ دونوں آپس میں کوئی بات کر رہے تھے۔ اسے ایک دم انداز آ گیا کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"لگتا ہے تم بھی دشمنوں کے کیپ میں شامل ہو گئی ہو۔" وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی لڑے دیکھ کر ناراضی سے بولے تو وہ احتجاجاً ہاتھ اٹھا۔

"یہ دشمنوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"میں کوئی تم سے ڈرتا ہوں ابھی جلی میری بھئی کو بھی یہ نہیں کیا بیٹیاں پڑھاتی ہیں کہ گھٹنے بھر سے کچن میں جتی ہوئی تھی۔" وہ اس تمام بیگشتوں سے بچے انداز کے سامنے لڑے رکھ کر مومن پر بیٹھ گئی۔

"اور وہ دال چاول کیا ہوئے؟" انہوں نے برا سامنہ بنا کر اس سے دریافت کیا۔

”وہ ابھی پک رہے ہیں۔ تھوڑی دیر اور لگے گی۔“ اسے سامنے پا کر وہ بڑی رکی سے انداز میں انہیں جواب دے کر اپنے ہاتھوں پر نظر پڑھا کر بیٹھ گیا۔ اگر وہ یہاں نہ ہوتا تو وہ خود اپنے ہاتھوں سے انہیں جوس پلاتی۔ ”صرف تمہاری وجہ سے یہ بی رہا ہوں۔ ورنہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے مجبور نہیں کر سکتی تھی۔“ وہ خفا خفا سے انداز میں بولے گا کہ میں جوس ڈال کر کھونٹ کھونٹ پیئے لگے۔ وہ اس جادو اثر لڑکی کو دیکھ کر رہ گیا تھا جو اسے آرام سے کام سر انجام دے گئی تھی جسے کرنے میں وہ صبح سے ناکام تھا۔

”آپ کو یاد ہے ناں آج ڈاکٹر بھاری سے اپنا ہسپتال ہے۔ میں اپنے کمرے میں ہوں آپ تیار ہو جائیں تو مجھے بلوائے گا۔“ انہوں نے خالی گلاس ٹرے میں رکھتے ہی تھوچی سے اس کی بات سنی تھی جبکہ وہ کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ وہ پتیلی ہی جانے کے لئے بیٹھ بیٹھ تھی جب ان کے جانے کا سنا تو اس کے کمرے سے نکلے ہی خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ حالانکہ اسے مزے دکنے کے لئے مجبور کر رہے تھے مگر اس نے سہولت سے معذرت کر لی تھی۔ جانے سے پہلے دھڑک دھڑک کر اور شاہد کو بتایا کہ اگلے آئی تھوڑی دیر بعد دل چاہو دل چاہو پناہ سے چلی آئی تھی۔

اگلے روز روزہ ان سے ملے نہیں آئی اور صرف فون کر کے ہی ان سے بات چیت کر لی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کا انتظار کر رہے ہوں گے وہ خود بھی تو ان سے ملنے اور باتیں کرنے کی اپنی عادی ہو گئی تھی کہ ان سے ملے بغیر وہ ایک دن بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ مگر وہاں موجود وہ قد سے مفروز اور اکڑ سا بندہ اس کے وہاں جانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ وہ شاید اپنے پاپا جانی کے لحاظ میں اسے کچھ کہتا تو نہیں تھا مگر اب جالا کو اندازہ تھا کہ وہ ایک غیر اور امجان لڑکی کا اسے بے شکایت انداز میں اپنے گھر آ کر پسند نہیں کرتا۔ اور کسی کے گھر نہ پانچ روزہ رہتی کا بن بلایا مہمان بن کر جانا اسے بڑا اکڑ سا لگ رہا تھا اور جو کسی روز وہ تمام تر تلی تلی اور دمردن ایک طرف دکھ کر اس سے کہہ دے کہ گھر میں آ جا ہمارا چچا چھوڑ نہیں سکتیں تو وہ شرم اور غیرت کے مارے شاید مری جائے۔

گھر تیسرے دن وہ اپنے ہمبند سے چھر گئی کہ اب وہاں نہیں جانا اور دوبارہ اسے ان کے گھر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اسے پتہ تھا کہ ان دنوں وہ اپنی باریک بینی سے ہاتھوں تلک آ کر بڑے ڈپریشن سے رہنے لگے تھے اور ان کی اداسی پر وہ ہرگز بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بڑے پیار سے اور دل سے ان کے لئے بہت کم سامان لے کر ہلکا سا تلک ڈال کر طیم بنایا۔ ان کے پیڑ کو ٹوٹا خاطر رکھتے ہوئے اس نے مرنے کا گوشت استعمال کیا ڈو گئے شمس علیم کے اوپر خوب اچھی طرح ہر ادویہ اور کیوں وغیرہ سہا کر وہ فارغ ہو کر تو خیال آیا کہ فون کر کے معلوم کر لیتی ہوں وہ اکیلے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ بھی ہوا تو ڈرامائیک کے ساتھ طیم بھجوا دوں گی۔ مگر اسے اسے جتنی مصروف دیکھ کر بڑی حیرت سے پا چھا۔

”کیا پکا رہی ہو؟“ عرصہ ہوا وہ گھر اور کمرے متعلق تمام امور سے لاتعلقی ہو چکی تھی۔ اس نے سرسری سے انداز میں جواب دیا تو وہ جو شاید مسخود کے لئے کچھ کئے آئی تھیں، اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ وہ فون کرنے کے لئے لاؤنج میں آ گئی۔ تیسری ہی تلی فون پر ریسور کر لیا تھا۔ اخلاقی کی آواز وہ اس طرح بیچان کی تھی۔

”میں جالا بل رہی ہوں۔“ اس کے استغفار پر وہ بولی تھی۔

”نہیں ہیں آپ؟“ صاحب آپ کو بہت یاد کر رہے تھے۔“

اسنے دن سے وہ ان کے گھر منتقل آ چارہ تھی اسی لئے وہ اٹھارہ انیس سال کا لڑکا بڑی اپنائیت سے اس سے بول رہا تھا یا شاید گھر کے مالک کی اس والہانہ محبت اسے بتائی تھی کہ وہ کوئی عام ہی مہمان نہیں ہے۔

”اگلے ہیں گھر پر؟“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے مطلب کی بات کیسے پوچھے۔

”ہاں وہ گھر پر ہی ہیں۔ آپ بات کریں گی کیا ان سے؟“

”اوہیں ابھی ہیں گھر پر۔“ اس نے لہجے کو بڑا سرسری سا بنا کر پوچھا جیسے یہ بات وہ بونجی اتفاقاً پوچھ بیٹھی تھی۔

”اوہیں بھائی تو کہیں مجھے ہونے ہیں آپ کو کیا ان سے کوئی کام ہے؟“ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر آتا اوہیں اپنا نام نہن کر رک گیا۔ اس وقت اس کا بھائی کی کال انیڈ کرنے کا موشن ہو رہا تھا اس لئے دور کھڑا ہو کر صرف یہ دیکھنے کے لئے رک گیا کہ کہیں کوئی ضروری فون نہ ہو۔ دوسری طرف پتہ نہیں کون تھا جس سے وہ بڑی خوش اخلاقی سے کہہ رہا تھا۔

”اچھا آپ آ رہی ہیں۔ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ صاحب خوش ہو جائیں گے ہی خدا حافظ۔“ وہ فون رکھ کر حرا تو اوہیں کو کھڑا کی کہ سلام کرنا تھا مگر ابھی پاپا جانی کو اس کی آمد کے بارے میں بتانے کے لئے چلا گیا۔ اس سے کچھ پوچھے بغیر یہ جان گیا تھا کہ یہ فون کس کا تھا۔ حالانکہ وہ اس وقت صرف کپڑے بیچنے کے گھر آیا تھا اسے ہم خانہ جانتا تھا۔ مگر اپنا جانے کا پروگرام اپنی انصورتی کر کے وہ دنوں لاؤنج میں بیٹھ گیا۔

وہ اپنے بارے میں بڑا خود گاہ تھا۔ اسے پتہ تھا کہ لوگ اسے مفروز کہتے ہیں۔ کتنے لوگ اس سے بات کرنے اور اس سے قربے آنے کے لئے ہزاروں جتن کرتے ہیں اور وہ انہیں متنبی نہیں لگاتا۔ اپنے پاپا جانی اور قریبی دوستوں کے علاوہ اس کا دیکھنا تمام افراد کے ساتھ ایسا نہ ہے۔ یہ بات شاید وہ ان سے بات کر کے کوئی بہت بڑا احسان کر رہا ہو۔ وہ عام طور پر لوگوں سے زیادہ ملکہ ملکہ پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر یہ لڑکی ابھی اس صبر و حیا سے پاپا جانی کو بڑی عزیز ہو گئی تھی اس کے لئے وہ اپنے تمام اصول اور ضابطے ترک کر سکتا تھا۔ اسے ابھی اندازہ تھا کہ دیگر افراد کی طرح شاید وہ بھی اسے مفروز اور خود پرست سمجھتی ہے اور شاید وہ خود بھی دوسروں سے دینے رہا اور بات چیت کرنا پسند کرتی ہے اسی لئے اس سے فوری ہونے کی کوشش کرنے کے بجائے وہ وہاں اس کی موجودگی میں آنے سے ہمہ گیر کر رہی تھی۔ اس نے ایک کی زندگی میں صرف لڑکیوں کو اپنے پیچھے پیڑ فونوں کی طرح منڈلاتے دیکھا تھا۔ شاید یہ لڑکی اس سب سے مختلف تھی اور اس کی یہ غلطی تھی کہ وہ اس کی یہاں آ کر وہ نہیں کرتا وہ اسے دور کر دیتا چلتا تھا۔ اگر اس کے پاپا جانی اس لڑکی سے محبت کرتے تھے اس کے ساتھ تو گرا تا انہیں اچھا لگتا تھا تو وہ کون کون تھا امتزاش کرنے والا۔ وہ تو اتنا اس کا شکر گزار تھا کہ وہ یہاں آ کر ان کو تنہی دیتی ہے ان کا دل بڑھانے کی کوشش کرتی ہے۔

ٹھیک دس منٹ بعد وہ لاؤنج کا سلائیڈنگ ڈور کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر صوفے پر بیٹھے اوہیں پر پڑی تو وہ دل میں اخلاقی کو گالیاں دیتی آئے ہوگی۔ اس کی جھکی تو اب واضح تو جایا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر اخلاقی کا کھڑا ہوا بلاوا۔

”السلام علیکم۔“ اس نے بڑی بے دلی سے سلام کا جواب دیا۔

”آپ بیٹھے پایا جانی کے کسی دوست کا خون ادا ہوا ہے وہ اس میں بڑی ہیں۔“ وہ بڑی نرم ی سرکراہت چہرے پہ لاتا ہوا ہوا۔ اسے مجبوراً صوفے پر بیٹھنا ہی پڑ گیا۔ اسے بھلا خود بھی سامنے بیٹھ گیا۔ اپنے ہاتھ میں پکڑا ڈھونڈ اس نے سینئر ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ بدور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا جبکہ دیکھ ابھی ہوئی ہی بیٹھی تھی۔

”میں اسے توں سے آپ کا شکر یہ ادا کرنا چاہ رہا تھا لیکن اتفاق سے آپ سے ملاقات نہیں ہو پا رہی تھی۔“

وہ قہج سے اس کی طرف دیکھنے کی تو وہ اپنی بات کی وضاحت کرنے لگا۔

”آپ پایا جانی کا خیال کبھی نہیں۔“ انہیں اتنا نام دینی ہیں۔ ظاہر ہے آپ کی اس مہربانی کو مجھے آپ کا شکر یہ تو ضروری ادا کرنا چاہئے تھا۔“ وہ اسے ہماری بحریم شکرانہ الفاظ پر بولکھ کر دئی۔ لیکن اب اس کی بات کے جواب میں کچھ نہ کہہ کر ابھی ضروری تھا اس لیے کچھ ضرور سے اعزاز میں ہوئی۔

”اس میں شکر یہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ پلیز اس ذکر کو رہنے دیجئے۔“

”آپ کبہری ہیں تو رہ دیتا ہوں ورنہ یہ آپ کا میرے اوپر احسان ہی ہے۔ پہلے میں آفس میں بیٹھ کر پایا جانی کی طبیعت کی طرف سے پریشان رہتا تھا آپ کے ہونے سے تسلی رہتی ہے کہ وہ اکیلے نہیں ہیں۔“ وہ کچھ شرمندہ سی سرجا کر بیٹھی ہوئی تھی۔

”ہم تو کون کی اس سے پہلے آپس میں انکی کوئی خاص بات چیت نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود پایا جانی کی جدوت میں آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ جب سے آپ انہیں کسی اور کے پاس آپ کے علاوہ بات کرنے کے لئے کوئی ٹاپک ہی نہیں ہوتا۔“ اچالاہ کرتی ہے وہ انکچور بھی اچھے جاتی ہے، اسے کوئی بہت اچھی آتی ہے، وہ بڑی نرم دل اور ہمدرد ہے وغیرہ اس قسم کے بیسٹہ مریخیال ہے جس روز ہی سنتا ہوں۔“ وہ بڑے دستارندہ انداز میں سرکرا کر بول رہا تھا۔ اس کی بات پر ایک لمبی سی سرکراہت اس کے ہونٹوں پر لہرائی تھی۔

”مجھ سے بھی وہ آپ کے بارے میں بہت ساری باتیں کرتے ہیں۔ بلکہ پہلے جب میں ان سے پارک میں ملا کر تھی اس وقت بھی آپ کا غائبانہ تعارف تھا۔“ وہ ایک نظر اس کے چہرے پر ڈال کر دیکھتے میں اس کی بولی تھی۔

”اس غائبانہ تعارف میں یقیناً میری خوب ترغیبنیں ہی ہوتی ہوں گی۔“ قبول میرے دوستوں کے میرا داغ انہیں اتنی سیدھی ترغیبنوں سے خراب کیا ہے۔

وہ بڑی فٹنگی سے سرکرا کر بولا۔ وہ ابھی اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ وہ بیڑھیاں اترتے نظر آئے۔

”کل کہاں تھیں یہ وہاں لڑکی۔“ میں نے تمہارا اکتا انتظار کیا۔“ وہ دوسری سے بولتے ہوئے آپ قریب آ کر اس کے سر پر ہاتھ بھرتے ہوئے ہوئے۔

”گنا ہے تم مجھ سے ہو رہی ہوگی۔“

”نہیں اگلے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ میں کچھ بڑی تھی اس لئے نہیں آسکی تھی۔“ وہ ایک دم بولکھ کر وضاحت کرنے لگی تو وہ تہجد لگا کر فز بڑے۔ وہ دعاغشی سے بیچانہ دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

”اس میں کیا ہے؟“ ان کی نظر ٹیبل پر رکھے دوڑتے پر بڑی تو پوچھ گئے۔

”میں آپ کے لئے علم کیا کرلائی ہوں۔“ وہ ان کے برابر میں صوفے پر بیٹھنے ہوئے ہوئی۔

”علم لائی ہو۔ زبردست، لیکن یہ میرے کھانے پینے کا دشمن مجھے کبھی نہیں علم کھانے دے گا۔ اسے ہر بات میں کوئی شمول اور ریکورڈ کا رقم کتابت کرنا چاہتا ہے۔“ وہ کچھ اچھی سے بولے۔ ”لیکن یہ میں نے چکن میں بنایا ہے اولیو آکس use کیا ہے میں نے اور سارے کبھی بہت پکچر رکھے ہیں۔“ وہ دھونڈا ہوئی۔

”لیکن بات ہے تو لاؤ ابھی کھا کر دیکھا جائے تم نے کیسا علم پایا ہے۔“ اخلاقی کی تلاش میں نظریں دوڑاتے ہوئے اسے موجود نہ پا کر اس سے بولے۔

”ذرا ہلکا کر لیجئے سے ایک پیٹ اور کچھ تولے آؤ۔“ اویس سرکرا ہوا پایا جانی کی چٹائی دیکھ رہا تھا۔

”طہری لے لے“ انہیں ورنہ یہ ساری میں شروع ہو جائیں گے۔“ وہ اس کے بدلے ہوئے سے مختلف اعزاز پر دل بھر کر حیران ہوئی چکن سے پیٹ چچے لے آئی۔ پہلا کچھ منہ میں ڈالتے ہی انہوں نے اس کی شان میں تفسیرہ خوانی شروع کر دی تھی۔ علم کی شان میں ذہن آسان ایک کتے چارے تھے اور وہ چپ چاپ بیٹھی انہیں کھاتا دیکھ کر دی سی دل میں بہت خوش ہو رہی تھی۔

”تم خرم خانہ نہیں گئے۔“ انہیں اچانک اس کا دھواں آیا تو پوچھ گئے۔

”کچھ ٹھنکن ہو رہی ہے اس لئے پردہ گرام کینسل کر دیا ہے۔“

”شاہد زارا ابھی سی کافی تو پلواؤ۔“ انہیں جواب دے کر شاہد کو آواز دینے لگا۔

”شاہد کو رہے دو۔“ آج ہماری ہماری جینی کافی بنا کر پلانے کی۔ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اویس سے مخاطب ہوئے تو وہ سرکرا کر کہنے لگا۔

”ان سے پوچھ تو لیں کہیں وہ مائنڈ نہ کر جائیں کہ ہمارے ہاں مہمانوں سے کام کر دایا جاتا ہے۔“

”مہمان کیوں ہوئی یہ اس کا اپنا کمر ہے۔“ کیوں اچالاہ کیا تم اسے اپنا کمر نہیں سمجھتے۔“ وہ اس وقت بہت بڑی پھنسی تھی۔ اگلے تو اس سے ہمیشہ ہی اس کی باتیں کیا کرتے تھے خود اس کی سوجدگی کے سبب بڑی طرح زردی ہو رہی تھی۔ کوئی جواب دینے کے بجائے وہ کافی ہانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ وہ دونوں ہی شاید اس کی بولکھات اور زردی ہونے کو محسوس کر گئے تھے اس لئے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ کافی بنا کر وہاں آئی تو وہ آہیں میں گفتگو میں مشغول تھے۔ ان دونوں کو کپ سرو کر کے وہ انہیں لے کر اگلے کے برابر میں بیٹھنے لگی۔ کافی کاسب لیتا وہ ان سے مخاطب ہوا۔

”میں آپ کو تانا تو بھول ہی گیا۔“ ویرا راگ گیا ہے۔ اب آپ ڈسائنڈ کر لیں کہ کب چلتا ہے۔“ اس کی بات پر وہ ایک دم خوش ہوا اٹھے تھے۔

”دوسرے بات کی ہے۔ میں تو ابھی تیار ہوں۔ تم اپنی سہولت دیکھو، اسی حساب سے سلیس کنفرم کر دالو۔“ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہاں کب جا نے کی بات کر رہے ہیں۔ وہ خود ہی اسے بتانے لگے۔

”ہم دادا پوتا ہر سال کہیں نہیں گھومتے جاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ میں اس کے پیچھے لگا رہتا ہوں اور یہ مصروفیات کا بھانڈا بنا کر ناں مشول سے کام لیتا رہتا ہے اور پھر آخر کار سوغندوں کے بعد کہیں یہ حضرت اہل اسبل

ہوتے ہیں۔ اس بار صورتحال کچھ ڈفرنٹ ہے۔ انہیں کیونکہ وہم ہو گیا ہے کہ مجھے اپنی طبیعت کے پیش نظر تھریٹی آپ دہوا کی شدید ضرورت ہے اس لئے میرے کپے بغیر غور ہی پروگرام ارچ کر لیا۔ جیس، روم اور لندن تو پہلے ہی بتا رہے پروگرام میں شامل تھے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ دواہی میں آئے ہوئے عمرہ بھی کر لیا جائے۔ خوش قسمتی سے اس کا ویزا ابھی تو رہا ہی نہیں کیا۔ ان کی وضاحت پر وہ مجھے سمجھ گئے ہوئے انداز میں ہوئی۔

”تھتے ڈوں کے لئے جا رہے ہیں آپ؟“

”کم سے کم ایک مہینہ تو ضرور لگے گا۔“ وہ اس کے اداس چہرے کو دیکھ کر کہنے لگے۔

”اچھا تم یہ بتاؤ وہاں سے تمہارے لئے کیا ملاؤں۔“ وہ شاید اسے پہلے ہی کی کوشش کر رہے تھے۔ اویس کا کافی کا کپ ہاتھ میں لئے بیڑی فرسٹ سے اس کے چہرے کو پڑا رہا تھا۔ اس نے انگلیاں میں گردن ملا دی تو وہ کہنے لگے۔

”ٹھیک ہے پھر میں اپنی سریشی سے جو بھی لے آؤں چپ چاپ رکھ لینا بہت کم کی چیز تو مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے۔“ اسی وقت اویس کے سواہل کی تیل بجی تھی اور اس کیسکی ڈکرتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

اس کے روپے سے کچھ حوصلہ ملا تھا اسی لئے وہ اگلے دن دس بجے ان کے گھر آتی تھی۔ وہ خود گھر پر موجود تھا بالکل الیت گھر پر ہی تھے۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ کل رات بارہ بجے کی غلطی سے وہ لوگ روم جا رہے ہیں پھر وہاں سے جیس، لندن اور آخر میں جدہ۔ ان کی بات پر وہ بہت اداس ہو گئی تھی۔ ان سے اسے دن کی جدائی کا سوچ کر اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اگلے دن اس نے انہیں فون پر ہی خدا حافظ کہہ دیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ان کے سامنے جا کر رو پڑے گی اور وہ اس کے رونے پر حیران ہوں گے ان کے گھونٹے پھر گرنے کے لئے نہیں جانے پر رونے کا کونسا پہلو ہوگا۔

☆☆☆

دن بڑے بے کیف سے گزر رہے تھے۔ وہ جو ان سے روز ملنا ایک روٹین سامین گیا تھا اب ان کے بغیر اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اللہ اللہ کر کے ایک مہینہ رہا ہوا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ فون کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ لوگ ابھی نہیں آئے ہیں۔ پھر وہ روزی فون کر کے معلوم کر لی اور ہر روز اسے اپنا ایک کا سامنا کر پڑتا۔ یونہی کرتے دس روز مزید گزر گئے تھے۔ صرف ایک مہینہ اور دس دن ان کے بغیر فیصلوں کے برابر محسوس ہو رہے تھے۔ اس روز جمعی کا دن تھا۔ وہ دانتے کے بعد بے دلی سے اپنے کمرے میں بیٹھ لیٹی وقت گزارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی وقت سیدہ نے اطلاع دی تھی کہ اس کا فون ہے۔ وہ اندازے سے لگا لی کہ کس کا فون ہو سکتا ہے لاؤنج میں آگئی تھی۔ دوسری طرف الکل کی آواز سن کر وہ ہنسی کے مارے پچھائی تھی۔

”اسے دن دیا گئے آپ نے میں آپ کو اتنا یاد کر رہی تھی۔“ دوسری طرف وہ حیران ہو کر کہہ رہے تھے۔

”اسے زیادہ دن تو نہیں گئے صرف ایک مہینہ اور دس دن زیادہ تو نہیں ہوتے۔“

”آپ کے لئے نہیں تھے میرے لئے زیادہ تھے۔ آپ کا کیا ہے آپ تو وہاں محوم پھر رہے تھے انتظار میں تو

میں سوکھ رہی تھی۔“ وہ اس کے دھننے لچے پر بے اختیار رہنے پڑے تھے۔

لئے یہاں آ رہی ہو یا میں تمہارے گھر آ جاؤں؟“

”میں آ رہی ہوں، ابھی فوراً۔“ وہ جلدی سے بولی تھی۔ انہیں خدا حافظ کہتے ہی وہ فوراً ہی گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ ان کے اور اس کے گھر کے درمیان مشکل سے دس منٹ کا دواک ڈیس تھا۔ وہ بھی اس نے تیز قدموں سے طے کیا تو تین چار منٹ کے اندر ہی ان کے گھر پہنچ گئی۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہ صوفے پر بیٹھنے دی دیکھ رہے تھے اور اوپریں لکڑی پر بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ انگریزی کی اور اردو کے تین چار اخبارات اس کے سامنے بکھرے پڑے تھے۔ اسے اندازہ آ گیا کہ وہ دونوں ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”کیا پیڑھے سے بھی ابھی تو پیلا جاتی ہے دو لڑکیں رکھا ہی تھا کہ آپ بھی بچ گئیں۔“ وہ مسکرا کر بولا تھا۔ ”وہ آپ دونوں کا ایک سال ہے۔ یہ پیلا جاتی رات کو بارہ بجے آنے کے ساتھ ہی آپ کو فون کر دکھانے والے تھے وہ تو میں نے روک دیا کہ انشا اللہ سبھی ہوگی۔ کسی کے گھر فون کرنے کا یہ بڑا ہی اوزار عام ہے۔“ اس کی بات پر پیلا جاتی جواسے ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھارے تھے بول پڑے۔

”تم کیا بل رہے ہو۔ ہماری جیت ہے۔“ اسے فارغ کر کے وہ اچالاکی طرف متوجہ ہوئے۔ ”کیسی ہے میری بیٹی۔ کچھ کمزوری لگ رہی ہو کیا بات ہے۔“ وہ ان کی گھر مندر ہی پر مسکرا دی اور تیلی دینے والے انداز میں ہوئی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ لوگوں کا نور کیا رہا؟“

”نور ایک دم شاندار رہا مں دونوں دادا خوب متوجہ ہوئے۔ لندن میں تو کچھ رشتے دار اور دوست احباب رہے ہیں ان سے ملنا ملا رہا۔ وہاں اتنی خاصی تعریف نہیں ہوئی البتہ روم اور جیس ہم نے فرسٹ سے گھوما۔“ وہ اسے اپنے دورے کی تفصیل سناتے گئے تھے۔

”آپ تو اس سے پہلے بھی وہاں بہت مرتبہ گئے ہوئے ہوں گے۔“ وہ بے شوق سے دریافت کرنے لگی۔ ”ہاں روم تیسری مرتبہ اور جیس چھٹی مرتبہ گیا ہوں میں۔ سب سے پہلی دفعہ جیس اپنی بیوی کے فون میں گیا تھا اور وہ شہر چھڑا تھا اچھا لگا کر شادی کے بعد لڑکیوں کے لئے اس اور میری جیس ہی گئے تھے۔“ وہ کسی تصور میں کھوئے اسے بتا رہے تھے۔ اویس ان دونوں کو تو قتل میں مگن دیکھ کر دوبارہ اخبار میں غرق ہو گیا تھا۔

”اخلاق میرے کمرے میں جو بلیک گلیک شو پر رکھا ہے وہ لے کر آؤ۔“ انہوں نے اخلاق کو با آواز بلند آواز دی اور دوسرے بلاتا کر کے کی طرف چلا گیا تو وہ اس سے کہنے لگے۔

”اخلاق بتا رہا تھا کہ تم روزانہ فون کر کے پوچھتی تھیں ہم لوگوں کے بارے میں۔“

”ہاں آپ نے اسے دن دوں جگہ دے۔ ایک مہینہ کا کدیر گئے تھے۔“ وہ ناراضی سے بولی۔

”اصل میں ارادہ تو خالی عمرہ کے واپس آ جانے کا تھا پھر میں نے سوچا کہ چندہ دن کا ویزا مکمل استعمال کرنا چاہیے قسمت والے ہوتے ہیں وہ جیتیں اللہ اپنے در کی حاضری نصیب کرتا ہے۔ اس لئے پروگرام سے ہٹ کر یہ

اضافی دن مکہ میں نہ گزار گئے۔“ اسی وقت اخلاق نے ایک بھاری بھر کم شو پر لا کر ان کے سامنے رکھا۔

”اچالا کے لئے لاؤم جیس اور میرے لئے ایک کپ گرامر مگن کا جلدی سے لے کر آؤ۔“ وہ بیک میں

سے سامان نکالے ہوئے اس سے بولے۔

”یہ بریلو میں سے تھا ہمارے لیے بیکس سے خریدے ہیں اور یہ پیشنگ بطور خاص ہمارے لیے دیش سے خریدی ہے۔ ہم لوگ دودن کے لیے بغیر بھی گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ آرٹس بندی سے اس لیے کسی نارو ٹایپ پیشنگ سے بڑھ کر کوئی اور تھکا ہوا گاؤں میں لینے کے لیے خریدنا تھا۔ اب یہ نہیں ہے چیزیں جنہیں اچھی کی بھی ہیں انہیں بہر حال۔ میں نے سوچا تم دوسری لڑکیوں کی طرح کا ٹیکس اور چیلری تو زیادہ استعمال کرتی بھی نہیں ہو۔ اس لیے اس قسم کی کوئی چیز نہیں لی۔“

وہ اسے زیادہ جتنی تحائف قبول کرنے سے ہچکچاتی تھی۔

”اگلے آپ کا بہت شکر ہے آپ نے مجھے یاد رکھا۔ لیکن یہ سب بہت زیادہ ہے۔ بس ایک آدھ چیز کافی تھی۔“ وہ انہیں انکار کرنا بھی چاہ رہی تھی اور کرتے ہوئے ڈبکی رہی تھی کہ وہ ناراض ہو جائیں گے۔

”اس کا مطلب ہے جنہیں یہ چیزیں پسند نہیں آئیں۔“ وہ جان بوجھ کر اس کی بات کو غلط رنگ دینے لگے تو وہ بے اعتبار ہوئی۔

”سب چیزیں بہت اچھی ہیں لیکن۔۔۔“

”کوئی لیکن دیکھ نہیں۔“ وہ اس کی بات کا ٹکڑا کر کے اگلے نمبر سے انداز میں بولے۔

”میں جنہیں صرف اپنی کوتاہی نہیں سمجھتا میں ہوں اور تم میرے ساتھ غیر برت رہی ہو یہ وہیں اوسیں تو ہے۔ تمہاری طرح اس کے لیے بھی میں نے بریلو خریدے بلکہ اس نے مذکر کے گھسے پیسے بڑے تمہارے ہی جیسا ہیں اس کے لیے بھی لیا۔ اسے تو مجھ سے کوئی بھی چیز لینے ہرگز تکلیف نہیں ہوئی تم کیا اس سے بھی بڑی ہو گئی ہو۔“ ان کی ناراضی سے ہم کر وہ جلدی سے بولی۔

”آپ ناراض تو مت ہوں آپ آئی ایم سوری۔“

”آج سچہ اگر تم نے میرے ساتھ فیروں والی بات کی تو میں واقعی ناراض ہو جاؤں گا۔“ اوسیں اس تمام بات چیت سے بے نیاز اخبار میں کھبا ہوا تھا۔ اخلاق نے فرے لاکر سامنے کھلی تو اس نے لاکھ جوس کا گلاس اٹھالیا۔

”مہینہ ایک اتنا خوبصورت گولہ کا ہر پہلو خریدے فریڈک گیا۔ حالانکہ وہ تمہارے ہاتھ میں بہت اچھا لگتا۔ لیکن میں نے جنہیں بھی چیلری پہنے ہوئے دیکھا ہی نہیں اس لیے سوچا کہ شاید تم پسند نہیں کر سکتی۔“ وہ کافی پیٹے ہوئے بولے۔

”نہیں! مجھے انہیں ہی ہوتی ہے۔ اگر کبھی کبھی آجے جانے کے لیے بہن بھی لوں تو سخت کوفت ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے بہت سادہ نمبر سے مل رہا ہوا ہے۔ سانس کھینچ لیتی ہے۔“ وہ اپنے سادہ رہنے کی وجہ بتانے لگی تو وہ بے اختیار مسکرا دیے۔

”اوسیں تم سے کہہ رہا تھا کہ اس کی ہر بات سچھی ہے۔ وہ بھی اسی کی طرح سیک اپ اور زیورات سے بے زار رہا کرتی تھی۔“ انہوں نے اوسیں کو مخاطب کیا تو وہ اخبار پر سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور وہ دوبارہ اپنی نظر اس کی سڑک کی طرف گاڑ دیں جسے وہ مل کر رہا تھا۔ اس کی طرف سے اپنی بات کا کوئی جواب نہ آیا کر

وہ کچھ بے حشرہ سے ہوئے۔

”یہ لڑکا کبھی نہیں سمدھرے گا۔“ انہوں نے دل میں سوچا۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر وہ دوبارہ اچالا سے مخاطب ہوئے۔

”صمیمیہ سخت چڑا کرتی تھی لیکن اس کی اس عادت سے۔ مگر وہ بھی ایک ہی تھی۔ اگر کبھی کہنے سننے پر کچھ کہیں بھی لیا تو تھوڑی دیر بعد ہی اس بات کو بھیجی ہوئی ہوتی تھی۔ بالکل تمہاری طرح دھلے ہوئے منہ سے رہا کرتی تھی۔“

”انہیں تیار کرنے کی ضرورت بھی کبھی تھی۔“ اللہ تعالیٰ نے انہیں کچھ سناؤں کر اور خوب تیار کر کے اس دنیا میں بھیجا تھا۔ ان معنوی سہاروں کی انہیں بالکل بھی حاجت نہیں تھی۔“

وہ سامنے دیوار پر کبھی اس تصویر پر بس میں ایک سے دھندلے لڑکی ایک نہایت خوبصورت دوسرے کے ساتھ کھڑی تھی نظر میں جتا کر لیا۔ ہر بار ان کے کھڑا کر اس تصویر کو دیکھ کر وہ بھی سوچا کرتی تھی کہ شاید ایسے ہی جوڑے کو چاند سورج سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ وہ دونوں میں خوبصورتی کا مجموعہ تھے۔ ایک دم پر فیکٹ کپل۔

”تمہارے سادگی سے رہنے کی بھی کیا کہیں ہیں۔“ وہ مٹھارت سے مسکرا کر بولے تو وہ حیرت کر رہ گئی۔

”میں اپنی بات تو نہیں کر رہی تھی۔ میں تو عادت ہی ایسی ہوں۔“ وہ وضاحتی انداز میں بولی تو وہ کہنے لگے۔

”کیوں تمہارے خیال سے کیا تم خوبصورت نہیں ہو؟“ انہوں نے ذرا سی بات کا انیٹو بنا کر بیٹ کو طویل کر دیا تھا۔ وہ ایک نظر اوس پر ڈال کر جوان لوگوں سے کمرے بے نیاز اور بیگانہ محسوس ہو رہا تھا بولی۔

”اللہ کا شکر ہے اس نے تمام چیزوں کے ساتھ بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ سب لوگوں کو تو حسن کا بصرہ نہیں دیتے تھے۔ کچھ لوگوں کو تو میرے جیسا بھی ہوتا تھا بواعام سام۔“ اس کی بات پر وہ تاسف سے گردن ہلا کر بولے۔

”لڑکی تم خود انکساری سے کام لے رہی ہو جنہیں اندازہ ہی نہیں ہے اپنی خوبصورتی کا۔“ ان کی بات پر وہ بے ساختہ مسکرا دی تھی۔

”آپ کو تو میں پیار ہی لگوں گی ہی۔“ وہ ان کی بات کو انجوائے کرتے ہوئے بولی تھی۔

”کیوں تم خود کو کچھ پیاری لگنا چاہتی ہو؟ کون ہے وہ جس کے تعریف کرنے پر تمہیں اپنی خوبصورتی کا یقین آنے لگا۔“

وہ بے صاف ہو چکا کہ حد تک منہ پھٹ بھی ہیں یہ بات وہ جانتی تھی لیکن اس حد تک ہونے سے یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اس وقت ان کی اس بات پر اس کے چوہہ طبق روشن ہو گئے تھے وہ کوئی جواب دینے کی پوزیشن ہی میں نہیں تھی۔

سامنے بیٹھے بندے نے اخبار ایک طرف رکھ دیا تھا اور اب بڑے غور سے اس کا سرخ پر تا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے قریبی لوگوں سے بھی بڑے لے دینے پر زور ڈھکی رہا کرتی تھی۔ اگلے سے اتنی جلدی اتنی سے نکلتی ایک بڑی انہونی اور اس کی فطرت کے خلاف ہوتی تھی۔ مگر اوسیں اور ان کے ساتھ بیٹھ کر اس درجے سے تکلفا نہ بات وہ نہیں کر سکتی تھی۔

اس گفتگو سے بچنے کو فوری طور پر اس کی سمجھ میں بھی آیا کہ کپ اور گھاس لڑے میں رکھ کر واپس چلن میں رکھ

آئے اس خیال کے آتے ہی وہ جلدی سے نرے اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

"انکل آپ کے لئے کافی اور لاؤں؟" وہ جو ہونٹوں میں مسکراہٹ دبائے اسے شوخ نظروں سے دیکھ رہے تھے بے اختیار تہقیر لگا کر ہنس پڑے تھے۔

"نہیں رہتے دو۔" اس کی حالت پر شاید انہیں ترس آ گیا تھا اس لئے تہقیر مختصر کرتے ہوئے جواب دیا تھا اور وہ جلدی سے چکن کی طرف چلی گئی تھی۔ مگن میں آکر دو گلاس مشنڈے پانی کے پی کر اس نے اپنے حواس بحال کئے اور پھر وہیں کھڑے ہو کر دو چادھنٹ گزار دیئے۔ کچھ دیر بعد وہ لاؤنج میں واپس آئی تو خود کو کسی حد تک ناول کر چکی تھی۔

"اچھا انکل میں چلتی ہوں۔" وہ وہیں کھڑے کھڑے ان سے بولی تو وہ ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"آئی جلدی کیا ہے۔" کھانا کھا کر جانا۔

"نہیں مجھے کھر جا کر اپنے بیٹے بھر کے بیٹے شہو بہت سے کام نشانے ہیں۔ اور ویسے بھی میں نے تو ناشتہ ہی اتنا لیت کیا تھا کچ تو شاید ہی کروں۔"

"کوئی بہانہ نہیں ملے گا۔ بھوک نہیں ہے تو کوئی بات نہیں خالی مارا ساتھ دینے کے لئے بیٹھ جانا۔" وہ اس کے اعتراض کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہ تھے۔

"انکل دیر ہو جائے گی۔ کچ مجھے بہت کام ہے۔"

اویس شاید اخبار پڑھ چکا تھا اسی لئے اب فرصت سے بیٹھان دونوں کی گفتگوں پر تھا۔

"وہ مجھے تو بے محظوم ہے کہ تم بہانے بازی کر رہی ہو مگن پھر بھی مان لیتا ہوں کہ تمہیں جلدی ہے۔ لیکن کھانا تو تمہیں پھر بھی کھانا پڑے گا۔" اس سے کہتے انہوں نے شاید کوارڈر سے آکر کھانا لانے کے لئے کہا۔

"تمہاری خاطر آدھا گھنٹہ پہلے ہی کچ کر لیتے ہیں۔" وہ ہتھیار ڈالنے والے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ اویس اس کی بے بسی پر مسکرا کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ان دونوں کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ وہ

اسے اصرار کے مختلف چیزیں پیش کرنے لگے تو وہ روٹھے ہوئے لیجے میں بولی۔

"آپ نے کہا تھا خالی ساتھ دینے کے لئے بیٹھ جانا۔" اس کی بات پر اویس بڑی عجیبی کے ساتھ پاپا جانی سے مخاطب ہوا۔

"یہ بالکل صحیح کہی رہی آپ کو اپنے لئے نظروں کا احترام کرنا چاہئے۔" اچالانے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑی عجیبی کے سے سلاہٹا کھا پاپا جانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں پائی کہ وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا یا بونی بول رہا تھا۔ اس نے اپنی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول اور سلاہٹ ڈال کر انکل کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی۔ کھانا کھا کر وہ فوراً ہی کھڑوٹ آئی تھی۔

☆☆☆

انکل نے واپس آنے کے بعد دوبارہ پارک آنا شروع کر دیا تو اس نے بھی اپنی سابقہ روشیں بحال کر لی۔

اب وہ دونوں پہلے کچر کی طرح روزانہ گھنٹہ دوڑھ گھنٹہ دوڑھ اک کرتے اور دنیا جہاں کے موضوعات پر دل کھول کر اکتفا خیال کیا جاتا۔ اسے ان کے گھر کے ایک مبینہ ہو گیا تھا۔ جب انکل سے پارک میں ملاقات ہو جاتی تھی تو پھر گھر جانے کا کوئی جواز ہی نہ تھا۔ وہ خود چار چار بجے گھر پہنچتے تھے لیکن وہ گئی تھی۔

اس روز وہ اور انکل پارک سے نکل کر باتیں کرتے ہوئے فٹ باچھ پر چل رہے تھے۔ اسی وقت ایک گاڑی ان کے پاس آ کر رکی تھی۔ دونوں ہی نے چونک کر دیکھا تھا۔ اپنی طرف کا شیشہ نیچے کرتے اویس ان لوگوں سے مخاطب تھا۔

"کہاں جانا ہے آپ لوگوں کو؟ آئیے میں ڈراپ کر دوں۔" اس کے شرارتی اعزاز پر وہ بے اختیار مسکرا دی جبکہ انکل بوڑھی شان بے نیازی سے کہنے لگے۔

"نہم برائے فیر سے لفٹ نہیں لیا کرتے۔ جاؤ میاں اپنا راستہ پاؤ۔" ان کی بات کو اس نے خوب انجوائے کیا پھر اس نے بولا۔

"آپ کی بھی سبکی مارے ہے؟" وہ اپنی جانب متوجہ پارکے اختیار دلی میں سر ہلا گئی۔

"آپ آج کل ہیں کہاں؟" نظر نہیں آ رہیں۔" اس نے سوال کیا۔

"نہیں ہوں مجھے کہاں جانا ہے۔" انکل سے تو روز ملاقات ہوتی ہے۔" اس نے عجیبی کے جواب دیا۔ انکل گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے اس سے بولے۔

"اجالا اب یہ اتنا اصرار کر رہا ہے تو میرا خیال ہے بیٹھ جانا چاہئے۔ آجاؤ شاہش۔" وہ اس کے برابر کی نشست سنبھالنے ہوئے اس کے لیے پیچھے کارڈواز کھول گئے تو اسے بھی گاڑی میں بیٹھنا پڑا۔

"چلو اس بہانے آج اجالا کا گھر بھی دیکھ لیں گے۔ اس بے مروت لڑکی نے تو مجھی اپنے گھر نہیں بلایا۔" گاڑی اس کے گھر جانے والی سرک پر مڑی تو انکل بولے۔ ان کی بات پر کچھ پریشان ہی ہو گئی۔ اسے گھر کا تصور

اس کے لئے اتنا بھیا کہ تھا خود وہاں بیٹھنا چاہا کرتی تھی اب انہیں لازمی اندر چلنے کی آفر کرنی پڑے گی وہ کچھ بے چین ہی ہو گئی۔ گاڑی اس جہنم کے سامنے رکی تھی اس کا گھر ہونے کا اعزاز حاصل تھا وہ بڑی بدولی سے گاڑی سے اترتے ہوئے بولی۔

"آئیے انکل اندر چلیے۔" انداز ایسا تھا جیسے مجبور بلا رہی ہو اور وہ جنتیں چہرہ شامی کا دعویٰ تھا کیسے اس کا چہرہ نہ پڑھ پاتے۔

"پھر کبھی وقت آئیں گے انشاء اللہ خدا حافظ۔" انہوں نے پر شفقت انداز میں مسکرا کر معذرت کی تو اویس نے گاڑی اشارت کر دی۔ ان لوگوں کو خدا حافظ کہتی وہ گیٹ میں گھس گئی۔

☆☆☆

وہ اسٹڈی میں بیٹھے اویس نے اپنے آرتھکڑک پیوڑ پر ٹاپ کر رہے تھے۔ وہ تیز رفتاری سے کی ہڈی پر اٹھایاں چلا رہا تھا جبکہ وہ کچھ فاصلے پر ہانگ چیتڑ پر بیٹھے اسے ٹاپ کرنا دیکھنے کے ساتھ مختلف مشوروں سے نواز رہے تھے۔ جہاں کچھ ترسیم کرتی ہوتی تو وہاں جیسے بیٹھے کر دیتے۔ ان دنوں وہ اپنی کتاب کو منظر عام پر لانے کے لئے کام

میں مصروف تھے اور تاریخ وقت میں اویس ان کا بھرپور ساتھ دیا کرتا تھا۔ گورڈور سے آئی اچالا کی آواز ان دونوں ہی کے غلبہ کے ساتھ ساتھ وہ شاید اخلاق سے پوچھ رہی تھی۔

"ابکل کہاں ہیں؟" انہوں نے بے ساختہ وال کلاک کی طرف دیکھا قہارات کے دس بجے اس کا آنا خاصا عجیب تھا۔ وہ زیادہ تر دن میں باہر سے بہت ہوا تو شام میں آیا کرتی تھی۔ اتنے دنوں سے تو وہ ان کے گھر آج بھی نہیں رہی تھی اتنے دنوں بعد آنا وہ بھی رات کے وقت وہ اس کی آمد کی وجہ سوچنے لگے انہیں خیال آیا کہ وہ آج شام پارک بھی نہیں آئی تھی۔ اویس ان کی فکر و پریشانی سے بالکل ناچنگ میں مصروف تھا۔ اسی وقت وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"چنانچہ رات کو آئی ہو سب خیر تو ہے۔" اسے اندر آنا دیکھ کر سب سے پہلے سب جملان کے منہ سے نکلا۔ وہ ان کے سوال کا کوئی جواب دینے بغیر تیزی سے ان کی طرف آئی اور کارپٹ پر ان کے بالکل سامنے بیٹھنے ہوئے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"میں آپ سے ایک بات پوچھنے آئی ہوں۔" اتنی تھذیب یافتہ اور شائستہ لڑکی سے وہ یہ توقع بھی نہیں رکھتے تھے کہ وہ بغیر سلام کے آتے ہی عجیب لالچنی باتیں شروع کر دے گی۔ انہوں نے فوراً سے اس کی طرف دیکھا تو وہ انہیں بہت بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے جھانکنی دشت اور یاد آ رہی تھی وہ حقیقت خوفزدہ کر تھی۔ اویس کی بورڈ اور موٹر سے نظریں ہٹائے اسے ہی دیکھنے لگا تھا کہ وہ اس کی موجودگی سے بے نیاز ان کے گھٹنوں پر اپنے ہاتھوں کی گرفت ختم کرتے ہوئے بولی۔

"آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟" انہیں وہ اس وقت کوئی نفسیاتی مریض محسوس ہو رہی تھی اس کی حالت انہیں تشویش میں مبتلا کرنے لگی تو وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"اچالا کیا بات ہے چنانچہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔"

"آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں یا نہیں۔" وہ ان کا سوال نظر انداز کر کے اپنی بات دہرائے لگی تو وہ اس کی ناچھٹے میں آنے والی کیفیت پر پریشان سے ہو کر اویس کو دیکھنے لگے اس نے آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کیا کہ اس کی بات کا جواب دیں۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ ظاہر ہے میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔"

"بھوت بولتے ہیں آپ۔" وہ اپنے سر پر رکھا ان کا ہاتھ جھک کر بولی۔

"اگر مجھ سے محبت کرتے ہوئے تو میرے بارے میں پوچھتے ہیں کون ہوں میرے گھر والے کون ہیں اور میں گھر سے زار مادی داری کیوں کرتی ہوں۔" وہ ہنپائی انداز میں بچ کر بولی تھی۔

"تمہیں میری جان میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ تم خود سے میرے اوپر مجبور نہ رہو۔ مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤ۔" وہ نرم لہجے میں بولی۔ جس اچالا کو وہ جانتے تھے وہ اس لڑکی سے بہت مختلف تھی جو اس وقت ان کے درمیان کی اور ان کی بھیم نہیں آتا تھا کہ اس کے ساتھ کس طرح بی بیو کریں۔

"ابھی جب میں گھر سے گاڑی لے کر نکلی تو حیران چاہا کہ سامنے سے آتے ڈک سے گاڑی گرا دوں میں

ایسا کرنے لگی وہ اپنی پھر اسی وقت مجھے خیال آیا کہ میرے سر نے پو کوئی روئے والا بھی نہیں ہوگا۔ میں نے سوچا آپ سے پوچھ لوں کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں یا نہیں گھر ہے اب میرے سر نے پو کوئی تو اس ہوگا۔ پہلے میں سوچا کرتی تھی کہ آخر وہ خوشی کیسے کر لیتے ہیں۔ خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی ختم کر لینا کتنا مشکل کام ہے لیکن یہ کوئی اتنا ناممکن کام بھی نہیں ہے۔ آپ میرے سر نے بعد بھی مجھے یاد رکھیں گے ناں۔"

وہ اس وقت تھکا پھرا ہوا میں نہیں تھی۔ وہ اس کی باتوں پر بدل کر مڑے گئے تھے۔

"اچالا یہ نہیں کہتے جانتا۔ مجھ سے بتاؤ ہو کیا ہے۔ کسی نے کچھ مجھ سے گھر والوں سے کوئی ناراضگی ہو گئی ہے۔ شاہش مجھے بتاؤ۔" وہ اسے بچوں کی طرح بھلانے کی کوشش کرنے لگے۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے چہرے پر بختری لٹوں کو سوتارے ہوئے اسے نابل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اچانک ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

"مجھ سے کوئی پیار نہیں کرتا۔ کہ کو میری ضرورت نہیں۔ میں ان واقعہ ہوں اور وہ مادیہ کی برائی تھی کہ میری بدعاؤں کی وجہ سے اس بچہ مر گیا ہے، میں اس سے بیچس ہوتی ہوں۔ اسے خوش دیکھ کر جلتی رہتی ہوں اور میری وجہ سے اس کی زندگی جہنم ہی ہوئی ہے۔"

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اویس ایک دم ہاتھ کر اس کی طرف آیا تھا۔ وہ اس بات سے ڈر رہا تھا کہ کہیں پاپا جانی کی اپنی حالت اس کے رونے کی وجہ سے خراب نہ ہو جائے۔ یہ لڑکی جس سے وہ بہت پیار کرتے تھے۔ اس کا روتا آخر کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ اس کے گھٹنوں پر رکھا اس کا سر اس نے آرام سے اٹھایا تو وہ دھندلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

پاپا جانی تو چپ سادے بیٹھے ہوئے بس ایک کبک اسے دیکھے جا رہے تھے۔ اس کا تو شاید ذہن اور شعور ہی نظام مکمل طور پر متلوں ہو گیا تھا اس لئے اسے دیکھ کر بھی نہیں چوکی اور ان سے کہتے لگی۔

"اور وہ سو درازم سے کھڑا اس کی ساری باتیں سن رہا تھا پھر جب میں گاڑی کی چابی لے کر باہر نکلی اس نے مجھے روک رکھی نہیں۔ ہاں ہوئی میں ہوں بیچس۔ مجھ سے کسی کی خوشی برداشت نہیں ہوتی۔ جب میں خوش نہیں ہوں تو کسی اور کو کیا پہنچتا ہے خوش ہونے کا حیران دل جانتا ہے سارے لوگوں سے ان کی خوشیاں مجھیں لوں میں روؤں تو سب روئیں میں نے مارا ہے اس کے بچو۔" وہ ہر چیخ کر رونے لگی تھی۔

"اچالا اس ہوش میں آؤ۔" اویس نے اسے سمجھوڑا۔

"دیکھو تمہاری وجہ سے پاپا جانی کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ اپنا نہیں تو ان کا خیال کرو۔" اس کی بات پر وہ بے اختیار اس کے سینے پر سر رکھ کر زار و تھکا ہونے لگی تو وہ بری طرح ہولک گیا۔ وہ دین مست بعد اس نے محسوس کیا کہ رونے کی آواز بند ہو گئی ہے ڈر سے ڈرے اپنے سینے پر رکھا اس کا سر اٹھا تو اس کا بے ہوش وجود اس کے ہاتھوں میں بھول کر رہ گیا۔

"اویس ڈاکٹر کو فون کرو۔ پچھیں اسے کیا ہو گیا ہے۔" پاپا جانی اسے بے ہوش دیکھ کر مراسمتی سے بولے۔ "پاپا جانی آپ پریشان نہ ہوں۔ اسے کچھ نہیں ہوا ہے۔" وہ ان کے پریشان چہرے پر نظر ڈال کر

تقلی دینے لگا۔

”کیسے پریشان نہ ہوں۔ میری بچی ایسے حالوں میں پہنچ جائے اور میں آرام سے رہوں۔“ وہ اپنا غصہ اور پریشانی اس پر نکالنے لگے۔

”ہاتھ پاؤں چھوڑ دینے اور پریشان ہونے سے آج تک تو کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔“ وہ کچھ نامی مجھے سے لچے میں کہتا اسے سنہال کر اور سہارا دے کر کھڑا ہوا۔ اس کے بے ہوش جسم کا سارا بوجھ اس کے کندھوں پر تھا۔ آہستہ قدموں سے چلا اسے لے کر وہ پاؤں چاٹنے کے بندہ روم میں آگیا اور بڑے آرام سے احتیاط سے اسے بند پر بلا دیا۔ اس کے پیچھے وہ بھی کمرے میں داخل ہو گئے اور بندہ پر ہالچال کے برابر میں بیٹھے ہوئے انہوں نے دو تین سوئچ بڑھ کر اس کے اوپر چھوٹی گئیں۔ اوہیں اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے ڈالے ہوئے آواز میں دے کر بھی اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس پندرہ منٹ کی جدوجہد کے بعد بھی جب وہ ہوش میں نہ آئی تو اس نے ایک آخری کوشش کے طور پر اس کے اوپر جھک کر اسے آواز دی۔

”اجالا۔ اٹھ۔“ وہ اب ڈاکٹر کو فون کرنے ہی والا تھا کہ اس کے وجود میں حرکت محسوس کر کے رک گیا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسی کہیں بہت دور سے کوئی اسے آواز دے کر بلا رہا ہے۔ یہ آواز اس کی ہے وہ پہچان نہیں پارہی تھی۔ بڑی مشکوک سے اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں تو وہاں موجود دوڑی ہی افراد نے غصہ ادا کیا۔ اپنے ہانگ قریب جھک کر کھڑے ہوئے اوہیں کو دیکھ کر وہ ایک دم اپنے حواس میں واپس آگئی ایک نظر خود پر اور ایک اپنے برابر بیٹھے انکل پر ڈال کر اٹھ بیٹھی۔

دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامے وہ اپنی کچھ دیر پہلے کی دیوانچی پر غور سار بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اس سے کچھ بھی کہ بغیر خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ ہوش و خدو سے بچا گئی کے عالم میں وہ جو کچھ کر گزری تھی وہ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ وہ ساری زندگی کسی بھی کے سامنے نہ کھلی تھی اپنے خول میں بند لوگوں سے دور دور رہی تھی۔ لوگوں کے لئے وہ ہمیشہ ایک نہایت کتاب کی طرح رہی تھی۔ کیا ہو جاتا جدوجہد آئی یہاں نہ آئی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ گاڑی واقعی نہیں لگا رہی۔ یوں خود کو تھاب کر کے وہ اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔ کس حساب میں وہ ان لوگوں کو پریشان کرنے چلی آئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کہیں غائب ہو جائے ان لوگوں کی نظروں سے چھپ جائے جو پتہ نہیں اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔

”بنا دودھ ہو گی؟“ اس نے اپنے برابر بیٹھے انکل کی آواز سنی۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ انکلار میں گردن ہلا سکے۔

”اوہیں شام سے کبھی ایک گلاس دودھ لائے۔“ انہوں نے اوہیں سے کہا تو وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

”میں مگر جاؤں گی۔“ وہ ان دونوں سے نظریں چرائے سر جھکا کر بوٹی تھی۔ وہ اب حریف ایک لمحہ بھی ان لوگوں کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ شاید اپنی محبت سے مجبور ہو کر کچھ کچھ والے تھے کہ اوہیں فوراً ہی واپس اس کی طرف آتا ہوا ہوا۔

”جیسے پاؤں چاٹنا اچالا کو مگر چھوڑ آتے ہیں۔“ وہ اس حالت میں اسے واپس بھیجے کے لئے کسی قیمت پر راضی نہیں تھے لیکن اوہیں آنکھوں میں اصرار لے کر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر درج تاثرات ان سے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ ابھی اس سے کچھ تو پوچھیں وہ بڑی بے چارگی کے عالم میں بندہ پرے اٹھے اور اس سے بولے۔

”چلو کہیں مگر چھوڑ دیں۔“ وہ اپنے وجود کو مکمل منتقلی ہستہ پر سے اتر آئی۔ کمرے سے ہی اسے پورا کمرہ محسوس ہوا وہ لہرا کر بہتر پر کرنے ہی والی تھی جب واپس طرف سے کمرے سے اوہیں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرنے سے بچایا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت کے آگے اس کی مزاحمت بیکار ثابت ہوئی۔ وہ اسی طرح اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ انکل ان دونوں کے پیچھے چلے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر اوہیں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تو وہ چپ چاپ بیٹھی۔ اوہیں نے ہاتھ پر ہا کر دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ انکل اس کے برابر والی سیٹ پر براہمن خود کو ایک دم بہت بڑھا محسوس کرنے لگے۔ وہ دیکھا کہ وہ والی بھی یہ تو وہ جان بچے تھے لیکن اب یہاں سے جا کر وہ کیا کرے گی یہ سوچ انہیں شدید پریشان کر رہی تھی۔ گاڑی شارٹ ہو گئی تھی اور اس میں بیٹھے تینوں ہی افراد اس کی فکر میں غلطان تھے۔

”میں آج کے بعد کسی ان لوگوں سے نہیں ملوں گی۔ کبھی ان کے گھر نہیں آؤں گی۔“ وہ اپنے دل میں محسوس ارادہ کر رہی تھی۔

”لیکن آج کے بعد میں ہوں گی تو کہیں جاؤں گی۔ بس اب اس زندگی کی قید سے چھٹکارا پاؤں گی مگر جس کا جودل چاہے میرے بارے میں سوچتا رہے۔“

کچھ دیر پہلے جو ایک شرابچی سی محسوس ہونے لگی تھی وہ ایک دم زائل ہو گئی اور وہ ابلی جھلکی ہو کر بیٹھی۔ گاڑی اس کے گیٹ کے سامنے رک توہاں کا پر سکون سامنا دل دیکھ کر اس کے لبوں پر استہزائے سگراہٹ بکھر گئی۔ کسی کو کیا پروا کہ وہ کہاں بھی تھی۔ اگر مرنے بھی تھی تو کسی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا بیٹھ کر اس کا سوگ سنا تا یا اسے دھوئے نہ کی کوشش کرتا۔ خاموشی سے گاڑی سے اتر گئی اور بغیر ان لوگوں کی طرف دیکھے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔

”اجالا ایک منٹ رکو۔“ اپنے پیچھے انکل کی آواز سن کر وہ رک گئی۔ گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو وہ گاڑی سے اتر کر اس کے پاس آ رہے تھے۔

”جسواں تم نے مجھ سے کیا تھا وہی تم سے کر رہا ہوں کہ کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟“ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر بولے۔ وہ بہت تیزی سے ساتھ انکلار کے ان کا دل توڑ دینا چاہتی تھی۔ کیا قیافہ پڑتا تھا جہاں اتنے بہت سے افراد اسے برا سمجھتے تھے اگر اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں۔ اس کی صحت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اپنی سوچ کے برخلاف وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔

”مگر میں تمہیں اس محبت کی قسم دے کر کہہ رہا ہوں تم خود کو ہرگز بھی کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گی۔ اجالا میری جان میں ایڈول کر دوتے روئے تھک چکا ہوں اب مجھ میں کوئی دکھ کوئی صدمہ جھیلنے کی ہمت نہیں بچی۔ اس عمر میں مجھے کوئی دکھ نہ دینا۔“

ان کی آنکھوں میں پلٹتے آنسو اسے عجیب سے دکھ میں مبتلا کر گئے۔ اولیں گاڑی میں بیٹھنا ان دونوں کی باتیں رہ رہا تھا۔

”صرف میری خاطر تمہیں زندہ رہتا ہے۔ مجھ سے وعدہ کر دو تم کوئی غلط حرکت نہیں کرو گی۔“ ان کی محبت اس کے اندر کی سوئی ہوئی اس کا حال کو چکاڑتی تھی جو جیتھوں کی حلائی تھی۔ جو یہ جانتی تھی کہ کوئی تو جو اسے پیار کرے ہے ہوا اور بے حساب۔ جس کے لئے وہ بہت خاص ہو۔ جس کے لئے اس کا بہت بڑا ہمت، اہمیت رکھتا ہوا اور اب وہ ہستی اس کے سامنے کھڑی تھی جس سے اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ لیکن خونی رشتوں سے بڑا کہ وہ اسے چاہ رہے تھے۔ وہ کیسے انہیں مایوس کر سکتی تھی۔ یہ اختیار اس نے گردن ملا کر ان سے وعدہ کر لیا تو وہ مطمئن ہو کر گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ جب تک وہ اندر داخل نہیں ہوئی وہ ٹوک دو دیں موجود رہے تھے۔

☆☆☆☆

”میں اپنے ماں باپ کی ان چابی اولاد ہوں ایک ایسی اولاد جسے اس کے والدین نظر انداز کر دیں جس مگر میں نے اسے آٹھ کھولی وہاں کی کبریٰ ضرورت نہ تھی۔ میرا جد وہاں کے کینٹون کے لئے باعثِ رحمت تھا میرے ڈیڑی ایک چارے گھسے اور پھر ڈا انسان تھے۔ لیکن صرف دنیا والوں کے لئے بظاہر یہ گھڑ اور مہذب انسان اندر سے وہی روا جی مرقا جو حور کا استحصال کر کے اس پر ظلم کر کے اپنی اپنی تکیوں کرتا ہے۔ نہیں، دنیا میں اگر کسی سے محبت تھی تو ان کی ماں تھیں۔ ہماری وادی جو پورے ٹھکانے کی آرزو میں دن من گن گن کر گزار رہی تھیں۔ اپنے انکو سے بیٹے کوئی عہد دیکھنا ان کا اولین اور بڑے خراب تھا۔ لیکن خدا کی خدائی کے سامنے ان کا کچھ زور نہ چلا تھا اور میرے ڈیڑی کے ہاں مکلی اولاد پیدا ہوئی تھی۔ وادی بہت نامرض ہوئی تھیں لیکن ڈیڑی نے انہیں سمجھا بھگا کر مٹا لیا تھا کہ اگلی بار ضرور ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

مہا بانی کے بعد مٹا گیا پھر اپنی نسل نے وادی کے ساتھ ساتھ ڈیڑی کی آگ بھی بکھڑ کر دیا۔ ان دونوں نے مل کر میری زندگی تنگ کر دی۔ انہیں ہر طرح کی اذیت دی گئی تھیں اور دھمکیاں دی گئیں۔ ڈیڑی کو اپنی دونوں بیٹیوں سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ گھر آتے تو بیوی اور بیٹیوں کو برا بھلا کہتے اپنے کمرے میں بند ہو جاتے۔ میری کبریٰ تیری بار پر کینچنت ہوئیں تو بہت ڈوبی ہوئی تھیں ان کے اس گھر میں رہنے کا دارومدار اب صرف آنے والے نئے مہمان پر تھا۔ بنی ہونے کی صورت میں انہیں اس گھر سے نکال دیا جاتا تھا۔ ڈیڑی جی جی جی کے ٹائمر سے انہیں طلاق دے دیے کہ بنی دیکھ دے چکے تھے۔ خدا کو بھی شاید کی بے بسی پر ترس آ گیا تھا۔ اس لئے اس بار وہ اپنے شوہر اور ساس کے سامنے سرخرو ہو گئی تھیں۔ کسی نے اس بار جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا۔ اور میرا بھائی مسعود جو مجھ سے تین منٹ چھوٹا تھا۔

میں پیدا ہونے کی طور پر بڑی صحت مند اور تھنی تھی مسعود بڑا کمزور مرچل اور بیمار سا بچہ ڈاکٹروں نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے اس کی زندگی کی طرف سے مایوس کا اظہار کر دیا تھا۔ تمام گھر والے پر قہر پر اس بچے کی جان بچانا چاہتے تھے۔ میری کئی کو پانا گھر چکا تھا۔ اس لئے ڈیڑی کو وادی کو خوش کرنا تھا اس لئے اولاد کو بچنے کا وارث دیکھنا تھا اس لئے سب کے پاس اسے توجہ دینے کی مسئولیت دے دی گئی۔

ایسے میں کسی کو بھی اس بچی کا خیال نہ آیا جو ماں کی آغوش سے محروم آیا کہ دم و دم کرم پر گھر میں تباہی پڑی رہتی تھی۔

ایک مہینہ باطل رہا کہ جب مسعود ڈاکٹروں کی پیشین گوئی کے باوجود صحت یاب ہو کر گھر آیا تو گھر میں گویا خشتیں کا سیلاب امنڈ آیا۔ وہ سب ہی کا پھینکا اور لا ڈالا تھا۔ لیکن ہی اور وادی کا ہاضموں ہی تو اسے ایک لمحے کو بھی اپنی کمانوں سے اوچل نہ ہونے دیتی تھیں۔ وہ ان کے لئے خشتیں کا پیغام دے کر آیا تھا اس نے انہیں طلاق بھیجے تھیں وارن سے چلایا تھا تو وہ کیوں نہ اسے پاس نہیں لے گی کہ اس میرے لئے کوئی وقت نہ تھا۔ انہیں تو شاید یہ بھی بھول گیا تھا کہ مسعود کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک بچی کو بھی جنم دیا تھا جس کا انہوں نے ابھی تک نام بھی نہیں رکھا۔

میری پیدائش کے دو ماہ بعد میری نانی کو کینسر سے آئیں تو انہوں نے ہی میرا نام رکھا ”جالا شہریار“ میرا نام تو خود میرے لئے ایک لطف ہے۔ جس کی اپنی زندگی اندھروں میں ڈوبی ہوئی ہو وہ اچالا کیسے ہو سکتی ہے۔ نانی نے کسی کو ان کی لاپرواہی پر سخت سنائیں کہ ان کے غفلت سے بیٹے میں بچی بے بارود دگا کر آیا کہ دم و دم کرم پر پڑی ہے اور جسے گھر والوں کی بے توہمی محسوس کر کے ایک انکو بھول جاتی ہے۔ کی کوئی وعدہ پائی بھوک سے طرحاں ہو کر بیک بیک روتی خود ہی چپ ہو کر سو جاتی ہے اور آریا اس کا دودھ پٹا بھول جاتی ہے۔ ہی نے دائم طور پر اپنی بیوی کا اظہار کیا اور کہا کہ انہیں کبھی مزید اولاد کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ چہ نہیں مسعود کے ساتھ یہ بھی کیوں پیدا ہو گئی۔ ہی اور ڈیڑی دونوں ہی نے مجھے نظر انداز کر دیا تو مجھے اپنے ساتھ کوئی نہ لگیں۔ نانی وہاں میرے ماموں کے گھر میں رہتی تھیں۔ جسے اس کے ماں باپ نہ چاہیں اس سے کوئی اور کیا چاہ کرے گا ماموں مامی کا رویہ کوئی خاص اچھا نہ تھا۔ وہ محض نانی کی مرود میں میری کمرے پر آکر ڈھکچھول کر گئے تھے۔

ڈیڑی ہر مہینے ایک خلیہ رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع کر دیا کرتے تھے اور کسی کسی آتے جاتے بندے کے ہاتھ کپڑے اور کھلوے بیچ کر اپنی محبت کا اظہار کر دیا کرتی تھیں۔ نانی تو وہیں سول میں میرا ایڈمٹن کر دیا وہ مجھے بہت جانتی تھیں۔ ہر ماہ تیر خیال رکھتی تھیں انہیں بنی کی نالائقی اور لاپرواہی پر بھی بہت غصہ تھا۔ وقت گزرتا رہا میں آٹھ سال کی ہو گئی۔ اس دوران کی ڈیڑی کے ہاں ان کے نہ چاہنے کے باوجود بھی دیا ہو گیا تھی۔ وہ مجھ سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ وہ وہو ہواد کی کالی تھی۔ اسی لئے وادی اسے بہت پارتی تھیں۔ اس کے پیدا ہونے کے کچھ ماہ بعد ہی وادی کا انتقال ہو گیا تھا۔

میری آغوشیں ساگر کے ٹھیک ایک ہفتے بعد نانی ایک رات انکسوس میں کہ بھر آئی ہی نہیں۔ مجھ سے محبت کرنے والی واحد ہستی اس دنیا سے رحلت ہو چکی تھی اور میں اکیلے رہ گئی تھی۔ کوئی پرانی اولاد کو کیوں اپنے پاس رکھتا سو ماموں نے مجھے وادی گھر کر لیا بھگا دیا۔ میری وادی میرے گھر والوں کے لئے صرف اتنی اہمیت رکھتی تھی کہ مجھے ائیر پورٹ پر ریسو کرنے کے لئے ڈاکٹر کو کھینچ دیا گیا تھا۔ میری وادی سے گھر والوں کو کوئی خوش نہیں ہوئی تھی۔ میں ہی کے گلے لگنا جانتی تھی ان کی خوشبو محسوس کرتا جانتی تھی مگر انہوں نے دور سے میرے سلام کا جواب دے کر میری خبرت نہ پوچھی تھی۔ میں بھگ کرک تھی تھی۔ ڈیڑی اور بہن بھائیوں کا رویہ بھی میرے ساتھ بڑا لیا دیا تھا۔ جیسے میں کوئی آؤٹ سائڈز تھی جو اچانک ان کے گھر آ کر بے لگتی تھی۔

یہ نہیں مجھے اپنے ساتھ لے جا کر نانی نے اچھا کیا تھا یا اس بات کا فیصلہ میں آج تک نہیں کر سکی۔ اگر وہ

مجھے ساتھ نہ لے جائیں تو ہوسکتا تھا میری بھی اس گھر میں کوئی جگہ نکل آتی۔ وہ سب اتنے سالوں سے ایک ساتھ رہ رہے تھے وہ سب ایک تھے اور میں بالکل الگ۔ میرے ماں باپ اور بہن بھائی کسی کو میری ضرورت نہ تھی۔ دادی کی وفات کے بعد اب گھر میں کسی کا رعب تھا وہ کوئی ڈری بھی کسی عورت نہ تھیں ان کا چنانا ان کی طاقت تھا۔ وہ سمود سے بے تھا شامیت کرتی تھیں اس کے آگے ڈیڑی اور ہم بھڑوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اگر سمود ان سے کہتا کہ آپ میری خاطر سمندر میں چھلانگ لگا دیں اب آگ میں ہو گا جائیداد ایسا کروڑ رش۔ وہ اس کی محبت میں سب کچھ کر سکتی تھیں اور ڈیڑی اب صرف ایک بڑا سن تھی۔ ہزار کروڑ کیسے بناتا ہے اور لاکھ کروڑ ان کی سوچ بس یہیں تک محدود تھی۔ انہیں گھر اور بچوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہاں تک کہ سمود کی خاطر وہ کوئی کھلاق دیتے دیتے دھمکتے تھے انہیں اس سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہاں البتہ دعا سے وہ بچاؤ کی نسبت پیار کیا کرتے تھے۔ شاید اس لئے کہ وہ دادی جیسی تھی۔

میں گھر والوں میں شامل ہونا چاہتی تھی۔ میں اپنے آپ کو اس گھر کا حصہ بنانا چاہتی تھی اس لئے میں نے سب کا بہت خیال رکھا شروع کر دیا۔ ڈیڑی کا کافی کھوشن تھے میں رات کو سونے سے پہلے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کے ساتھ بنا کر ان کے لئے لے جایا کرتی تو وہ بغیر کچھ کے میرے ہاتھ سے لے لیتے تھے۔ ہر بار میں سوچتی کہ آج ضرور ڈیڑی مجھے پیار کریں گے اور کہیں سے میری بیٹی نکلتی تھی مجھے ہے اپنے ڈیڑی کا اتنا خیال رکھتی ہے مگر میری یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوئی۔

میری محبت حاصل کرنے کے لئے میں نے سمود کا بہت زیادہ خیال رکھا شروع کر دیا۔ مجھے یہ تھا سمود میں ان کی جان ہے اور ان کی جان مجھے بہت پیاری تھی۔ میں اپنی ساری پکٹ منی اور بہت سی چیزیں اسے دے دیا کرتی۔ اس کے چڑھنے پر ڈائیگرام بنایا کرتی کہ وہ مجھ سے خوش ہوگا تو خود بخود خوش ہو جائیں گی۔ اپنی بھڑوں کا ہر کام تو کروں سے بھی پہلے ہر دوڑ دوڑ کر کر دیتی کہ وہ مجھ سے باقیں کریں میں ان میں کل مل جاؤں۔ یہاں میں ٹھوڑی بہت کامیاب بھی ہوئی۔ صبا آتی اور مٹا ہونچھ سے کچھ ماٹوں ہو گئیں اور کچھ سے باتیں بھی کرتے لگیں۔ دعا البتہ سب سے مختلف مزاج کی لڑکی تھی۔ وہ صرف شغل ہی میں نہیں بلکہ باتوں میں بھی دادی جیسی تھی۔ انہیں کی طرح خندی اور سرکش۔ اس کا دل چاہتا ہی کوئی مطلب ہوتا تو مجھ سے بات کرتی اور مجھے انکڑ کر دیتی۔

ڈیڑی نے صبا آتی اور تاجو کی شادیوں بہت کمیری میں کر دی۔ وہ بلا کے انیش کھڑکھس بندے تھے اسی لئے ان کے دونوں داماد ان کی طرح دیل و ترف تھیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دونوں کی شادی کے بعد میں کچھ اور ایک ہو گئی لیکن میں نے گھر والوں کا خیال رکھنے والا اپنا رویہ ترک نہیں کیا۔ میں ابھی ماپوں نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اس گھر میں اپنی جگہ بنانی تھی۔ میں اپنی محبت اور خدمت سے سب کے دل جیت لینا چاہتی تھی۔ میری اطاعت گزار پر دنا میرا مذاق اور ذہنی قوت کے مجھے کسی مل کا نہیں کھرانے میں پیدا ہونا چاہئے تھا۔ یہ خدمت اور وفا شادی وغیرہ بھی عیوبیات وہاں بہت کا رندہ ثابت ہوئی ہیں۔

دن گزرتے رہے میں اکثر کے ارش اسکول میں آتی۔ انہی دنوں سمود کو ہماری چھوٹی خالہ کی ماریہ سے طوفانی قسم کا عشق لاحق ہو گیا۔ مجھ کو تو بچے کی خواہش پر دل و جان سے راض تھیں لیکن ڈیڑی کو خالہ کا مل گھر کرانہ

اپنے اکلوتے بیٹے کے شان میں نظر نہ آ رہا تھا۔ لیکن اب کوئی پہلے کی طرح ڈیڑی سے ڈر جانے والی عورت نہ رہی تھیں سو ڈیڑی کے آگے۔ بیٹے کا مقدمہ لڑنے کو لڑی ہو گئیں۔ آخر کار ڈیڑی کو اختیار ڈالنے پر مجھے اور اپنے اکلوتے بیٹے کا رشتہ لے کر ایک ہزار بار ہوا برکات کے والے فٹ پر مجھے کے گھر پہنچ گئے۔ ماریہ اور خالہ اس رشتے پر بہت خوش تھیں۔ سب ہی کو یہ تھا کہ انہوں نے ہاں کرتی ہے۔ بچی کے اس زوردار عشق میں وہ برابر کی شریک تھیں۔ انہیں اپنی بیٹی کے لئے ایسا ہی صاحب چاہتا اور اور اکلوتا و خور و دار کو رکھتا تھا۔ اس انکار کی کوئی نمائندگی نہ تھی۔ لیکن اس کے جواب نے سب کو حیران کر دیا تھا وہ ماریہ کا رشتہ صرف اس قیمت پر دے دے کہ وہاں تھیں کہ میرا رشتہ ان کے بیٹے خالہ کے ساتھ ملے کر دیا جاتا۔ سمود کے لئے ہی اس مقلے پر یقین رکھتی تھیں کہ "جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔" سو انہیں اس سوچے بازی میں کوئی برائی نظر نہ رہی تھی۔

خالہ میکینیکل انجینئرنگ کے کونور کی کلاش میں مصروف تھا۔ ایسا دادا ڈیڑی کے لئے کیسے قابل قبول ہو سکتا تھا گھر میں بھرا کر ایک جنگ چھڑتی تھی۔ کو خالہ میں ہر غریبی اور ڈیڑی کو ہر خیال نظر آ رہی تھی۔ وہ جی میں تو مجھ سے اس سلسلے میں کبھی کبھی پرستے کی زحمت گوارا نہیں کی کرتی تھی۔ سمود نے ڈیڑی کے انکار پر مشتعل ہو کر گھر چھوڑ دینے کی دھمکی دی تو میری روتی ہوئی میرے پاس آ گئیں اور کہنے لگیں کہ میں ڈیڑی کے سامنے اس رشتے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کروں اور انہیں مجبور کروں کہ وہ ہاں کر دیں۔

مجھے خالہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی میری تو اس سے بطور کنجی بھی بات نہ تھی لیکن مجی کے دل میں اپنی محبت پیدا کرنے کا یہ موقع میں نکوتا نہیں چاہتی تھی اسی لئے ان کی بات مان کر ڈیڑی کے پاس چلی آئی۔ وہ میری اس بات پر بہت ناراض ہوئے۔ مجھے کھانے ڈھنس کے یوب کھانا لگے۔ مجھے سمجھانے لگے کہ رشتے ناتوں میں کی جانے والی بلیک میلنگ انہیں بالکل نہیں پسندیں۔ وہ خالہ کے تہا دل کے طور پر ہمارے ہاتھوں کے نام میرے سامنے کھانا لگے جن سے وہ میری شادی کر سکتے تھے اور جو میرے ہم پند تھے تھے۔ لیکن میں ان کے سامنے کمر کر چکی ہو گئی اور جب تک ان سے اپنی بات نہ سنانا نہ لی وہاں سے نکلی نہیں۔

خالہ اس رشتے کے ملے ہو جانے پر بہت خوش تھیں۔ سمود ماریہ کے ساتھ اور میرا خالہ کے ساتھ کلا کر دیا گیا۔ ماریہ کو تہا کڑا ہوا ہے گھر آقا۔ لیکن ڈیڑی بھی اپنی بیٹی کو ایک سو تیس گز کے ایک معمولی سے گھر میں رخصت نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت میں اسے ان کی اپنے آپ سے محبت جان کر خوش ہوتی رہی تھی آج سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے وہ وہ ان کی کچھ سے نہیں اپنے آپ سے محبت تھی۔ سکندر پھر پراخان کی بیٹی کسی معمولی گھر میں بیاہ کر جائے ان کی ناک بچی نہ ہو جاتی۔ انہوں نے خالہ کا انیش ہمارے مابرا لانے کے لئے فوری طور پر اس کے لئے امریکہ میں ابھی جاہ اور اور اپنی کل بندوبست کیا اور وہاں ایک بہت ہی اچھی فرم میں اس کی نوکری کا انتظام ہو گیا تھا۔ جتنے ڈائریکٹ جاہ اسے ڈیڑی کے توسط سے ملتی تھی وہ تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ وہ امریکہ چلا گیا اور خالہ کے گھر کے حالات بتدریج بدتر ہونے لگے۔

ہمارے درمیان کلاچ جیسا محبوبہ بندھن قائم ہو جانے کے باوجود اس نے کبھی مجھ سے ملنے یا بات کرنے کی کوشش نہ کی۔ میں اس کے سرودہاٹ اعداد پر حیران ہو کر رہی تھی۔ میرے سامنے ماریہ اور سمود صبح و شام ایک

دوسرے سے ملتے ہوئے پس بھی لپٹی بائیں ہوتیں اور وہ جس کے ساتھ مجھے زندگی گزارنی تھی میرے وجود سے لاتعلقی تھا۔ اس کے اسی روئے کی بدولت میرے دل میں بھی اس کے لئے جگہ خاص قسم کی فیکس پیدا نہ ہو سکی۔ میں ان دنوں اپنے مستقبل سے ڈرتے تھی۔

مجھے لگتا تھا میری زندگی بھی کی ڈیڑی کی طرح ایک دوسرے کو لچکا دکھانے اور ذلیل کرنے میں مگر جانے گی۔ میں بچپن کی دستاویزی تھی۔ میں بس یہ چاہتی تھی کہ وہ جس کے ساتھ مجھے اپنی زندگی گزارنی ہے چاہے وہ کوئی بھی ہو لیکن مجھ سے بے حد محبت کرتا ہو۔ میرا دودھ اس کے لئے خوشی کا باعث ہو۔ وہ میرے دل کی ہر بات سمجھ جائے۔ وہ امیر ہو یا غریب لیکن میری عزت کرے مجھے گھس چا یا روے اور خالد میں مجھے ایسی کوئی نظر نہیں آ رہی تھی۔ "امیر B.F.A. کپیٹ ہوا تو میں نے وقت گزاری کے لئے آٹس اسکول Join کر لیا۔ انہیں دس سو کے اصرار پر ماریہ رخصت ہو کر ہمارے گھر آ گئی۔ وہ زندگی تو ہم دونوں کی ایک ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے۔ خالد اپنی جلدی شادی کے لئے آمادہ نہ تھا سو ڈیڑی کو چپ سا مٹی پڑی۔ ماریہ ایک بہت ہی عملی ذہن کی لڑکی تھی۔ اسے تو شاید سود سے بچی محبت بھی نہیں تھی۔ اس کا خواب تو ایک امیر گھرانے کی بونہ تھا۔ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتا اور سیر و تفریح کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس کی تمام حرکات کسی کو دو دیکھ لیتی تھیں۔

دعا سے اس کی بائیں گت بھی نہیں تھی۔ لیکن وہ ڈیڑی کی چٹائی کو کچھ کچھ نہیں سمجھتی تھی۔ دعا اس کے نو دوپٹی پن کا دل کھول کر خفاق اڑاتی۔ کھانے کی میز پر بیٹھ کر نہ بدوں کی طرح پلیٹ بالاب بھر لیے پر دعا اس کو خستہ نظر ہوں سے نکلتی۔ میری البتہ اس سے نہ کوئی دوپٹی نہ تھی۔

دن مڑتے رہے ڈیڑی کو میری رخصتی کی فکر بھرنا زیادہ ہی سستا نہ لگتی تھی۔ مگر البتہ پر سکون تھیں۔ انہیں دنوں میری زندگی آنکھوں کی زد میں آ گئی۔ میں نے کبھی کسی کے ساتھ ہر باتیں کیا تھیں کہ اس کا دل نہیں دکھایا تھا لیکن خود میرے ساتھ اس سب کے سلسلے میں کیا ہوا؟ میں ساری زندگی انہوں کی محبت کی طلب میں بھاگتی رہی۔ لوگوں کے دل جیتنے کے لئے خدمت اور فراہم داری کے کتبے راستہ لگاتی رہی اور ایک روز مجھے پتہ چلا کہ میں سرباب کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ میں خالی ہاتھ کھڑکی سوچ رہی تھی کہ میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا۔ میں ان چاہتی تھی اور اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی ان چاہتی ہی رہی۔

خالد وہ بچپن کی پھٹی لے کر پاکستان آیا تھا اور جو جرنی کم کی طرح میرے اعصاب کو توڑ پھوڑ دیتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اپنی چچا زاد بہت سے شادی کر رہا تھا۔ خالد نے ڈیڑی کے احتجاج سے خود کو لاتعلقی ظاہر کر کے اسے بیٹے کی ضد اور بغاوت قرار دیا تھا۔ ڈیڑی کا قصہ آسمان سے بائیں کر رہا تھا۔ انہوں نے خالد کو اس کی اوقات یاد دلانے کی کوشش کی اور بتایا کہ وہ یہ کیا وہ کئے کا انسان تھے انہوں نے خرس کھا کر اپنے بڑا جگر بدی تھی تو اس نے جواباً بڑے آرام اور سکون سے ملے طلاق دے دی۔

کوئی تصور نہ ہوا ہے وہ بھی میں مصلوب کی جا رہی تھی۔ میں نے جو قدم کی کوشش کرنے کے لئے اٹھایا تھا وہ میری بربادی پر ختم ہوا تھا۔ خالد کے گھر خالد کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں کل کچھ جودہ بیٹے کی ضد اور بغاوت سے ناراض نظر آ رہی تھی آج بڑے آرام سے اپنی بہو کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

خالد کے گھر کے کسی بھی فرد کی ہمارے گھر آمد پر عمل پنداری عائد ہو چکی تھی۔ ڈیڑی ان میں سے کسی کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کے بچوں کی کاڈل کلاس گھر اندر اس قاتل ہی نہ تھا کہ ان سے کوئی تعلق رکھا جائے۔ ڈیڑی کے منہ سے کلاس کا طعنہ ماریہ کو بہت برا لگتا تھا۔ اس نے مجھ سے خواہ مخواہ کچھ بات نہ کیا تھا۔ اصولاً تو مجھے اس سے برا سلوک کرنا چاہیے تھا کہ اس کا بھائی میری بربادی کا ذمہ دار تھا مگر ہمارے گھر اپنی لنگ بھری تھی۔

سود کو بھی مجھ میں سوطر کے عیب نظر آنے شروع ہو گئے۔ ڈیڑی نے ماریہ کے علاوہ کسی کو بھی شادی میں شرکت کی اجازت نہ دی تھی۔ اس رات میں می کے لئے چائے نے کران کے کمرے کی طرف آئی تو اندر سے آتی مسود کی آواز نے میرے قدموں کو جکڑ لیا۔ وہ می کے ڈیڑی کے روئے پر احتجاج کر رہا تھا۔ براہ راست ڈیڑی سے ٹکرو تو وہ نے نہیں سکتا تھا آخر یہ گھور قدام کا روڈ ڈیڑی کی ملکیت تھا اور سود بزرگ بھی اتنا بیوقوف نہ تھا۔ کاش اس روز میں نے می اور سود کی باتیں نہ سنی ہوتیں، ان کے ازم خود اپنی نظروں میں کچھ تو مستحضرہ جاتی ان کی باتوں سے مجھے پتہ چلا کہ خالد ایک عرصے سے نہرت کو پسند کرتا تھا۔ خود نہرت بھی اس میں اسطر تھی۔ لیکن اسے اپنے ہی جیسے ایک ڈبل کلاس گھرانے میں شادی کرنا منظور نہ تھا۔ اسے دولت، رتبہ، عیالشان مکان اور قیمتی گاڑی چاہیے تھی اور وہ سب کچھ خالد کی چھوٹی موتی نوکری میں ہونہ ممکن نہ تھا۔ ہمارے ہاں سے ماریہ کے لئے رشتہ نہ ملتا تو خالد کو اپنے مسئلے کا حل میری صورت میں نظر آ گیا۔

وہ جانتا تھا کہ سود ماریہ کے عشق میں بری طرح گرفتار ہے اور اس سے بھی کوئی شرائط اور کبھی جا نہیں دہے تھی جب ماریہ ہی سے شادی کرے گا۔ اس نے خالد کو اس بات کے لئے آمادہ کیا تو وہ بھی بیٹے کی بھوانی گئیں۔ مجھے خالد خالد یا نہرت کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ دکھ تو مجھے ابھل کی بے اعتنائی کا تھا۔ سود اور دونوں خالد کی نہرت سے محبت کے بارے میں آگاہ تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مجھے استعمال کیا جا رہا ہے مجھے سونے کی چڑیا سمجھا جا رہا ہے لیکن سود کے سر پر ماریہ کا عشق چڑچڑاہے رہا تھا اور می سود کی محبت میں اپنی بیٹی کی بازی لگانے کو بھی تیار تھیں۔ خالد اور خالد انہیں لاطحے سمجھتے لیکن یہ ان کی غلط فہمی تھی کہ خالد تھا کہ میرے جیسے امیر باپ کی بیٹی سے شادی ہو گی تو خالد خود بخود نہرت کو بھول جائے اور سود کو مجھ سے صرف اپنی دلچسپی تھی کہ میرے ذریعے وہ اپنا مقصد حاصل کر سکے۔ میری گلی میں جس نے مجھے اپنی کھ سے جنم دیا تھا، اتنے آرام سے میرے ارمانوں کا خون کر گئی۔ ان کے لئے واقعی محبت اور جنگ میں سب جاڑ تھا کیا فرق پڑا کہ اس جنگ میں انہوں نے اپنی بیٹی کو ہار دیا۔

سود اور می دونوں ہی کا خیال تھا کہ ڈیڑی بلاوجہ کے لئے اس بات کا انکشاف ہو جائے۔ میرے لئے رشتوں کی کوئی کی نہیں ہے۔ میں کوئی ڈبل کلاس کی لڑکی نہیں ہوں مگر ٹوٹ جانے پر یا طلاق ہو جانے پر جس کے لئے زندگی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ کل تک جو خود اپنے آپ کو طلاق سے بچانے کے لئے فریبت پر ایک بیٹا چاہتی تھیں آج اپنی بیٹی کی طلاق پر ایک آنسو بھرا ہے۔ بغیر بڑے آرام سے منشی ڈیڑی پر تنقید کر رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ خالد کی غلطی کی سزا ان کی چھوٹی بیٹی کو دینا نا انصافی ہے اور مجھ اس سے ماریہ کی بھی انصاف ہو رہی تھی۔

اس روز میں اپنے کمرے میں آکر چھوٹ چھوٹ کر روئی تھی خالد، خالد، نہرت، ماریہ سود اور می سب نے اپنے اپنے معاملات کے لئے مجھے استعمال کیا تھا۔ میں انہیں ان کے مقصد تک پہنچانے کا ذریعہ تھی۔ میں ایک استعمال

ہونے والی تھی جس کے نوکڑی جذبات ہوئے ہیں نہ احساسات۔ میں ان سب کے لئے ایک Cat's Paw تھی۔ میری اچھائی میری نیکی اور خدمت پیچھے میرے کام نہ آتی تھی۔ مجھے بے اپنا مطلب نکال کر گھنٹے کی فالٹ چیز کی طرح ڈال دیا گیا تھا۔ مارے کارو یا ہفتوں میرے ساتھ نہایت جنگ آ میرا تھا اسے شاید یہ چڑھا کر گھنٹے کی روز میرے بجائی کی خبر نہ آیا یہی ان کی ممتا نہ جاگ جائے اور اسے اس گھر سے نکال دیا جائے اس لئے وہ میری دشمن ہوئی تھی۔ میرے لئے دنیا ختم ہوئی تھی۔

وہ گھر میں بستی تھی میرے لئے ایک جیم کلوڈ بن گیا تھا۔ یہ آہستہ آہستہ سب سے سختی پہنچ گئی۔ کسی نے میری تہہ بلی کی وجہ جاننے کی کوشش نہ کی سب اپنے حال میں مگن خوش تھے انہی بڑوں مجھے پاک میں آپ لے۔ مجھے نہیں پتہ کہ میری کس بات سے متاثر ہو کر آپ میری طرف بڑھتے تھے میں جس سے اس کے خوشی رکھنے کو لگاؤ نہ رکھتے تھے اس سے ایک بالکل غیر آدمی بے حد بار بار جھگڑا پھرتا تھا۔ یہ نہیں آپ کی چاہت میں کیا جا رہا تھا کہ میں آپ کی ابرو پر جلی گئی۔ انہوں نے دینے نہیں مجھے جوتے لگے۔ میں نے سوچا کہ باں کم سے کم آپ تو مجھ سے کبھی محبت کرتے ہیں۔ بالکل بے غرض اور کمری۔ میں آپ کی سخت سے خوش رہتی تھی۔ آہستہ آہستہ میں تہہ بلی آدمی تھی۔ میں خوش رہنے لگی تھی۔

تین روز پہلے مارے نے اپنے پہلے بچہ کو جنم دیا۔ اس کا بیٹا جو بہت صحت مند سندھو ست پیدا ہوا میری پانچ دھکے کے بعد پیدا ہو گیا۔ کل وہ پانچل سے چار چار ہو کر گھرنی تو آتے ہی مرے کرتے میں آکر چلانے لگی کہ میں اس کے بچے کو کھائی ہوں۔ میں اس کے بچے کی پھوپھی نہیں ایک ڈائن ہوں جس نے اپنے بچے کو کھلا لیا۔ میں اس کی خوشیوں سے ملتی ہوں۔ اسے بد معاش دیتی ہوں۔ میں کسی آج کی طرح اس کی جان کو چست کی ہوں۔ میری وجہ سے اسے اس گھر میں اس کا جائز مقام نہیں مل رہا اور یہ نہیں میری فحشوں میں بلاتے اس کا بچپنا کب چھوٹے گا۔

وہ مجھے اپنے بچے کا قاتل قرار دے رہی تھی اور میرا بھائی برہما ان کا چاہنا خاص کڑا سب کچھ کر رہا تھا۔ دعا اپنے کرے میں بندہ بیکزن نہ رہی تھی اور میری ڈیڑھی کسی روز میں سے ہوتے تھے۔ وہ ہوتے ہی تو کیا ہو جاتا۔ میں تو پیدا ہی لوگوں کی فحشیں سننے کے لئے کی گئی تھی۔ میں مارے کا مروتو دینا چاہتی تھی۔ اس دو ٹکے کی لڑکی کو اس کی حیثیت یاد دلانا چاہتی تھی لیکن خاموش کمری اس کی ساری کجاس سختی تھی میرے منہ سے ایک بھی لفظ نہیں نکل سکا تھا۔ پھر جب وہ خاموش ہوئی تو میں گڑا کی چالی اٹھا کر گھر سے نکل آئی اور یہ نہیں کیسے آپ کے پاس پہنچ گئی۔

وہ ان کے کندھے پر سر رکھنے آئو برساتے ہوئے اپنا دل ان کے سامنے کھول رہی تھی۔ وہ ماراقت بغیر اسے نوکے اس کے بالوں میں اٹھایاں پھیرتے ہوئے اس کی ساری بات سننے رہے تھے۔ بچ انہوں نے ذرا بڑھ کر سوچ کر اسے بلایا تھا اور وہ بنا چوں چا گئے چلی آئی تھی۔ وہ کسی کے سلوٹ زدہ کپڑوں اور گھر سے بالوں میں وہ ان کے بیڑم میں بیٹھی انہیں اپنے بارے میں کچھ بتا رہی تھی۔ ادنیٰ آفس جا چکا تھا۔ کافی دیر بعد جب اسے ان آئو گھر گئے اور دل دترے پھر گیا تو اس نے انگلی کی آواز نہ دی کہ کدہ رہے تھے۔

”تمہارا مسئلہ صرف اور صرف یہ ہے کہ تم بہت حساس ہو۔ ہر بات کو بڑی شدت سے محسوس کرتی ہو۔ تم لوگوں کے رویوں پر کڑی تھی ہو۔ اگر تم غور کرو تو تمہارے ڈیڑھی صرف تمہارے ہی ساتھ نہیں بلکہ اپنے کسی بھی بچے سے

دیکھی محبت نہیں کرتے جیسی ایک باپ کو کرنی چاہئے۔ تمہاری کسی صرف تمہیں ہی نہیں تمہاری کسی بھی بہن کے کوئی لگاؤ نہیں رکھتیں۔ تمہاری جگہ تمہاری کوئی اور بہن بھی ہوئی وہ اسے سودی خاطر پرانی استعمال کرتیں جیسے تمہیں کیا اور تم کیا سمجھتے ہو وہ سود کو پاتی ہیں۔ نہیں وہ اس سے محبت نہیں کرتیں۔ وہ دراصل ایک نفسیاتی بیماری ہیں۔ تمہارے گھر کے کسی بھی فرد کا وہ یہ بات نہیں۔ تمہارا مارا گھر ان ایک قسم کے Mental Disorder کا شکار ہے۔ تمہارے ساتھ جس کسی نے جو بھی کیا سب بھول جاؤ۔ ایک دبا میرے کہنے پر سب کو معاف کر دو۔ اپنے دل کی چٹائیوں سے سب کو معاف کر دو۔ تم لوگوں کے رویوں پر کڑا چھوڑ دو۔ میری بات کا یقین کرو کہ تم اپنے حصے کے تمام دکھ بھگتی ہو اور اب زندگی تم پر مہرمان ہونے والی ہے۔ خدا اپنے بندوں پر کبھی اس کی برداشت سے زیادہ آزمائش نہیں ڈالتا۔

تم خود کچھ لینا زندگی اگلے سوڑ پر تمہارے لئے سختی ساری خوشیاں لئے کھڑی ہے۔ تم دونوں ہاتھوں سے خوشیاں، راحتیں اور کھینچیں بیٹھو۔ ”وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر بولے تو وہ ان کو بے چینی سے دیکھ کر رو گئی۔ ”تمہیں مجھ پر اعتبار ہے نا۔“ ان کے بات پر اس نے گردن ہلا دی۔

”تو پھر میری بات پر تمہیں بند کر کے یقین کرو۔ تمہیں زندگی میں وہ سب کچھ ملے گا جو تم چاہتی تھیں۔ اس بات کا یقین میں دلدارا ہوں تمہیں۔“ اور ان کی اس بات پر اس نے واقعی انہیں بند کر کے یقین کر لیا تھا۔ ان کے آگے اپنا دل کھولا تھا اس کا تمام بوجھ اپنی ہاتھوں میں لیا تھا۔ وہ خود کو بہت بات بہت مطمئن محسوس کرنے لگی تھی۔

اب وہ پاک میں اچھڑا رہی تھی کچھ کرنے کے بجائے اس سے اس کی اپنی باتیں کیا کرتے۔ وہ اپنے بچپن کی بے شمار چھوٹی چھوٹی باتیں انہیں بتاتی۔ اب اس کے دل پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ انہوں نے اس کا بوجھ بانٹ لیا تھا۔ اس نے اپنے سے مسئلہ تمام افراد کو بدل کے صاف کر دیا تھا۔ وہ اس کا تھا تھا تو جو کچھ وہ کئے جاتی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ خود میں ان سے گھر جانے کی ہمت نہیں پاتی تھی۔ اسے ادنیٰ کا سامنا کرنے سے شرمندگی کا احساس ہوتا تھا۔ اپنی اس روز کی بے اعتبارانہ نیکیت اور دھڑکی اسے اس کے سامنے شرمندہ کرتی تھی۔ انگلی کی بات دوسری تھی ان کے سامنے تو وہ کھلی کتاب تھی جو کچھ اس کے دل میں ہوتا وہ روزانہ اس کے کھدیا کرتی تھی۔ اسی لئے انگلی کے کئی دھبے مانے پر بھی وہ ان کے گھر نہ گئی تھی۔ اس روز سنا تو تھا جب انگلی نے اسے فون کر کے اپنے ساتھ لے جانے کی دعوت دی تھی اور ان کے بے حد صابر پر بھی وہ آنے کے لئے تیار نہ ہوئی تھی۔ وہ اب کبھی بھی اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے انداز پر انگلی نے ہاتھوں کو فروتن رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

گیت نے اندر داخل ہوتے وقت وہ جی دھکا کر رہی تھی کہ اس سے سامنا نہ ہو اور وہ سامنے ہی لان میں بیٹھا نظر آ گیا تھا۔ اپنے حساب سے وہ اس وقت آئی تھی جس وقت وہ سمجھتا تھا کہ چارہ چارہ تھا مگر وہ ان دنوں بڑے برہمنا ایک ہاتھ میں سڑکے اور دوسرے میں چائے کا کپ پکڑے گیت ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انگلی آج پاک نہیں آئے تھے اور وہ کھڑے کھڑے ان کی خبر سے دریافت کرنے چلی آئی تھی۔ اب جبکہ اس نے اسے دیکھ ہی لیا تھا تو سیدھے سیدھے اندر چلے جاتا بڑی دھواکتی کی بات تھی۔ وہ خود میں اس کو نہیں کرنے کی اجازت پیدا کرنا ان کی طرف چلی آئی۔ اسے اپنی طرف آ کر دیکھ دیر فخریہ انداز میں مگر کیا تھا۔

”کہاں عائب ہو آج کل؟“ اس کے قریب آنے پر دھڑک کر بولا۔ اسے تڑپ میں جلا دیکھ کر کسی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔
”جینجو۔“

”انگل کہاں ہیں؟“ وہ جینجو کی آنکھ انداز کر کے قصد اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔
”اس گھر میں انگل کے علاوہ میں غریب مسکین سا بندہ بھی رہتا ہوں۔ کم سے کم میری خیریت ہی تو چھ لو۔“ وہ ناراضی سے بولا۔ وہ مجبوراً کرسی پر ٹکی گئی۔ سگریٹ کے کش لیتا وہ دعوائے اڑاتا بڑے غم سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اپنے حباب سے تو میں نے آج تک ایسی کوئی بات تم سے نہیں کی جس پر تم مجھ سے ناراض ہو جاؤ۔“ وہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے۔
”پھر بھی اگر تمہارے خیال سے میں نے کچھ غلط کیا ہے تو مجھے بتاؤ۔ اگر مجھے اپنی کوتاہی محسوس ہوئی تو میں تم سے ایکسکس کر لوں گا۔“

”میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔“ وہ سر جھکا کر دوسرے سے بولی۔
”پھر تم مجھے نظر انداز کیوں کر رہی ہو؟“ وہ اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔
”ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے ڈر رہی تھی اسی لئے سر جھکا کر بولی۔

”میں پاگل نہیں ہوں جو یہ بات محسوس نہ کر سکوں کہ تم میری وجہ سے یہاں آنے سے کتراتے ہو۔ اس وقت بھی تم اس خیال سے آئی تھیں کہ میں گھر پر نہیں ہوں گا۔“ وہ اس کی بات پر دھک سے بڑھ گئی۔ اسے اس کے دل کے حال کی خبر کیسے ہوئی۔ وہ ہر طرح پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے تماشا ڈین بندے کے سامنے جھوٹ نہیں بولا سکتا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ اچانک ہی خود بخود اس کے ہونٹوں سے یہ جملہ جمل گیا۔

”مجھے آپ کے سامنے آنے سے شرمندگی ہوتی ہے۔ میرے اس دن کے انبار دل ہی ہو پر آپ نے میرے بارے میں کیا سوچا ہو گا۔“ وہ جو بڑی جینجی کے اس کی طرف نظریں جمائے بیٹھا تھا اچانک ہی تہجد لاکر خن پڑا تھا۔ اس نے بڑی حیرت سے اسے تہجد لگاتے دیکھا تھا۔ وہ لوگوں سے قائلہ رکھ کر ملنے والا جو اپنے اور مقابل کے بیچ ایک کیرکٹھ کر رکھتا تھا اس وقت بڑی بے فکری سے ہنس رہا تھا۔

”جیہیں یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ میں ہر وقت تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔“ اس نے جیسے اس کی بات کو بہت اچھائے کیا تھا۔ وہ اپنے آپ اختیار داری میں مدد سے نکل جانے والے نکلے پر شرمندگی سے سر جھکا کر وہ جی جی۔ وہ مسکراتی نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اچانک ہی اسے شدید کھم کا شعاع ان شروع ہو گیا۔ اسے کس نے حق دیا ہے کہ وہ اس کا مذاق اڑائے وہ کرسی پر سے اٹھ گئی اور آگے بڑھنے لگی تھی کہ اس نے اپنا پیرو درمیان میں حائل کر کے گویا اسے جانے سے روکا۔

”میں نے ابھی تمہیں جاننے کے لئے نہیں کہا۔“ وہ جینجی انداز میں بولا۔
”مجھے کبھی جاننے کے لئے آپ کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ خفا خفا اس پر نظر ڈالے بغیر بولی۔
”تم شرافت سے بیٹھ رہی ہو یا میں ہاتھ پکڑ کر بٹھاؤں۔“ وہ غرایا۔
”مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی میں نکل سے ملے آئی ہوں۔“ اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی پر دھکیلا اور بولا۔

”اچنے سے چپاس سال بڑے انگل تمہیں دوستی کرنے کے لئے بڑے موزوں لگتے ہیں اور صرف پانچ چھ سال بڑے بندے سے تم بات کرنا بھی گوارا نہیں کر رہیں۔ ایسا ان میں کیا بات ہے جو مجھ میں نہیں۔ کیا تم مجھے دوست نہیں بن سکتے؟“ اس بات پر ہالچالنے چوٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا اس کا بچے کلف انداز اجالا کو حیران کر رہا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا پھر وہ قدرے جینجی کی اختیار کرتے ہوئے اس سے بولا۔

”مجھے کبھی معلوم تھا تم اس وجہ سے مجھ سے تکرار ہی ہو۔ ایک دم یہ توقف ہو۔ انسان اپنی تکلیف میں، چریشانی یا غم میں اسی کے پاس جاتا ہے جس پر اسے مجبور ہوتا ہے جس کو وہ اپنا جھٹکا ہے اگر تم نہیں اپنا کچھ کر ہمارے پاس آئی تھیں تو میں کیوں تمہارے بارے میں کوئی فضول بات سوچوں گا۔ ایسا ہر اعتقاد خیال اپنے دل سے نکال دو اور ایک دوست کی حیثیت سے میں تمہیں مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ برداشت، تحمل، رواداری اور اخلاق وغیرہ اچھی چیز ہیں لیکن بعض لوگوں پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں پر ان ہڈیوں کو تلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو چپ چاپ قلم سطر تھام رہے وہ خود سب سے بڑا ظالم ہوتا ہے۔ اپنے اندر ہمت پیدا کرو۔ کوئی تمہیں تکلیف دے یا ستائے تو تم اس کا مد توڑ دو۔“

مجھ سے دوستی کر کے دیکھو میں ہمیشہ بالکل اپنے جیسے بنا دوں گا۔ کوئی میرے ساتھ زیادتی کرنے کی جرأت تو کیا ایسا کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ ایسا کرنے والے کو اپنا انجام پتہ ہوتا ہے۔“
وہ بڑی جینجی کی اور بردباری سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بول رہا تھا۔ شاید انگل اسے اس کے بارے میں سب کچھ بتا چکے تھے۔ اس کے بات کرنے کا انداز اتنا اچھا تھا کہ وہ اپنا آپ اس کے سامنے ظاہر ہونے پر کوئی پریشانی محسوس کئے بغیر بولی۔

”لیکن انگل تو کہتے ہیں کہ سب کو صاف کر دو۔“
”ہر جگہ صفائی صفائی سے تم نہیں پتلا۔ ٹھیک ہے اس کی تم نے صاف کر دیا لیکن پھر سے کوئی تمہیں دکھ دے تو زیادہ ٹیک پر یوں بیٹنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اپنا حق چین لو۔ کسی کو اپنا احتیصال نہ کرنے دو۔ خاموشی سے بیٹھ کر آنسو بہاؤ اور ہر مسئلہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ اسے ایک بہت ہی مختلف سبق پڑھا رہا تھا۔
”کچھ آج بھی میں یاسر کے اوپر گزر گیا۔“ وہ اسے بغور اپنی طرف دیکھتا پکڑ مسکراتا ہوا بولا۔ اس نے کوئی جواب دیے بغیر اس پر سے اپنی نظریں ہٹائیں اور سامنے کی باری میں بھاڑ دکھائے گی اور چائے دار پر نظریں مرکوز کریں۔
”ویسے آپ کے انگل اپنے جیکری دوست ڈاروئی صاحب کے ہاں آگے ہوئے ہیں اور وہاں یقیناً شہر خ کی

بڑا عجیبی ہوگی۔ رات سے پہلے ان کی دکانیں کا کوئی امکان نہیں ہے۔" وہ اس کے جواب نہ دینے کا برائے بغیر انکل کے بارے میں تانے لگا تو اسے اپنی بیسوں موجودگی کی بے فنیوں لگی۔

"اچھا بھری چلتی ہوں۔"

"جینی رہو! ابھی سون ہے۔ جانے کی جلدی تو ایسے جاتی ہو جیسے سلسلہ و افغانستان تمہارے ہی ہاتھوں آج ہی مل ہوتا ہے۔" اس نے ہنسنے والے انداز میں کہا تو وہ پلو پلو کر رہ گئی۔
"کل چلیا جاتا کا برجھ ڈے ہے اور میں اس میں تمہیں انوائسٹ کر رہا ہوں۔" اس کی بات پر وہ خوش ہو کر ہنسی تھی۔

"آپ لوگ کیا کوئی نکشن وغیرہ کرتے ہیں۔"

"نہیں خالی میں اور چلیا جاتی ہم دونوں ہمیشہ ہی ایک دوسرے کی سالگرہ منایہ کرتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ اس میں کوئی تیسرا نہیں ہوتا۔ اس مرتبہ میں ہمیں دعوت دے رہا ہوں۔ ویسے سالگرہ میری ہو یا چلیا جاتی کی ذرہ ہوتا انہیں کی طرف سے ہے۔ انہیں اپنے سے چھوٹوں نے تنہا کھانا نہیں ہے اس لئے کٹ لٹ لانے کی دعت مت کرنا۔ میں بھی تمہاری طرح خالی ہاتھ شرکت کروں گا۔ بہرحکم آری ہو۔" اس کی بات پر اس نے بڑا زور انداز میں گردن ہلکا کر خالی بھری تھی۔

"یک میں بیک کر کے لاؤں گی اس پر تو وہ ناراض نہیں ہوں گے۔" اس کی بات پر وہ ہنسنے ہوئے ہوا۔
"دو پیڑ کرتا ہے کہ وہ یک بنا ہوا کیسا ہے۔ اگر اچھا ہوا تو یقیناً ناراض نہیں ہوں گے۔" اس بات پر اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"اب آپ چاہیں تو جا سکتی ہیں میری بات ختم ہو گئی ہے۔" وہ فوراً ایسے لکڑی ہوئی جیسے اس سے پہلے کسی نے ہاتھ نہ بٹھایا ہوا تھا اور خدا حافظ بکٹی کٹ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ وہ بڑے غور سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

رات اس نے دو گھنٹے صرف کر کے بڑی عنت اور گن سے ایک خوبصورت سا برتھ ڈے کا ڈھانچا بھرا گئے روز جی ہی بڑے اہتمام سے جگن میں گھس گئی۔ ان کا سن پندرہ کیلک کیا ہے بڑی خوبصورتی ہے سا اور دھان میں Many Happy returns of the day لکھا۔ اس کام سے قانع ہو کر اس نے اپنے آج کے پینے کے لئے کپڑوں کا انتخاب کیا۔ آج ایک طویل عرصے بعد اس کا بہت اچھی طرح سے ڈریس اپ ہونے کا دل چاہ رہا تھا۔ آخر یہ سالگرہ اس ہستی کی جی جیسے وہ حد بے پار کر چکی تو کیوں نہ اہتمام کر لے۔ آف وائسٹ کاٹن کی ٹیبل شلوار جس کی شرت پر ہم رنگ کڑھائی اور شیشے کا بوا انہیں اور ناک سا کام بنا ہوا تھا ساتھ خوب لہسا ساف وائسٹ وہ پچہن کر اس نے سوٹ سے سناہت رکھی اس کی چھوٹی جینی۔ بہت عرصے بعد یکم اپ کیا اور شالوں تک آتے بالوں کو جتھیں وہ زیادہ تر کلپ اینڈ میں بیکڑ کر گئی تھی بری کر کے جو کھانا چھوڑا۔

ان کے گھر جانے کے لئے ٹھکی تو پہلے ایک فلاور شاپ سے چھوٹوں کا ایک حسین سا گلدستہ خرید لیا پھر اس کے بعد ان کے گھر چلی آئی۔

انکل لاؤنچ میں بیٹھنے کی سے فون پر بات کر رہے تھے۔ اسے اتنی جی دج کے ساتھ ایک ہاتھ میں کچا اور دوسرے میں ایک انکل کلائے دیکھ کر وہ اپنی اگلی بات بھول گئے۔ ایک آدھ کینڈے کے کتنے کے بعد انہوں نے جلدی سے فون خدا حافظ کہہ کر بند کیا اور اس کی سست توڑی۔ وہ ان کی حیرت پر کھنکھاتی ہوئی ان کے قریب چلی آئی اور ایک ٹیبل پر رکھ کر ان کے گیسے میں اپنی ہاتھیں ڈال کر نکلتی۔

"Happy Birthday to you" وہ اس کا ہاتھ چرتے ہوئے ہنس کر بولے۔

"لیکن خاتون آپ ہیں کون اور اتنی بے تکلفی سے ہمارے گھر میں کہاں بھر رہی ہیں۔" وہ ان کی شرارت پر ہنس پڑی اور بولی۔

"میں ابھی لگ رہی ہوں ناں۔"

"مجھے تم ہمیشہ ہی اچھی لگی ہو۔ ہاں البتہ آج بچپانی نہیں جا رہی۔ ویسے تمہیں آج کے دن کا پتہ کیسے چلا۔" وہ اس کے کندھے سے کڑھایا ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولے۔

"مجھے اویس نے بتایا تھا کہ انہوں نے ہی مجھے انوائسٹ کیا تھا۔" وہ ان کے ہاتھ میں کیے اور کارڈ پکڑا دے ہوئے بولی۔

"بہت ہی خوبصورت پھول ہیں۔" انہوں نے چھوٹوں کی خوشبو محسوس کی پھر اس کے بعد اس کے ہاتھ سے کارڈ کو خوب غور دیکھ کر اسے آرٹ کا نام دینا قرار دیا اور کارڈ اور کارڈ بنانے والی دونوں کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملائے۔

"تمہیں بلا کر وہ حضرت خود تو ابھی تک گھر سے غائب ہیں۔" انکل نے ان کی غیر موجودگی کے بارے میں بتایا۔ اس نے ایک کھول کر نکال کر دکھا۔ پھر کینج سے چاکر ٹیبلین، کچے اور برتن ناف لاکر وہیں ٹیبل کے اوپر رکھے اور وہ خاموشی سے پیٹھے اس کی تمام کارڈوں کی دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک کے اوپر کینڈہ لگا رہی تھی جب اویس نے لاؤنچ میں قدم رکھا۔ بیک سوٹ پہن ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں موبائل تھا وہ چلیا جاتی کو سلام کرتے کرتے ٹھک کر روک گیا۔ اسے اندر آ کر دیکھ کر وہ بھی کینڈل سے توجہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اپنے چہرے پر ایک لمبے کے لئے پینے والے سٹائی ٹائزٹ کو فوراً چھپاتے ہوئے وہ بڑے ناہل طریقے سے چلیا جاتی اور اس سے سلام دعا کرتا ہے کمرے میں چلا گیا۔

وہ پندرہ منٹ بعد وہ کپڑے پہنچ کر کے آگیا تو انکل نے ایک کاٹا۔ اپنے ہاتھ سے پہلے اور پھر اویس کو کھینک کھلایا۔

"چلا جانا اب تم کب سرورڈ۔" انکل نے اسے ہدایت دی تو وہ دھلتے سے ٹیبلٹس میں ایک نکال کر انکل اور اسے پیٹ دینے کے بعد اپنی پیٹ لے لے انکل کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اویس ٹیبل کے اوپر رکھے ہوئے کاڈ کو دیکھ کر کہنے لگے۔

"یہ تم نے بنایا ہے؟" اس نے گردن ہلا دی۔

"کتنا خوبصورت کارڈ بنایا ہے انجانے دیکھو میں ایسے ہی اس کی تعریف نہیں کرتا۔" انکل نے اویس کو

غالب کیا تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔ وہ خاموشی سے کیک کھانے میں مصروف تھی۔

”ابھی اچالا مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ یہ کیک کیسی لگتی ہے۔“ وہ چہرہ اویس سے غالب ہوئے تھے۔

”آف یہ اگل بھی کبھی تھی بری طرح شرمندہ کروا دیتے ہیں۔ اس کے سامنے یہ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔“ اویس نے ایک تفصیلی نظر اس کے چہرے پر ڈالی پھر ان سے غالب ہوا۔

”پھر آپ نے کیا جواب دیا؟“ وہ اسی طرح پوچھ رہا تھا جیسے یہ کوئی بہت ہی اہم اور پیچیدہ سائنسہ جس کا حل کیا جانا بہ حد ضروری ہے۔

”میں نے کیا کہا تھا ظاہر ہے وہ ہے ہی اچھی بہت اچھی خوبصورت، ذہین، گرمیں خن اسے مزید کسی تعریف کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ انگلی کی اتنی خوبصورت تعریف پر بے ساختہ مسکرا اٹھی۔ اسی وقت لاؤنج میں رکھے فون کی تلس بجی۔ اویس نے ریسیور اٹھایا تو انگلی کے کسی جاننے والے کی کال تھی۔ ”وہ اندھ کر فون پر بات کرنے لگے تو اویس اس سے بولا۔

”میں بھی سوچ رہا ہوں کہ گنداسیلا رہنا شروع کر دیتا ہوں۔ پھر جب اچالا کیک کسی دن نہا جو کہ صاف سترے طے میں نظر آؤں گا تو میرے اوپر بھی تعریفوں کے پھول پھار کئے جائیں گے۔“ اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتا ہوا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”ویسے یہ کس پیچھے سے ٹیکری کا ڈش کو اپنے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔“ اس کی بات پر وہ بری طرح چڑھی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ میں کیا یہ کیک کسی ٹیکری سے لائی ہوں۔“

”میں نے یہ کب کہا۔“ وہ مصوعیت سے بولا۔ اس کی ناراضگی سے مجبور ہو کر دیکھ کر کھٹکلا کر فون پر اڑا۔

”کیا میری سالگرہ پر تم میرے لئے بھی اپنے ہاتھ سے بنا کر لاؤ اور کیک لاؤ گی؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”ہاں اور پھر یہ سنوں گی کہ یہ کیک کسی ٹیکری سے اور کاؤڈسکی آرٹسٹ سے بنا کر اپنے نام سے دے رہی ہوں۔“ وہ اس کی الزام تراشی پر بارش ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ مستقل مسکراتے جا رہا تھا۔ انگلی فون کے کنارے فارغ ہو گئے تو بولے۔

”چلو ذرا لے چلیں۔ آج اچالا کی پسنڈ کی کیک لوگ ذکر کر رہے۔“ کچھ پر بعد وہ لوگ گاؤں میں بیٹھے میرٹ جا رہے تھے۔ راستے میں وہ انگلی سے اپنے برائے سے متعلق امور ذکر کرنے لگا تو وہ خاموشی سے بیٹھی اور گدگد جارتہ لے لیتی۔ ہوش بچ کر تینوں ایک ساتھ چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اپنے لئے میز منتجب کر کے بیٹھ گئے تو دیر آؤں لڑے آگیا۔ انگلی نے ان دونوں کو آؤر کرنے کے لئے کہا اس نے اپنی پسنڈ کی دو تین چیزیں بتا دیں اور اویس نے اپنی پسنڈ یہ ڈسٹرینٹ مختلف سلاد اور جینے وغیرہ کا آؤر کر دیا۔

”یہ تم نے کھٹ سے کیوں کہا رہی ہو۔“ انگلی اٹھتے ہوئے سے چاول پلٹ میں ڈالے دیکھ کر فون کئے لگے۔ ”آپ بے فکر رہیں انگلی میں کھٹ نہیں کر رہی۔“ وہ انہیں مطمئن دلاتی گئی۔

”میرا خیال ہے اچالا کھٹ نہیں بلکہ ڈانٹنگ کر رہی ہے۔“ اویس نے گولڈ رنگ کاسپ لیتے ہوئے کہا۔

”میں انکسور چتا چتا ہے اتنی سوچی سمجھی کیوں ہے۔ اب یہ چلا یہ سب ڈانٹنگ کا کرشمہ ہے۔“ اس کی بات پر اچالا نے سر اٹھا کر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا اور بولی۔

”آپ ہر وقت میرے بارے میں کیوں سوچتے رہتے ہیں۔ دنیا میں میرے علاوہ اور بھی بہت سے غور طلب مسائل ہیں۔“ انگلی نے اپنی پلیٹ سے توجہ ہٹا کر ایک نظر اچالا کو اور ایک نظر اویس کو دیکھا۔ ایک طرف کسی پھانی بات کا بدلہ چکا لینے کی خوشی تھی تو دوسری طرف ایک محظوظ سی مسکراہٹ۔ وہاں اس وقت کسی گزری ہوئی بات کے حوالے سے جملہ اچالا کی قہار جس سے وہ قطعاً لاعلم تھے۔ کمال ہے کہ انہوں نے اتنی ترقی کر لی اور مجھے یہ بھی نہیں چلا انہوں نے خود کو ڈیا۔ جو کمال ان دونوں کی ایک دوسرے سے بے تکلف بات چیت انہیں خوش کر رہی تھی۔ جن دو لوگوں کو وہ ساری دنیا میں سب سے زیادہ چاہتے تھے اور ان کے حوالے سے انہوں نے کتنے ہی خواب دیکھ ڈالے تھے ان کی یہ ٹوک جھوٹک انہیں مسرت بخلتی رہی تھی۔

وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے جھانکتی شرارت اور لبوں کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ کسی بات کو بہت اچھا سمجھ رہا ہے۔ اپنے خیال سے اس نے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کی مسلسل شرع سی مسکراہٹ اسے کوفت میں جتا کرنے لگی۔ وہ تو چہرے کے بجائے بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ وہاں کسی وہ گاڑی چلتا ایک ویپر سے دیکھ لیا کہ آدھ نظر اس کے پھولے ہوئے منہ پر بھی ڈال لیتا اور خواہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی گاڑی اس کے گیٹ کے سامنے کی تو وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اسی وقت سامنے ایک اور گاڑی کی بیڑا انہیں چلتی تھیں۔ اچالا نے سامنے دیکھا تو مسودا مارا یہ بیٹھے نظر آئے۔ چوکیدار نے گاڑی کا بارن سن کر گیٹ کھول دیا تھا لیکن وہ گاڑی اندر لے جانے کے بجائے وہیں روک کر گاڑی سے اتر کر ان لوگوں کی طرف چلا آیا۔ اس کی چال میں بہت تیزی اور جگت نظر آ رہی تھی۔ وہ سیدھا ڈرائیونگ سیٹ کے نزدیک پہنچ گیا اور بڑی گرم جوشی اور سرخوشی کے عالم میں اویس سے غالب ہوا۔

”آپ اویس لوگوں اور ہمارے گھر۔“ اویس گاڑی سے اتر کر اس سے ہاتھ ملانے لگا۔ شوہر کسی کے ساتھ اتنی خوشگوار سے دلتے دیکھ کر ناراض بھی اٹھ رہی تھی۔

”یہ اسے چیلر بندے کے ساتھ جالا گیا کام۔“ اس کے چہرے کی حیرت اور ناگواری چھپانے نہ چھپ رہی تھی۔ اویس کا مسود کی گرم جوشی کے جواب میں وہی لاپرواہی اور قابل سا انداز تھا۔ اس کا وہی مخصوص انداز جس کی بدولت سامنے والا اس سے بے تکلف ہونے کی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے یہ بندہ اتنی بے تکلفی سے جیلے کسک رہا تھا۔

”یہ اچالا تو بڑی ہی بے ادب ہے۔ آپ لوگوں کو اندر آنے کے لئے بھی نہیں کہا۔“ اویس کے آگے تقریباً بچھا ہوا مسود اسے اس وقت ہمیشہ سے بھی زیادہ برا لگا۔ ”کاش مسود تم کہنے نہ دیتے اور اگر کہتے تھے تو کم از کم میرے بھائی نہ ہوتے۔“ اس کا خوشامد اور چالیں انداز اچالا کا طلق کڑوا کر دیا تھا۔ اسی وقت مسود کی نظر برابر کی سیٹ پر بیٹھے انگلی پر پڑی تو اویس نے بڑے عام سے انداز میں تعارف کر دیا۔

سودا کی بات پر وہ اس کی طرف غور سے دیکھنے لگی تھی۔ "اکی اسی ملو اور ہستی کے سامنے تم بچے بچہ جارہے تھے۔ جہاز برس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے آگے لیٹ جاؤ اور کہو کہ سر آئیے میرے اوپر سے گزر کر جائے۔" وہ دل ہی دل میں اس سے کہہ رہی تھی۔

"وہ جیسا بھی ہے تم لوگوں کی طرح منافق اور دغا باز نہیں ہے۔" وہ ہنسنے کی کھیل پر سے اٹھ گئی تھی۔ وہ اب اگلے سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی انہوں نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ہر بات انہیں بتائے گی۔ کبھی بھی اس سے کچھ سیکرٹ دیکھنے کی کوشش نہیں کرے گی اسی لئے وہ انہیں اپنے گھر والوں کے تازہ ترین ورپے کے بارے میں بتانے کے لئے بے چین تھی۔ اسی بنا پر وہ اگلے روز شام کے وقت ان کے گھر چلی آئی تھی۔ گوج چمکی کا دن تھا لیکن اب اسے اوپن کا سامنا ہونے پر کسی قسم کی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ اب چمکی کو پتہ چلا کہ اگلے کے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں اور وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ان کے ساتھ کپ شپ میں مصروف ہیں۔ وہ ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ اکیلے لاؤنج میں بیٹھے بوریٹ ہونے لگی تو وہ بیڑیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔ ارادہ تو یہ تھا کہ اسٹڈی میں بیٹھ کر کسی کتاب کا مطالعہ کر لی جائے لیکن کور پڑور سے گزرتے سامنے والے کمرے سے آتی بڑی خوبصورت سی موسیقی کی آواز نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ گٹار پر بڑی خوبصورت سی وزن بجاتی جا رہی تھی۔ بے اختیار آگے بڑھ کر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تو سامنے ٹیبلٹس پر بیٹھے اوپن کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ بڑے سگن سے انداز میں اپنے اندر گرو سے غافل مٹا رہا تھا۔ وہ فوراً ہی دروازے سے پلٹ جانا چاہتی تھی کہ اوپن کی نظرس اس پر پڑی۔

"اچالا۔" وہ اسے دیکھ کر کچھ حیران ہوا تھا۔
 "آئی ایم سوری مجھے پتہ نہیں تھا یہ کا پلڈ روم ہے۔" وہ اپنی ہینڈ بی پر شرمندہ ہوتی فوراً وہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ کسی کے کمرے میں بغیر ہاک کے جانا یقیناً کسی قابل تعریف فعل نہیں تھا۔ لیکن کمرے کا مالک اس کے اس طرح نہ جانے کا برا مانے بغیر ہوا۔

"کیم آن اچالا یہ تم آئی فائل کب سے ہو گئی ہو اور اب اگر آئی ہو تو اندر تو آ جاؤ۔" وہ اندر آنے میں چھپکھپکھ محسوس کر رہی تھی۔
 "اب آئی چکے۔" وہ دوبارہ اصرار کرنے لگا تو کچھ شرمندگی کے عالم میں اندر آ گئی اور اس کے سامنے رکے ٹیبلٹس پر بیٹھ گئی۔

"کیم آئی۔" مجھے پتہ نہیں چلا۔" وہ پوچھنے کا تو وہ جواب میں ہوئی۔
 "ابھی ٹیبلٹس دی رہی ہو گی ہے۔ اگلے کے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اسٹڈی میں کوئی کتاب پڑھ لوں گی۔ یہاں سے گزرتے ہوئے ستار کی اتنی اچھی اور خوبصورت ڈسٹن آواز آئی تو میں ادھر آ گئی۔" اس کی بات پر وہ ہنس پڑا۔

"جیسیں میوڈک میں انٹرست ہے۔" وہ گٹار سائیز میں رکھا اس سے ہلکا تو اس نے گردن ہلا دی۔
 "پارے میں کبھی بھی تو میں پریمی شوقیہ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ میرا بچپن کا شوق ہے۔ گٹا اور پھر

"میرے گریڈ فارسیس ہیش لودج"۔ سودا اب سے بچہ بچہ کہ سلام دعا کر رہا تھا۔ ان کی جینز گاڑی اور شاندار پرسٹلٹی سے بارہ یہ اندازہ تو لگا چکی تھی کہ شہر کی غلط آدمی پر نفاذ نہیں ہو رہا اس لئے خود بھی اچھی سا ڈسٹی کا پلو سنبھال کر سڑکی ہوئی کھڑی تھی۔ سودا کے بے حد اصرار سے اندر جانے پر ان لوگوں نے معذرت کرتے ہوئے اجازت مانگ لی تھی۔

اوپن نے ایک گھبرائی نظر اس کے ناراض اور کوٹ زدہ چہرے پر ڈالی اور گاڑی شارٹ کر دی تھی۔ اندر آتے ہی سودا نے اس سے پوچھا تھا۔
 "تم اوپن کو کیسے جانتی ہو؟"

"میری ان لوگوں سے فریڈ شپ ہے۔" وہ مختصر جواب دے کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اگلے کی ہدایت کی بدولت اس نے سب کے ساتھ داخل طریقے سے بات چیت شروع کر دی تھی۔ ناشتے اور کھانے کی میز پر بھی گھر والوں کے ساتھ بیٹھنے لگی تھی۔

"تم ہیش لودج کی فیملی کو کب سے جانتی ہو۔" صبح ناشتے کی میز پر ڈیڈی نے پتہ نہیں کتنے عرصے بعد اسے براہ راست مخاطب کیا تھا۔

"بہت عرصے سے۔" وہ سودا کے اتنی جلدی خبر پہنچانے پر حیران تھی۔ یہ سودا جو B.B.C اور اس آف امریکہ سے بھی نہیں آگے ہے۔ وہ دل ہی دل میں اسے سراہنے لگی۔ ڈیڈی اب بھی سے مخاطب تھے۔

"بہت بڑے گروپ آف انڈسٹریز کا تباہ و تار ہے یہ اوپن لودج۔ آج کل کی بڑی سڑکیں میں سب سے ہائٹ ایٹس کی شادی بنی ہوئی ہے۔ ایسے لوگوں سے تو خالی دوستی ہونا بھی کسی فائدے سے خالی نہیں۔ کتنے ہی بڑے بڑے خاندان اپنی بیٹیوں کا رشتہ اس سے لے کر ناجائز چاہتے ہیں مگر اس کا خود کا انٹرست کسی طرف ہے یہ واضح نہیں ہو پا رہا۔"

بارہ سے بڑی مجلس نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس کا خواہ وہ تجتہ لگا کر ہنسنے کو دل چاہنے لگا۔
 "تمہیں فیر فائو میں گھر ہے اس کا ایسا کہرا جالاہ ان لوگوں کو اس سٹنڈ سے کوئی پراوائس کرلو۔" ڈیڈی نے پچلے کی اور بعد میں اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ ایک دم میز پر بیٹھے تمام لوگوں کو اپنے سے اوپن کوئی خاص چیز لے گئی تھی۔ وہ مرکز لگاؤ کی تمام کیمروں کا رخ اس کی طرف تھا۔ سوائے دعا کے اس وقت بھی ہر گھر کے تمام افراد موجود تھے۔
 "آپ لوگ کتنے نقصان سے قطع نظر کبھی انسان کو انسان سمجھ کر دیکھ نہیں سکتے۔ اس سے ملو یہاں سے فائدہ ہوگا۔ اس نے نہ لوگوں کی فائدہ نہیں۔ اسے پکڑے ہوئے گڑھ کا۔ اسے دھکیل کر اپنے لئے راستہ بناؤ۔ اس کے سر پر سوار ہو کر اونچے ہو جاؤ آپ لوگ اسے ٹھیک کیوں ہیں۔" وہ دل ہی دل میں سب سے مخاطب تھی۔ ڈیڈی کو اس نے جواب دینے کی دست گوارا نہیں کی تھی۔

"میں اس جہنم میں آئیں بھی نہیں نہ بلاؤں۔ یہ رشتہ اور محبتیں میں نے بڑی مشکلوں سے حاصل کئے ہیں میں آپ لوگوں کی خود مرضی کی سمجھت نہیں چڑھنے دوں گی انہیں۔" وہ مزاحم گھر بھی گئی۔ سودا ڈیڈی سے کہہ رہا تھا۔
 "اپنے آپ پر براغور ہے اسے۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں بھگتا۔"

یونہی دہائی کے زمانے میں دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر انہیں گٹار پر اپنی پسندیدہ دھنیں سنایا کرتا تھا۔ آج تو کئی سالوں کے بعد، پاک بھائی ہی صبر نہ کیا تو گٹار نکال کر خود کو چپک کر گٹار کے آگے بٹھ کر بجانا دہائی بے باجول کیا۔

”نہیں آپ کا اسٹائل تو بڑا پرکشش بلکہ پروفیشنل قسم کا ہے۔“ اس کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔
”نہیں میری اور تعریف مست کرتا درد میں واقعی آسان پر چڑھ جاؤں گا۔“ جواب میں وہ بھی ہنس پڑی تھی۔
بے اختیار کھٹکھٹا کر ہنسنے اس نے اسے ہلکی بادل دیکھا تھا۔

”تم جیتے ہوئے ابھی لگتی ہو۔“ فوراً ہی اس کی لمبی کو بریک کمرے گئے تھے۔ وہ اس کی کینڈی ڈسٹنشن کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

”اگر یہاں تمہاری چمک کوئی اور لڑکی ہوتی تو اپنی تعریف پر خوش ہوتی اور مجھے تنقیدس تو ضرور ہی کہتی۔“ وہ اس نے نظریں ملانے کی ہمت نہیں کر پائی تھی۔ اس کا دل چاہا جلدی سے اٹھ کر یہاں سے بھاگ جائے۔ ”میں اتنے سال بڑھائی کی وجہ سے یہاں سے دور ہاں لیکن بھید ہی بھید ہی سنا تھا کہ ہمارے ہاں لڑکیاں بڑی شرابی اور شرابی قسم کی ہوتی ہیں۔ جب واپس آنا تو یہ چلا کر دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی لڑکیاں تو یہ یورپ اور امریکہ کی خواتین کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ایسے میں تم بھی چیزیں شاید اللہ تعالیٰ نے مثال دینے کے لئے چھوڑ دی ہیں۔“ وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بول رہا تھا۔

”وہی ہے تم کو کیا چیز؟“ مجھے تو یہ جود ہوس یا چند ہوس صدی کی کوئی بھنگی ہوتی روح معلوم ہوتی ہو۔ اس زمانے میں تمہارا کیا کام؟“ اس کی بات پر وہ ہلکا سا ناخوش ہو گیا۔

”میں نے آپ سے اپنے بارے میں کوئی رائے تو نہیں مانگی۔ میں جیسی ہوں ٹھیک ہوں۔“ وہ اس کی ناراضگی کو خاطر میں لائے بغیر کہنے لگا۔

”پاپا جانی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں جان کر اجالا کے ساتھ اپنی سیدھی کپاس کرتا ہوں صرف اس کا شرم سے لالہ لگا بی ہوتا چہرہ دیکھنے کے لئے۔“

وہ اس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر کے قہقہہ اکرے میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ وہ کچھ دیر بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر ہنسنے کوئے کہنے لگا۔

”میں نے تمہاری کوئی خاطر عداوت تو کی نہیں۔ آخر تم جیسا کہ میرے کمرے میں آئی ہو۔“ اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ اٹھا اور بیڈ روم پر بطور جیرے سے چٹپٹی کے دو کین نکال لایا۔ ایک اس کے ہاتھ میں پکڑا کر دوسرا خود کے گرد بٹھا دیا۔ اپنے سامنے رکھی ڈرائی فرم کی پینٹ بھی اس کی طرف کھٹکا دی۔ ”لو۔ آؤ میں تمہیں اپنی پسندیدہ دھن سنائوں؟“ وہ صرف اپنے گلے بڑے شرابے پن کا فیصلہ اتارنے کے لئے گردن ہلائی۔ وہ دو تین گھنٹہ میں چٹپٹی قسم ختم گٹار اٹھا کر بجائے لگا اور جس وجہ سے وہ کچھنی ہوئی اس کمرے تک پہنچی تھی وہ کچھنا کھلی بے جا نہیں تھی۔ وہ آواز اٹھا گٹار بجا رہا تھا کہ وہ بڑی دلچسپی اور شوق سے گٹار بجانا سیکھ رہی اس نے اپنی پسندیدہ دھن مکمل بجا لی تو وہ بے اختیار اٹھ بیٹھا۔

”بہت خوب۔“

”جہنیں اچھا لگا۔“ وہ مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا۔
”بہت اچھا۔“ وہ کھلے دل سے تعریف کر گئی۔ وہ کچھ کے بغیر ایک اور دھن بجائے لگا۔ وہ دھن سوتی سے چٹپٹی گٹار کے تاروں کو چھوئے اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پوری طرح کھنٹی ہوئی اس نے دھن ہی دھن۔

”جہنیں کی قسم کا میوزک پسند ہے؟“ وہ دوسری دھن بجانے لگا تو اس نے پوچھنے لگا۔
”مجھے آپ کی طرح میوزک کی زیادہ سمجھ تو نہیں ہے لیکن بس جو بھی کانوں کو اچھا لگے۔ جیتے جیتے اچھلنے کودتے گا مجھے اچھے لگتے ہیں۔“ سلاو لاسٹ میوزک اچھا لگتا ہے۔“ وہ اپنی پسند بتانے لگی۔
”اچھا تمہارے فوٹو گلوکاروں کوں ہیں۔“ اس کی بات پر وہ فوراً بولی۔

”پاکستانی گھڑز میں مجھے خیرہ نور اور مینیرہ جیسے بہت پسند ہیں۔“

”چلو تو جہنیں تمہارے فوٹو گلوکار کچھ سناتے ہیں۔“ وہ بول رہا تھا جیسے وہ بطور خاص صرف اس کا شمار کر رہا تھا۔ یہاں آئی تھی اور وہ خود بھی بڑی فرمت کے ساتھ گانے کے لئے کب سے تیار بیٹھا تھا۔ پھر وہ جینیر مشیہ کا ”اقتدار بھی آجی جائے۔“ چلو تو سنی۔“ بجانے لگا۔ اس کے بعد ”تیرے لئے ہے میرا دل میری جان۔“ بجانے لگا۔ وہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کے دھم میں کھنٹی ہوئی تھی جب دردانہ نے پوسٹنگ ہوئی۔ اویس نے گٹار روک کر ”میں تم ان“ کہا تو اتفاق اندر آگیا۔ اس پر نظریں بڑی تو کھینے لگا۔

”صاحب اور میں دونوں مل کر آپ کو پورے گھر میں ڈھونڈ رہے تھے۔ اب میں اویس بھائی سے آپ کا پوچھنے آیا تھا۔“ اس کی بات سن کر وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

”اگلے کے مہمان چلے گئے۔“

”میں کب کے اب تو ہم لوگوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔“ وہ دانت نکال کر بولا۔ وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اگلے سامنے آتے آتے ہوئے نظریں تو ان کی طرف پھٹی آئی۔

”کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ میں پریشان ہو گیا کہ اجالا آخر مجھ سے ملے بغیر اور کچھ کہے بغیر کیسے پہنچی گئی۔“ وہ اپنے اتنی دریک وہاں بیٹھے پر کچھ غصہ منگی محسوس کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں نہیں گئی۔“

”میں کہاں تھیں یہ بھی تو بتاؤ۔“

”آپ تو اپنے مہمانوں میں مصروف تھے اور میں آپ کی لاڈلی کو کچھنی دے رہا تھا۔“ اس نے اپنے پیچھے اویس کی آواز سنی۔ اگلے اس سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

”کچھنی کس طرح دے رہے تھے۔“ اگلے تو چٹپٹی آتے تھیں اور باجس تم اتنی پور کر تے ہو کہ وہ میں ہی ہٹکلی برداشت کرتا ہوں۔“

”پوچھ لیں اس سے۔“ تاؤ اجالا میری کچھنی پور ہے۔“ وہ اسے درمیان میں گھینے لگا تو وہ اگلے سے کہنے لگی۔

”نہیں انہوں نے مجھے بالکل بھی پور نہیں ہونے دیا۔“ آخر اس نے اتنی دریک کی پروفیشنل بجانے والے کی طرح اسے لایا۔ اپنے شوے محفوظ کیا تھا وہ اس کی برائی کیسے کر سکتی تھی۔

"تم اس کی کچھ زیادہ ہی غور نہیں کرتے لگیں۔" انکل نے اسے بغور دیکھتے کہا تو وہ کچھ دیر پہلے سے گئے کھس کو بھلائے دوہارہ کچھ نرس سی ہو گئی تھیں کبھی سے دعا میں کسی ٹڈل کا اس بلکہ لوز ٹڈل کا اس گھرانے کے لئے بڑی سوت بہا لیں۔ وہ خود کو برا بھلا کر رہی تھی

"حق بات آپ کو بغور دیکھ رہی ہے۔ وہ بھی ہے اس لئے سچائی کا ساتھ دے رہی ہے۔" اسے مشکل میں پڑتا محسوس کر کے دو فوراً میدان میں اتر آیا۔

"ابو تو آپ کی....." انکل کی بات پر ادیس تو بڑی بے لگاری سے منہ پڑا تھا جبکہ وہ ان آؤٹ اسپکن

دادا پوتا کے سچ سینہ دہن بنی کھڑی تھی۔

"پھر بلاؤں گا میں چل کر بیٹھے ہیں پھر آرام سے باتیں کریں گے۔" وہ اب مزید اسی طرح کی باتیں سننا نہیں چاہتی تھی لیکن اس طرح اٹھ کر جا بھی نہیں سکتی تھی اس لئے ان لوگوں کے ساتھ آکر بیٹھ گئی ادیس کو اپنے کسی دوست سے ملنے جانا تھا سو وہ پانچ دن صحت بعد ہی اسکیلڈ زکرتا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد انکل بھی اپنی منی فیزر مکتھو سے باز آ گئے تو اس نے سکون کا ساں لیا اور ادیس اپنی اٹھ دی جاتا تھی۔

☆☆☆

وہ کھلی باری ابھی ابھی گھر پہنچی تھی۔ ان دنوں فاضل ایئر کے تھیس ڈسپلے کی وجہ سے وہ بہت مصروف تھی۔ اس وقت بھی شام کے چمبے اس کی دادیسی ہوئی تھی۔ وہ دیر صباں چڑھتی اپنے کمرے میں جا رہی تھی جب اس نے اپنے پیچھے دعا کی آواز سنی۔

"اچھا اٹھنا راتوں ہے۔" وہ لاؤنچ میں کھڑی ریسیور ہاتھ میں لے کر آئی تو وہ ادیس کی طرف سے اٹھ کر لاؤنچ میں آئی۔ رات ریسیور اس کے ہاتھ میں کھڑا کر دیا کہیں لاؤنچ میں بیٹھ کر کیوین دیکھنے کی۔ اس نے ریسیور کان سے لگا تو دوسری طرف سے آئی ادیس کی آواز کہہ کر حیران رہ گئی۔

"آپ تو نہ پاؤں گے ہوئے تھے۔"

"ساری زندگی کے لئے نہیں کیا تھا۔ آخر کار مجھے وہاں بھی آنا تھا۔" وہ بڑا چکر بولا تو وہ اس کے فون کرنے کی وجہ سے ہوئے کہنے لگی۔

"سب خیریت تو ہے ہاں انکل کیسے ہیں۔"

"آپ کے انکل آپ کی جدائی میں آجیں ہر جہ سے ہیں کہ میں نے اپنی لاڈلی کی شکل تین دن سے نہیں دیکھی۔ تم آج کل ہو کہاں۔" وہ ناراضی سے کہہ رہا تھا۔

"فاضل ایئر کے تھیس ڈسپلے کی وجہ سے مصروفیت بہت زیادہ ہے۔ لیکن میری کل تو انکل سے فون پر بات ہوئی تھی۔" وہ اپنی مصروفیت کی وجہ بتاتے تھی۔

"پانچ دن ہو گئے ہیں مجھے آئے ہوئے تمہیں اتنی توقعیں بھی نہیں ہوئی کہ آکر خیریت ہی ہو چلو۔" وہ اس کے کھوے پر بیٹھنے ہوئے بولی۔

"آپ کا سو دن سال بعد آئے ہیں۔ صرف دس دن میں تو آ گئے ہیں اور اس طرح کے برنس روز تو آپ

کے مہینے میں پچیس کھلی بار ہوئے ہیں۔ اس میں خیریت ہو چکے والی کون سی بات ہے۔"

"تم جس میرادل جلا جلا کر رو کھیں پوری شام بے سوچ کر کہیں نہیں گیا کر شاید محترم آ جائیں۔" اچھا دیکھو میں تمہارے لئے دو چار چیزیں لایا تھا۔ تم نے تو دعا کی کہ تم کھائی کے شایہ راہی لئے میں ڈرامیڈ کے ہاتھ وہ چیزیں بھجا رہا ہوں۔" وہ نکلی جبرے انداز میں بولا تو وہ اس کے انہایت بھرے کھڑے حکایت پر کچھ حیرت زدہ ہوئی ہوئی بولی۔

"آپ نے تو خواہہ تکلیف کی۔" وہ اس کی بات کا ٹانہ ہوا غریبا۔

"میں نے اس کی ضرورت تھی اور آپ کو رحمت ہو گئی ہو جی تاہم سننے کے لئے فون نہیں کیا تھا صرف یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے وہ چیزیں قبول کر کے میرے اوپر احسان کر دو۔" خدا حافظ" وہ اپنی بات مکمل کرتے ہی فون رکھ چکا تھا وہ بھی جواب میں ایک گھبرائی سانس لیتی ہوئی فون رکھ کر بیٹھنے لگی تو دعا میگزین سے بے نظریں بنا کر بولی۔

"یہ ادیس وہی لونگی گروپ آف انڈسٹری والا ہے نا۔" وہ اس کی بات پر بیٹھنے ہوئے بولی۔ "کمال ہے یہ ادیس اتنی مشہور معروف شخصیت کب سے ہو گیا کہ لوگ اسے نام سے پکارتے گئے۔" دعا کی بات کا نظر انداز کر کے کہنے لگی۔

"کیا اسی کو ڈیز پر انوائس کرنے کی بات ڈیڑی کل تمہیں یاد کر رہے تھے۔" ڈیڑی نے اس روز کے بعد دو تین مرتبہ اسے یاد دلائی کہ کوئی تھی کہ وہ ان لوگوں کو کھانے پر بلائے۔ اس نے دعا کی بات پر سر ہلادیا "وہ تو بڑا مہرور سا بندہ ہے تمہارے ساتھ اس کے کس قسم کے تعلقات ہیں۔" وہ اس کی طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ہم اچھے دوست ہیں۔" اس نے کچھ اور کہا کہ جتنی بھی اس وقت ملازم ایک شو پر ہاتھ میں لے کر اس کی طرف آتا نظر آتا تو چپ ہو گئی۔ وہ اس کے ہاتھ سے بیک لپٹی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کی بھیجی ہوئی تمام چیزیں ہسٹر پر بچھلائے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا میں اتنی اہم ہونا کوئی مجھے یاد رکھے۔ اپنی مصروفیت میں بھی اسے میرا دھیان رہے۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ "اہم ہونا خوبصورت ہے، خوبصورت ہونا اہم نہیں" اور آج اس خطے کا مطلب اس کی سمجھ میں مکمل طور پر آ گیا تھا۔ کیا میں بھی کسی کے لئے خوش ہو سکتی ہوں۔ وہ ٹھنسن جو اپنے آگے آتے اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتا سے میری پڑا ہے۔ انکل آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ زندگی اگلے سوڑ پر میرے لئے بہت سی خوشیاں ملے کھڑی ہے۔ اس وقت میں سے سوچا بھی نہیں تھا کہ میری خوشیوں کا ہر دور آپ ہی کے گھر میں کھتا ہے۔ مجھے شاید اب زندگی میں وہ سب کچھ ملے والا ہے جو میں چاہتی تھی محبت، خلوص اور انہایت۔"

اس نے اپنی زندگی کی چھتیس سال محبتوں کی حکایتیں گزرا دی تھیں اور اب اچانک ہی اس پر چاروں طرف سے محبتوں اور پانچوں کے پھول برسنے لگے۔ انکل کی شفقت اور محبت کے ساتھ ساتھ ایک بالکل ہی مختلف قسم کی محبت سے وہ پہلی بار روشناس ہوئی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز وہ اپنی تمام تر محنتوں اور مصروفیت کے باوجود ان کے گھر پہنچی آئی تھی۔ وہ کسی ڈرامہ میں گیا ہوا تھا۔ کچھ دیر انکل سے کپ شپ لگا کر وہ اس کے لئے اپنے ہاتھوں سے تیار ہوا تھیک یو کا ڈاس کے کمرے میں جا کر میز پر رکھا آئی تھی۔

ناشیے کی میز پر دو تمام گھردالوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی جب عید نے اسے بتایا کہ اس کا فون ہے۔ وہ مسکراتی ہوئی کرسی پر سے کھڑی ہو گئی۔ فون انڈین کے بغیر بھی وہ جانتی تھی کہ دوسری طرف کون ہے۔ اس کے پہلو کے جواب میں وہ ہنسنے ہوئے کھڑا تھا۔

”تمہارے Thanks کا Thanks۔“ اس کی بات پر وہ بھی ہنس پڑی تھی ”رات کو میں دیر سے آیا تھا ورنہ اسی وقت جہیں فون کرتا۔ ابھی بھی آفس جانے کی تیاری کرنے کے ساتھ ساتھ جہیں فون کر رہا ہوں۔ کیا تم یقین کر دو گی کہ میں اس وقت اپنی بات باندھتا ہوں تم سے بات کر رہا ہوں۔“ اس بات پر وہ حیرت سے بولی۔

”ایک ہفتہ سے ٹائی باندھ رہے ہیں؟“
”نہیں باندھ تو دو دنوں انہوں سے رہا ہوں۔ سو بائبل میں نے کدے کے بہارے کان سے لگایا ہوا ہے۔“
وہ اپنی کیفیت کا خدو ہی مزہ لیتے ہوئے بتا رہا تھا۔

”چپ کر لیجئے گا کہ کہیں بات کرنے میں ناٹ منجج نہ بنی ہوا اور آفس پہنچنے پر آپ کی خوبصورت سی بیکٹری منجج ٹائی نہ باندھنے پر آپ کے اوپر ہنسنے لگے۔“ وہ شرارتی انداز میں بولی تو وہ کہنے لگا۔
”جہیں کہیں پتہ چلا کہ میری بیکٹری بہت خوبصورت ہے۔“ بڑا سنجیدہ سا لہجہ تھا۔

”میں نے صرف خوبصورت کہا تھا۔ بہت کا اضافہ آپ نے خود کیا ہے۔“ وہ اس کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

”اچھا میں اپنے بیٹے میں سے لفظ بہت کچھ بنا رہا ہوں۔ وہ صرف خوبصورت ہے۔“ اسی وقت اس نے دوسری جانب اخلاقی کی آواز سن لی وہ اسے ناشتے کے لئے بلائے آیا تھا۔

”پاپا جانی ناشتے پر میرا انتظار کر رہے ہیں اس لئے خدا حافظ۔“ وہ جلت بھرے انداز میں بولا تو وہ بھی خدا حافظ کہہ کر فون بند کر کے گئی کہ اس کا چاک وہ بول پڑا تھا۔

”کل سنا ہے اور تم نے کل پر فیسٹ پر گھر آئے؟ اور اگر تم نہیں آئیں تو میں تم سے ابھی طرح کچھ لوں گا۔“ اس کی دھمکی پر وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

”دیکھوں گی اگر نا تم ملا تو آؤں گی۔“ بھراس کا جواب سننے پر اس نے لائن منتقل کر دی تھی۔
”کس کا فون تھا؟“ وہ وہاں تکل پر آئی تو دعا اس سے پوچھنے لگی۔ باقی تمام لوگ ہاشٹر کے ادھ بیٹے تھے۔ اسے یہ بلا جہی کی پوچھ بگھ بھند نہ آئی۔ جب میں ان لوگوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتی تو انہیں بھی کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرے ذاتی معاملات میں ان کو انور لیں۔

”اویس کا تھا۔“ اس نے اپنی نامگاری چھاپنے کی کوشش نہ کی تھی اس لئے لہجہ بڑا زوردار اور بدلتیز تھا۔
”تم اسے پسند کرتی ہو؟“ دعا نے آہستہ آہستہ ہونے سے پوچھا تو وہ بڑے ہنسے سے بولی۔

”میرا اس سے جو بھی تعلق ہے۔ جہیں اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پلیز مائنڈ یو اور دن برنس۔“
”تم خواخوہ تاراض ہو رہی ہو۔ میں اسے پہلے سے جانتی ہوں اس لئے اتنا اعتراض نہ کر رہی تھی۔ وہ

ہمارے انڈینوٹ میں ایکسپینشن لیکچر دینے آیا ایک مرتبہ جسے تب سے اسے جانتی ہوں۔ اس کی کزن فائزہ میری کلاس

تھے۔ وہ اویس کے بارے میں باتیں کرتی رہتی ہے۔ بھرا یک مرتبہ سر ملوی کی دی ہوئی اسائنمنٹ کے سلسلے میں کچھ پینٹس لینے کے لیے بھی میں اور فائزہ اس کے آفس گئے تھے۔ فائزہ تار رہی تھی کہ اوپر سے بڑا لایا دیا اور سمر نظر آتا ہے اندر سے ایک نمبر کا قہرٹ ہے، اوپر سے دولت اور دل صورت بھی خدا نے کچھ زیادہ ہی اچھی دے دی ہے اس لئے اسے خوب اچھی طرح کش کرتا ہے۔“ وہ اس کی بات کا بھی کوئی فون لئے بغیر ہاشٹر کرتی رہی تو وہ بھی چپ ہو گئی۔

”ان فائزہ صلیب کو اس نے منڈیکیں لگایا ہوگا اس لئے اس کے ہارے میں الاسید حا پر وہ پگنڈا کرتی بھر رہی ہیں۔“ اسکل جا جاتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کر کے اسے سوچا تھا۔ وہ اتنا ڈیپنٹ ہے اتنا پگڑا اور وہ بھی ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔ اس نے قہمی طور پر یہی سوچا تھا۔

☆☆☆

وہ ان کے گھر پہنچی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اگلے اور اس دنوں ہی لاؤنج میں بیٹھے بی بی دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کے دیکھ کر بڑے بھرپور انداز میں مسکراتا تھا۔
”یہ سورج آج کمر سے نکلا ہے۔ اتنی معروف شخصیت ہمارے گھر آئی ہے۔“ انکل نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

”پوسٹ میں تم تو آئی تھی آپ کی یادداشت کر لیا ہو گیا ہے۔“
”کلی کیوں نہیں آئیں۔“ میں پاک میں بھی انتظار کرتا رہا۔ انہوں نے شکوہ کیا۔

”کلی میں اتنے دنوں کی تسکین اتنا رہی تھی۔“ دوسرے پر بیٹھے ہوئے بولی۔ بی بی پر آئے کرکٹ کچھ کو دیکھ کر اس نے برا سا منہ بنایا۔

”یہ کیا ہورہی ہے دیکھ رہے ہیں آپ؟“

”ارے بڑا بڑا کرکٹ کچھ آ رہا ہے۔ پاکستان اور ساؤتھ افریقہ کا فائنل ہے۔ پاکستان نے بڑا اچھا کارٹ دیا ہے۔ دوسروں کے کارٹ وہ مشکل ہی کر پائیں گے۔ اوپر سے پاکستان کا مضبوط ڈاؤنگل ایک۔“ انکل نے مسکرتے پرنظریں جمائے ہوئے کہا۔

”یہ مصیبت سارا سال ہی پیچھے چلی رہی ہے اور ہماری قوم کو تو کہیں کا نہیں چھوڑا اس کرکٹ فوٹا نے۔“
اس نے اپنی ٹانپنے کی کا داغ اٹھار کیا۔

”تم لڑکیوں کے بوڑھے لیڈر ہو تے ہی پر کرکڑ بگڑ تو می لوگ انہیں آسان نہ چڑھا کر کوئی خلائی مخلوق بنانے میں چین جیش ہوئی ہو۔ میں نے کل ہی پڑھا کہ ایک بھارتی کرکٹرز نے لڑکیوں کی فون کالوں سے سنگ آکر چند ہویں دفعہ اپنا سواہل نمبر اور ایسی ہویں دفعہ کھڑا فون نمبر تبدیل کر دیا ہے۔“ اویس نے مسکرتے پر سے نظریں مٹا کر اسے دیکھا۔

”صرف چند بیرونی اور نیم پڑوسی لڑکیوں کی حرکتوں کی وجہ سے آپ تمام لڑکیوں کو ایسا نہیں کہہ سکتے۔ زیادہ تر لڑکیاں پڑے لکھے اور ڈچین لوگوں کو اپنا آئیڈیل بناتی ہیں۔“ وہ خاصا برامان کر بولی تھی۔

”یعنی میرے جیسوں کو۔“ وہ اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”انگل ان دونوں کی بات چیت سے غلط ہوتے سرکار رہتے۔“

”یو خوش بھی ہے آپ کو اپنے بارے میں۔“ سنجیدی سے بولی۔

”مجھ تمہاری دشمنی میں پڑھا لکھا اور ذہن یکساں نہیں ہے۔“

وہ ہنسنے سے بولا تو وہ اس کے ہنسنے کو خاطر میں لائے بغیر کہنے لگی۔

”انگل جیسا، اس لئے کہ وہ خود کو ذہین پڑھیں کرتے بلکہ وہ ہیں ہی ذہین۔“ اس کی بات پر انگل قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔ ”یعنی میری سببی نے صحیح دل خوش کر دیا۔“ وہ اس کی بات کو خوب الجھائے کر رہے تھے۔ اسی وقت ساتھ ساتھ افریقہ کا اوپر آؤٹ ہو گیا تو انگل اور ادوئس دوبارہ ٹی وی کی جانب توجہ مبذول کر گئے۔ وہ کچھ پور ہو کر پاس رکھا اخبار اٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہ دونوں بڑے اہمناک سے کچھ دیکھ رہے تھے۔ انگل سائیلڈ میں رکے منسل صوفے پر بیٹھے تھے جبکہ وہ اور ادوئس برابر والے صوفے پر بیٹھے تھے۔ اس کے اور ادوئس کے درمیان ڈیڑھ سائیلڈ اخبارات رکھے ہوئے تھے۔ شاید اسے چھٹی والے دن بہت سے اخبارات کا مطالعہ کرنا اچھا لگتا تھا۔ وہ اخبار میں اپنے پسندیدہ صفحے پر موجود مختلف پرنٹس مل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ Preconceive کے Alphabet سے بننے والے دوسرے الفاظ بنانے کی کوشش کرنے لگی۔ بڑی کوششوں کے بعد بھی صرف چند ہر نقطہ ہی بن پائے تو وہ ادوئس سے بولی۔

”Preconceive میں سے بننے والے کو الفاظ بتائیں۔“

”اپنے جنس انگل سے پچھو۔“ وہ اس کی طرف نظر ڈالے بغیر بولا تو وہ بیٹھے ہوئے کہنے لگی۔

”آپ انگل سے جنس پوچھ رہے ہیں؟“ وہ اس کی بات کے جواب میں دانت چبتا ہوا دھیمی آواز

میں بولا۔

”جنس تو میں بعد میں بتاؤں گا۔“ انگل ان دونوں کی سرگوشیاں نہ سمجھنے سے لائق کچھ دیکھنے میں مگن تھے۔

ان دونوں کی کچھ میں اتنی دلچسپی کہ وہ وہاں سے کھڑی ہو گئی اور پہلی کچھ قدمی کرتے ہوئے لیکن تک آئی۔ یہاں آکر خیال آیا پور ہونے سے بہتر ہے کچھ کیا کیا جائے۔ دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنا شاید جلدی کام نشانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید کوکچن سے فارغ کیا اور خود کو پکانے کے بارے میں سوچنے لگی۔ لیکن کڑھائی کے لئے پیاز کاٹتے ہوئے وہ دودھ سے آئس کریم ہار ہی جب ادوئس چھن میں داخل ہوا۔

”کیا ہوا؟“ وہ ایک ہڈی میں جھلا ہو کر اس کی طرف بڑھا تھا۔

”کچھ نہیں ہوا، یاد رکھا رکھ رہی ہوں۔“ وہ شرٹ کی آستین سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

”اسے اسٹوپ کر کے کام کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ چھوڑ داسے۔“ وہ اس کے ہاتھ سے پیاز لے کر کہنے لگا۔

”کیا ہے خود کو کچھ دیکھ رہے ہیں۔ میں اکہلی پور ہو رہی ہوں۔“ وہ نامتو سے بولی۔

”اچھا تم آؤ تو سہی۔ اب پور نہیں ہوئے دوں گا۔ آؤ جنسیں Preconceive سے بہت سے نقطہ

بتاؤں۔“ وہ اسے اصرار سے پھلے کے لئے کہنے لگا۔

”اب میرا مڈ کھانا پکانے کا بہانہ چکا ہے اور اب میں یہاں سے لیکن کڑھائی پکا کر ہی نکلوں گی آپ جانیں۔“

وہ فیصلہ کن انداز میں بولی تو وہ کندھے سے اچکا کر اس کے حال پر چھوڑ دلاؤنچ میں چلا گیا۔ لیکن چڑچڑی تو وہ کل ہی ایک اہلین شیف کی ٹی وی پر کھائی گئی اہلین اسٹائل کی سلا دیا جانے لگی۔ لاؤنچ سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد انگل اور ادوئس کی آواز میں بھی آرسی قہقہہ دوںچ ہر دوں تہرہ کر رہے تھے۔

وہ تمام کاموں سے فارغ ہوئی تو دونوں رہے تھے۔ ان لوگوں کو تو شاید کرکٹ کی جمن میں کھانا، کھانا بھول گیا تھا لیکن خدا سے بڑی سخت ہوگ کر رہی تھی اس لئے جلدی جلدی کھانا، لگا نا شروع کر دیا۔ کھانا لگ گیا تو انہیں بلانے کے لئے آگئی۔ ”کیا کھ رہے ہیں؟ بڑی زبردست خوشبو آ رہی ہے۔“ انگل نے اسے دیکھ کر کہا۔

”آپ کھا کر جاتے ہیں گا۔“ وہاں پر ہوئی ہوش دیکھ کر دونوں کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ وہیں منٹ تک باہر کا نظارہ کرنے کے بعد ان سے بولی۔

”انگل مجھے ہوگ کر رہی ہے۔“ وہ اسے چکارے ہوئے کہنے لگے۔

”شاید ہے کوکھانا کھانے کے لئے۔“ اس کی طرف دیکھتے انہوں نے جواب دیا تو وہ بری طرح چڑ کر آگے بڑھی اور ٹی وی آف کر دیا۔ اس کی اس حرکت پر انگل بیٹھے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ ادوئس پہلے ہی اٹھ کر شاید ہاتھ دھوئے چاچکا تھا۔ ڈانٹ بھیل پر کرسیاں سنہیل کر انگل نے حیرت کا اظہار کیا۔

”اتنی جلدی تم نے اتنی چیزیں جالیں پکائی کڑھائی، سلا دلاؤں بھی نہیں رکھی۔“

”ہی ہاں دیکھ میں کتنی کمزور ویلئے مند ہوں۔“ وہ اپنی تعریف کرنے لگی۔ ادوئس اس سٹائش نامے سے بے نیاز اپنی پلینٹ میں سلا ڈال کر کھانا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے اور انگل نے بھی کھانا شروع کر دیا۔ ادوئس پلینٹ میں چاول ڈالنے لگا تو انگل اسے ٹوکنے ہوئے بولے۔

”سلا دلاؤں بے چاری نے اتنی محنت سے تمہاری وجہ سے جالی ہے۔“ ان کی آنکھوں سے چھانکتی شرارت اسے حسب معمول نروس کرنے کے لئے کافی تھی۔ ادوئس نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور ان سے بولا۔

”شکر ہے کچھ تو میرے لئے بھی ہے۔ ورنہ یہاں تو بہت انگل سے شروع ہو کر انگل ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔“ اس کی بات کے جواب میں ان کا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔

”اچالا کچھ بھلنے کی بوئیں آ رہی آپس آپ سے؟“ انہوں نے اس شخص میں اسے بھی شامل کرنے کی کوشش کی۔ وہ ان دونوں کی نظریں اپنے چہرے پر مرکوز محسوس کر کے کچھ جھنجھلائی۔ ایک تو یہ ان دادا پوتے کی بہت بری عادت ہے کہ دونوں ہی بلا کے ملے چٹ ہیں۔ ”بھلنے کی نہیں بیک ہونے کی آ رہی ہے۔ میں ادوئس میں Brownies بیک ہونے کے لئے رکھ کر آئی ہوں۔“ اس نے اپنے چہرے کے تاثرات کو سمجھ دیا تو وہ کچھ دیر پہلے کی سنی خیر فضا کا تاثر ختم کرنے کی کوشش کی۔ انگل سے اختیار میں چڑے تھے جبکہ ادوئس نے صرف سکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر انگل نے اس سے کافی فرمائش کی۔ کافی اور براؤنیز ٹرسے میں رکھ کر لاؤنچ تو وہ دونوں آپس میں کچھ بات چیت کر رہے تھے۔

براؤنیز پھینکے کے بعد انگل اس سے کہنے لگے۔ ”تم ابھی طرح ہمارے عادی خراب کر دادو۔ پہلے ہی شاید کے

پکائے ہوئے کھانے کچھنا۔“ وہ اسے نہیں کہتے تھے لیکن اب تو براہ راست سے باہر ہو گئے ہیں۔“

ہرزو انداز میں بولی تھی۔ ”آپ بڑے نازک مزاج ہیں۔ میں تو کبھی ہاش میں جھجک کر چارٹیں ہوتی۔“ اپنے لئے نازک حرائی کے طعنے پر وہ ہنس پڑا تھا۔

”میں تو تمہاری وجہ سے کہہ رہا تھا۔ یہی تجھی تمہاری مرضی۔“ وہ گاڑی کا دروازہ دہانیں بند کرتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس کے ساتھ وہ بھی گیٹ سے نکل آیا اور اس کی حیرت سے جواب میں بولا۔

”آخر مجھے ظاہر ہو کر ہے کہ میں نازک مزاج نہیں ہوں۔“ اس کی بات پر وہ ہنس پڑی۔ ہاش میں بیٹھتے ہوئے قدم سے قدم ملائے وہ دونوں خاموشی سے چل رہے تھے۔ پاس سے گزرتے Walls والے کو دیکھ کر وہ بولی۔

”اتنی سردی میں آئس کریم کون کھائے گا۔“

”اسی موسم میں تو آئس کریم کھانے کا عرصہ ہے۔“ اس نے فوراً تردید کی تھی۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”آئس کریم کھاؤ گی؟“ اس کے جواب کا انتظار کے بغیر اس نے Walls والے کو روک کر ایک Cornetto خرید لی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”گھر سے چلے ہوئے والٹ لینا یاد نہیں رہا۔“ آفس میری جیب میں صرف اتنے روپے ہی تھے کہ ایک ہی آئس کریم خریدی جاسکے۔ وہ اس کے غربت بھرے بیان سے حائر ہوئے بولی۔

”میرے پاس ہیں آپ۔ ایک اور لے لیں۔“

”اب میں اتنا کیا کر رہا بھی نہیں ہوں کہ مجھیں تیس روپے کی آئس کریم بھی تمہارے ہی پیسوں سے بھگواؤں۔“ وہ کچھ برہان کر بولا۔ پھر کن اس کے ہاتھ میں پکڑا تا ہوا بولا۔

”تو کھاؤ۔“ اس کے ہاتھ سے کون لے کر وہ ایسے ہی پکڑی رہی تو وہ کھ کر بولا۔

”تم کھاؤ کیں نہیں رہی۔“ کھیل جائے گی۔“ اس نے دہرے اتار کر کون کھانی شروع کی۔ وہ اپنے چہرے پر ہاش کا پانی صاف کرتا ہوا بولا۔

”یہ صرف آپ کے لئے نہیں خریدی ہے۔ اسے ہم دونوں نے شئیر کرنا ہے۔ اتنی دیر سے انتظار کر رہا ہوں کہ اب مجھے دو کی اب دو کی۔“ اس کی بات پر وہ ہنسی ہو کر اس کی شکل دیکھنے کی جگہ وہ اس کے ہاتھ سے کون لے کر آرام سے کھانے لگا۔ دو تین بائس لے کر کون دہانیں اس کے ہاتھ میں پکڑنے لگا تو وہ کچھ جھجک کر بولی۔

”آپ کھائیں میرا تو دیکھیں یہی زیادہ دل نہیں چاہتا تھا۔“ اس کی اس حرکت پر وہ بہت عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ وہ کوئی جواب دے بغیر کوئی اس کی طرف دیکھنے چلے گیا۔ اسے رکتا دیکھ کر وہ بھی رک گئی۔ اس کے مسلسل بڑے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر اس نے خاموشی سے کون پکڑ لی تو وہ دوبارہ چلے گئے۔

”مجھے کوئی چھوٹ کی بیماری نہیں ہے جو میرا جھوٹا کھانے سے آپ کو کبھی لگ جائے۔“ اس کے بہ کھانے پر وہ چڑ کر بولا۔

اس کی ناراضگی سے ڈر کر اس نے ایک بانٹ لے لی۔ تجویزی دیر بعد وہ اس نے خود ہی اس کے ہاتھ سے

”آپ اگر معتدل معاوضہ دینے کا وعدہ کریں تو میں شاید کھانا کھا کر آپ کا یہ مسئلہ حل کر سکتی ہوں۔“ اس نے جواب میں آفر کی۔

”اس مسئلہ کا میں نے ایک اور حل سوچ رکھا ہے جس میں یہ معاوضے وغیرہ بھی ذمہ داری نہیں اٹھانی پڑے گی۔“ انہوں نے تنبیہ کی سے کہا۔ وہ سکن سے بیٹھی بغیر ان کی بات پر کوئی رد عمل ظاہر کرنے کا فیصلہ ہی نہیں اٹھائی اس کے بغیر وہ چہرے پر نظر ڈال کر سرکا دینے۔ وہیں بڑی خاموشی سے کافی کے سب لے رہا تھا۔ اپنا کپ خالی کر کے دھاتے ہوئے بولی ”اچھا میں پلٹی ہوں اگل۔“

”اتنی جلدی ابھی کچھ دیر تو اور رکھو۔“ وہ اصرار کرنے لگے۔

”جلدی کہاں تین بج گئے ہیں۔“ وہ گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”گاڑی لائی ہو؟“ اگل نے اس خیال سے پوچھا کہ وہ آکر پھل بھی آجایا کرتی تھی۔

”نہیں! اتنا اچھا موسم ہو رہا تھا میں داک کرتے ہوئے آئی تھی۔“ وہیں اس کی طرف دیکھا ہوا کھڑا ہو کر بولا۔

”ہاش ہو رہی ہے میں چھوڑ آتا ہوں۔“ وہ بیڑیاں چڑھ کر اوپر شاید گاڑی کی چابی لینے اپنے کمرے میں گیا تھا۔ وہ اس کی آفر کے جواب میں دوبارہ اگل کے برابر نہیں بیٹھ گی۔

”تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کوئی بھی بات مجھ سے نہیں چھپاؤ گی۔“ اگل نے اسے مخاطب کیا تو فوراً بول پڑی۔

”میں نے آپ سے کوئی بات نہیں چھپائی۔“

”اچھا کھاؤ تم کتنے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی۔“ اس کا دل بہت تیز ہونے لگا تھا۔ اگل کے سامنے ایسی کسی بات کا اقرار کرنا اس کے لئے جان جو کون کا کام تھا۔ وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کچھ دھوٹے لیے میں بولے۔

”گرچہ کہ میرے دل کی دیرینہ خواہش تھی مگر تم نے اسے مجھ سے سکرت رکھ کر مراد دل کھایا ہے۔“

”انگل پلیز راض نہ ہوں۔“ وہ انہیں ناراض کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے پریشان حال چہرے پر نظر پڑی تو کچھ نرم پڑتے ہوئے بولے۔

”ادیں اچھا ہے ناں، سب سے اچھا۔“ اور جواب میں اس نے گرن بلا دی تھی۔ اسی وقت وہ وہاں آگیا تھا۔ اگل کو خدا حافظ کہہ کر وہ اس کے ساتھ باہر نکلے تو ہاش کچھ بھی کہی تھی۔ وہ موسم کی خوبصورتی اور صحتی محسوس کرتے ہوئے اس سے بولی۔

”اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے۔ آپ رہتے دیں میں چل ہی چلی جاؤں گی۔“ وہ گاڑی کا لاک کھولا ہوا اس کی طرف بھولا۔

”مختصر مدد و سیر کی ہاش ہے۔ بیمار پڑنے کا زیادہ ہی شوق ہو رہا ہے۔“

”کوئی نہیں میں بیمار ہوتی۔ اس موسم کو انجوائے نہ کرنا اعلیٰ درجے کی بدولتی ہے۔“ وہ اس کی تردید کرتی۔

کون لے لی اور تھوڑی سی کھا کر وہاں اس کے ہاتھ میں پکڑائی تو سر جھکا کر بنا کچھ کھے اس نے کون لے لی۔ سارے راستے یہی کرتا تھا ہوتا رہا۔ اس کے ہاتھ سے کون لے کر تھوڑی سی کھا تا اور پھر اسے پکڑا دیتا۔ وہ مجبوراً سر جھکا کر ایک آدھ بائٹ لے لیتی۔ آج کا موسم الجھائے کر اسے خاصا مہنگا پڑا تھا۔ اس کے گھر کی سڑک پر سڑے تو اللہ اللہ کر کے کون ختم ہوئی اور اس نے دل ہی دل میں شہزاد کہا۔ وہ چپ چاپ سر جھکا کر چل رہی تھی۔ گیٹ کے سامنے رکے تو وہ اس سے بولا۔

”جھجک گم کھاؤ گی؟“ وہ فوراً انکار میں گردن ہلائی۔ کیا چاہے اسے بھی شیز کرنا پڑے۔ وہ اس کے فوراً انکار کرنے پر ہنس پڑا تھا۔ ”نہیں اسے شیز نہیں کرنا۔ وہ پوری کی پوری تمہاری ہے۔“ پھر اس کے جواب کا انکار بغیر لے کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا دانت نکالا تو وہ ساری شرم و حیا بالائے طاق کر رکھ کر چلائی۔

”آپ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔“
وہ سحرماے ہوئے سر ہلائی۔ ”آجندہ میں آپ کی کسی بات کا یقین نہیں کروں گی۔“ وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی وہ کچھ نظر انداز کرتے گیٹ میں سمٹنے لگی تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔
”تمہاری خاطر اتری دو دیک پیدل چل کر بھیجنا ہوا آیا ہوں اور تم۔۔۔۔۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر ناراض لہجے میں بولی۔

”میں انکل سے آپ کی شکایت کروں گی۔“ اس کے بے ساختہ قہقہے نے اپنی محافت کا احساس دلایا تو وہ بغیر کچھ کے گیٹ میں گھس گئی۔

☆☆☆

رات وہ سونے کے لئے لیٹنے لگی جب دھک دے کر اندر چلی آئی۔ دعا کو اسے کمرے میں آدھ دیکھ کر وہ بری طرح حیران ہوئی تھی۔ دعا کے اور اس کے کبھی بھی دوستانہ تعلقات نہیں رہے تھے۔ گو وہ آپس میں لڑی بھی نہیں تھیں مگر ان کے بیچ صرف انجیت اور غیرت کا رشتہ تھا۔

”تم سو تو نہیں رہی تھیں؟“ وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ہاں! اب سوچ رہی تھی کہ سو جاؤں لیکن خیر تم کوئی کام ہے مجھ سے؟“ وہ اپنی حیرت چھپانے کی کوشش کے بغیر بولی۔ دعا بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے دعا کے اس طرح دیکھنے کے انداز پر کچھ کوفت محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنی آنکھیں اس پر مٹاتے پتھیں اس کے چہرے پر موجود کچھ چیز پر لہجہ جاتی تھی۔

”تمہاری ناخوشی میں یقیناً یہ بات ہوئی کہ اوس کا پر پوزل آیا ہے تمہارے لئے۔“ دعا کے اس جملے پر اس کا دل بڑی بے ترہی سے دھڑکنے لگا۔ بے اختیار اس کا سر جھک گیا تھا۔ اسے دعا کے سامنے کی سولہ سڑہ سال کی کمر عمر دو بیڑی کی طرح شرمناک لگنا چھا نہیں لگ رہا تھا لیکن یہ خیر اتنی اچانک تھی کہ وہ اپنے تاثرات چھپا نہیں پاری تھی۔ دعا بڑی بھید کی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”تمہارے تاثرات سے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہیں اس بات کا پہلے سے پتہ نہیں تھا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں! انکل نے مجھ سے اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہا تھا کہ آئے تھے انکل۔“ وہ اپنی عادت کے برخلاف اپنے گھر کے کمرے کے فرش کے ساتھ کھٹکتی کھٹکتے کے موز میں نظر آ رہی تھی۔

”آج آئے تھے شام میں۔ تم اس وقت گھر نہیں تھیں۔ کئی ڈیڑی تو اس پر پوزل پر بہت خوش ہیں۔ جسے صرف ڈنر پر انوائس کرنے کے لئے ڈیڑی اتنے سے تاب تھے اس سے رشتے داری پر تو وہ خوشی سے پاگل ہو رہے ہیں۔“ وہ اپنی خوشی میں گمن دم کے استہزائیہ انداز پر کچھ خاص تو بڑے نہ سکا۔

”بوسے بے ایمان ہیں انکل، کل مجھے ملے تھے اور بتایا میں نہیں کہ آج آنے والے ہیں اگر پتہ دیتے تو میں گھر پر رک جاتی۔“ وہ چہرے پر حیا آلود قسم لے سوچ رہی تھی۔ دعا کچھ دیر خاموشی سے بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

”پتہ نہیں مجھے یہ بات تمہیں بتانی چاہیے یا نہیں لیکن میں تمہیں اس طرح بیوقوف بننا ہوا مزے نہیں دیکھ سکتی۔ تم ہاؤس یا نو آؤ آل تم میری بہن ہو اور کوئی تمہاری اسلٹ کرے یہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔“ دعا کے سنجیدہ لہجے پر وہ پہلی بار چرکی تھی۔ اس کے استہزاء پر انداز پر وہ کچھ افسوس بھرے انداز میں بولی۔

”میں نے تمہیں پہلے ہی بتانا چاہا تھا لیکن یہ میری بات سننا کوارا نہیں کی تھی۔ اب بھی تمہاری مرضی ہے چاہو تو میری بات پر یقین کرو چاہو تو مروت کرو۔ میرے اندر کی بے چینی تو ختم ہو جائے گی کہ میں نے تمہیں اصل حالات سے آگاہ نہیں کیا۔“ وہ اس کے انداز پر اندر ہی اندر کچھ خائف ہوئی ہوئی بولی۔

”تم کیا کہنا چاہتی ہو صاف صاف کہو۔ پھیلیاں بھجوانے کی کوشش مت کرو۔“ دعا کی اس بات پر اس کا غصے کے مارے برا حال ہو گیا۔

”جو بیوقوف بناتے ہیں غالباً وہ گھر پر رش نہیں بھجواتے۔“ وہ بڑے طنز بے انداز میں بولی تھی۔
”اگر تمہیں اسی قسم کی بکواس کر کے مجھے اویس سے بدلہ کرنے کی کوئی بیہودہ کوشش کرنی ہے تو پلیز اپنا وقت براہمدت کرو۔“ اس کی بات پر دعا کرسی پر سے کھڑی ہو گئی۔

”یہ رش اس کی مرضی سے نہیں آیا تمہاری طرف اس کے کرینڈو کار کو بھی یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ آج ان کے آنے کے بعد میں اویس سے ملی اور اس سے بہت لڑائی تھی کہ تمہیں ساری دنیا میں غلط کرنے کے لئے میری ہی بہن کی تھی تو یہ کہنے لگا کہ اسے پر پوزل کر کچھ نہیں ہے تھا اور وہ تو صرف مجھے چلانے کے لئے تم سے اتنی بے تکلفی سے ملتا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں اسے پہلے سے جانتی ہوں۔ جب ہی ہماری انجلی خاصی اظہر رشیدنگ ہو گئی تھی۔ پھر مجھے اس کے بارے میں فائدہ سے کہہ کر دوسرے لوگوں سے اس قسم کی معلومات ملیں کہ وہ قریب ہے تو اس سے دور ہو گئی۔ اس نے مجھ سے ملنے اور بات کرنے کی بہت کوشش کی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ انہیں دنوں میں نے تمہیں اس کے ساتھ فون پر بات کرتے دیکھا تو میں حیران رہ گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ تم میں اتنی دلچسپی کیوں رہا ہے۔ تمہیں گنڈ بھجوانے جا رہے ہیں، تمہیں بارش میں بھیکتے ہوئے یہاں چھوڑ کر جایا جا رہا ہے لیکن میں چپ رہی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ وہ ایسا مجھے مجلس کرنے کے لئے کر رہا ہے۔ آج پر پوزل والی بات پر میں بہت ہی غصے میں اس سے ملی تو وہ پر پوزل کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر کے کہنے لگا کہ

اسے ایک حلاق یا نڈلر کی جیسے اس کے کزن نے چھوڑ دیا ہو سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ اپنے گریڈ فادر کو کورس کرے گا کہ وہ اس پر پھول کو داہیں پس اور برے لئے بات کریں۔ دونوں دادا ہی تم سے اچھا خاصا جھڑا ہو۔ دونوں میں..... خاصی بحث ہوئی ہے اس بات پر۔ یہ پینس اب یہ بھگرا کیا صورت اختیار کرے۔" دعا بڑے پرسکون انداز میں اپنی بات مکمل کر کے اس کی طرف ایک سرسری سی نگاہ ڈالت ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

وہ کچھ کم سی سکتے کی کیفیت میں بھی ہوئی تھی۔ "وہ کبھی بھی میرے بارے میں اس طرح کی بات نہیں کہہ سکتا۔" حلاق یا نڈلر کی جیسے اس کے کزن نے چھوڑ دیا ہو۔" دعا کے منہ سے تم مجھے ان تکلف وہ الفاظ کے بارے میں وہ کبھی بھی ماننے کے لئے تیار نہ تھی کہ ایسی بات وہ کہہ سکتا ہے۔ اس کی آنکھیں کسی بھی بیوقوف نہیں بول سکتیں۔ میں نے ان میں ہمیشہ اپنے لئے عزت اور محبت دیکھی ہے۔ کچھ مذہب ایسے ہوتے ہیں جنہیں کسی انصاف کی ضرورت نہیں ہوتی جو تمہارے کچھ لے جاتے ہیں۔ اگر اس نے مجھ سے براہ راست محبت کا اظہار کیا تو کیا میں بغیر کہے انتہائی نہیں سمجھ سکتی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں اس کے لئے بہت اہم ہوں۔ دعا کی کسی بھی ٹوکاس پر میں ہرگز بھی یقین نہیں کروں گی بلکہ مجھے اس کی اتنی فضول باتوں پر خاموشی اختیار کرنے کے بجائے اس کا داغ ٹھیک کر دینا چاہیے تھا۔ آخر کیا بھوکہ دو مجھے اویس کے بارے میں دیکھان کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ سونے سے پہلے تک وہ اسی قسم کی باتیں سوچتی رہی تھی۔

☆☆☆

دعا کی کسی بھی بات پر یقین نہ کرنے کے عزم کے باوجود اسے ایک جیسے ہی سے جینی لاق تھی۔ سارا دن ایک اضطراب اور مسلسل پریشانی کے عالم میں گزار کر وہ آخر شام میں ان کے گھر چلی آئی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ اپنی پریشانی کا اظہار اویس یا اگلے کے سامنے کسی طرح کرے گی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس گھر کے ٹیکنوں نے اب تک اس کی ہر پریشانی اور دکھ میں اس کا ساتھ دیا ہے اور ان کے سوا وہ دنیا میں کسی پر بھی اعتبار کر سکتی گا ڈی گیٹ سے باہر ہی چھوڑ کر وہ اندر چلی آئی۔ لان میں بیٹھے اویس اور دعا کو دیکھ کر وہ ایک لمحہ کو اپنی جگہ سے ہورہ گئی۔ لان حیرت پر بیٹھے وہ دونوں آہیں میں کچھ بات کر رہے تھے۔ اویس کی اس طرح پریشانی تھی جیکہ دعا کا سن اس طرف تھیں لیکن باتوں میں گمنان اس نے اسے اس طرف آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ جیسے کسی حالت کے زبر اثر جاتی ہوئی اس طرف بڑھ رہی تھی۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی اس کے قدموں کی چاپ نہیں کی تھی۔ دعا بڑے جذبے سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے آپ اسی دن سے اچھے لگتے ہیں جب آپ آئی لی اے میں ہم لوگوں کو بھگڑا دے آئے تھے۔ حالانکہ کتنے ہی لوگ مجھ سے دوستی کرنے اور بات کرنے کے لئے ترستے رہتے ہیں مگر میں ان میں سے کسی کو بھی لٹ نہیں کرتی۔ آپ تو سب سے مختلف ہیں لیکن یہ نہیں کہ یہ جالا جالا سے زمینان کہاں سے آگئی تھی۔" اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے لئے اب کھولتے ہوئے اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو فوراً سر گھما کر پیچھے کی طرف نظر ڈالی۔

چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی اجالا کو دیکھ کر وہ ایک دم سے کھڑا ہوا ہوا ہوا۔

"اجالا! تم۔" آؤ بیٹو، کھڑی کیوں ہو؟" کسی قسم کے احساس عدم شرمندگی کے بغیر وہ اس سے مخاطب تھا۔ اس کے چہرے پر نہ تو ہلکا بہت نظر آ رہی تھی نہ اپنا آپ ظاہر ہو جانے پر وہ نہ ہوا ہوا گھبرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

اسے اپنے یہاں زندہ سلامت کھڑے رہنے پر خود ہرجرت ہو رہی تھی۔ وہ اس کی بات کے جواب میں کچھ بھی کہے بغیر اگلے قدموں پیچھے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ منہ پر ہاتھ کر کے جیسے اپنی پیچ کی آواز کو دہلایا جاتی ہو۔ وہ اس کے چہرے پر موجود تاثرات سے کچھ خائف ہوتا ہو تاغیری سے اس کی طرف بڑھتا وہ پوری رفتار سے بھاگتی ہوئی گیٹ کی طرف جانے لگی۔

"اجالا کو میری بات سنو۔" وہ اسے اختیار اسے پکارتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔ وہ اپنے قاتل میں آئی اس آواز کو اب زندگی میں دوبارہ کسی سننا نہیں جانتی تھی۔ آؤ ایک قاتل سے بہرہ ہے تھے اور وہ اپنی سکیوں کو دہانی اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ وہ چار لپے لپے قدم اٹھاتا وہ اس تک پہنچ گیا تھا اور ایک جھکے سے اس کا رخ اس کی طرف کر کے بولا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"Don't touch me" اس کا ہاتھ نھرت سے جھٹکتے ہوئے دو ٹپے سے بھٹکا رہی تھی۔ دعا بھی اٹھ کر ان دونوں کے پیچھے چلی آئی تھی اور بڑی خاموشی سے الگ تھک کھڑی رہے تا شاد کد رہی تھی۔

"میں تم سے دوستی کروں تم مجھے ایسا بنا دو کہ میں یہی کہا تھا تم نے۔ انہوں میں کبھی بھی تم لوگوں بھی نہیں بن سکتی۔ یہ دنیا میرے جیسے لوگوں کے لئے نہیں بنی۔ یہ تمہارے، خالد، مسعود اور دعا جیسے لوگوں کے لئے ہے۔ میں تو یہاں مس فٹ ہوں۔" وہ آؤ بھاگتے ہوئے چلتی تھی۔

"اجالا تمہیں پینس کی لفظ بھی ہو رہی ہے۔ بلیر آرام سے بیٹھ کر میری بات سنو۔" وہ اس کے ہاتھ تھامتا ہوا بڑی بے بسی سے بولا تھا۔

"کیا سنوں گی مجھے ایک مرتبہ برا استعمال کیا گیا ہے۔ تم نے میرے ساتھ وہی سب کیا جو اوروں نے کیا تھا۔ تم نے بھی مجھے ایک Cat, spaw کہنا۔ کیوں آخر میں میں نے تمہارا کیا کیا کا تھا۔ کیا برا کیا تھا میں نے جس کی مجھے یہ سزا ملی۔" وہ اس کا ہاتھ جٹاتے ہوئے ہسٹیک ہو کر چلائی تھی۔

"اجالا تم مجھے ہرٹ کر رہی ہو۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم میرے جڈوں کا یوں خفاق اڑاؤ۔ میں نے ہمیشہ تم سے محبت کی ہے، تمہاری عزت کی ہے۔" وہ ناراضگی بھرے انداز میں اس سے دیکھتا ہوا بولا تھا۔ اس کی آنکھوں سے جھلکتی ٹھنکی اور ناراضگی کو کوئی اہمیت نہ تھی وہ بغیر وہ اپنے آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کرتے ہوئے غصی تھی۔

"محبت اور وہ بھی اگلے حلاق یا نڈلر کی ہے۔ جسے اس کے کزن نے ٹھکرا دیا ہو۔ جھوٹ ایسا تو بولو جو نہ جائے۔ یہ کہہ کر تم نے میرے ساتھ ظلم کیا تھا۔ میں نے انتظار کیا تھا۔ دعا کچھ پیچھے کے لئے مجھے استعمال کیا تھا۔" "تم میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔ مجھے بولنے کا موقع نہ تھی تم میرے اوپر اسنے دہائیات اہرام لگا رہی ہو۔ اپنے کردار پر کوئی بات چاہے وہ تم ہی کیوں نہ کر رہی ہو میں کبھی بھی برداشت نہیں کروں گا۔" اب کے وہ بھی چلا جاتا تھا۔

"کردار؟ تمہارا کوئی کردار ہے بھی۔" وہ طنز پر انداز میں بولی تھی۔ اوپر اختیار اسے چھڑمانے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھا لے اٹھا لے اس نے خود کو بمشکل روکا تھا۔ وہ اس کے فیض و غضب سے معمور چہرے پر نظر ڈالتے

ہوئے بولتی تھی۔

"مجھے نہیں پتہ تم نے اور دماغ میرے ساتھ کیا گیم کھیلا ہے لیکن بس اتنا ہوا ہے کہ آج کے بعد میں کبھی بھی کسی پر اعتبار نہیں کروں گی۔ بہت مان تھا مجھے خود پر کہ میں انسانوں کو پرکھ سکتی ہوں۔ مجھے سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنی آتی ہے لیکن تم نے اوئیں لودھی آج مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری اپنی ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔ تم تو میری محبت کیا نفرت کے قائل بھی نہیں ہو۔" وہ لب بچھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی تمام بات کے جواب میں وہ کچھ بھی نہیں بولا تھا۔ بس ایک تک اس کی طرف دیکھا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے کہ غصہ تک تاثرات کی جگہ دکھ اور صدمے سے لے لی تھی۔ وہ بڑی مایوسی اور افسردگی سے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک نظر اس پر اور ایک دماغ پر ڈال کر گیت سے باہر نکل گئی تھی۔ اوئیں نے اسے روکنے یا اس کے پیچھے جانے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ وہ ویسے ہی چپ چاپ کھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ پتہ نہیں کس طرح گاڑی ڈرائیو کرے ہوئے گھر پہنچی تھی۔ اسے اپنے اعصاب کی اس منہ بولی پر حیرت ہو رہی تھی۔ اپنا آپ بڑا ایک اور بے وقت محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے کمرے میں بند ہو چکا ایک بلک بلک پر آسو بہا رہی تھی۔ کیا وہ اتنی اڑاں تھی کہ اتنی آسانی سے کسی کے ہاتھوں سے خوف بختی رہی وہ اس کے ساتھ کھیلا رہا اور وہ اپنے تئیں خود کو بہت کچھ اور اور دانا سمجھتے ہوئے اس کے ہاتھوں اپنی اسلٹ کردیتی رہی۔ اور اس وقت وہ میری خوش خیالیوں پر دل ہی دل میں کتنا محظوظ ہوتا ہوا گیا۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو کبھی کسی نہیں سمجھتے ہیں۔ ہر بار شوگر کھا کر ذہنی ہوتے ہیں چیتے چلاتے ہیں اور پھر دوبارہ شوگر کھانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کیوں انھیں بند کر کے میں اس کا یقین کرتی رہی۔ کیوں میں نے خود کو یوں گرایا۔ آخر کیوں کیوں میں یہ بات بھول گئی کہ میں اور میری تقدیر کبھی نہیں بدل سکتی۔ زندگی تو پہلے ہی بدل نہیں تھی لیکن اب بھی مشکل یہی نہیں تھی اسے میں نے خود اپنے ہاتھوں اتنا مشکل اور ناقابل قبول کیوں بنالیا۔" وہ ستر پر اوندھی بڑی سسک رہی تھی۔

"تم بہت بے رحم ہو گئی ہو۔" اسے اپنے پاس ایک سرگوشی سنائی دی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"لوہر سے بڑا سوہرا اور لیا دیا نظر آتا ہے۔ اندر سے ایک نمبر کا فطرت ہے۔" ایک اور آواز سنائی دی تھی۔

"تم اپنے صبر سے تمام دکھ سہجی ہو اور اب زندگی تم پر مہربان ہونے والی ہے۔" ایک مہربان آواز نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ پھر اچانک ایک اور بازداشت سنائی دی تھی۔

"کیا ہم اچھے دوست نہیں بن سکتے۔ کہیں تمھیں تکلیف دے یا ستائے تو تم اس کا منہ توڑ دو۔ مجھ سے دوستی کر کے دیکھو میں تمھیں بالکل ایسا جیسا جاناؤں گا۔"

"تمہاری طرح اس کے گریڈ فادر کو بھی یہ غلطی ہو گئی تھی کہ وہ تمھیں پسند کرتا ہے۔ وہ تو صرف مجھے جاننے کے لئے تم سے اتنی بے تکلفی سے ملتا تھا۔" وہ کالوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر آنوازوں سے چپ چاپ چھڑا لیتا جانتی تھی لیکن یہ آواز نہیں کی آجیب کی طرح اس کی طرف بھاڑ رہی تھی۔

"شکر ہے کچھ تو میرے لئے بھی ہو اور نہ یہاں تو ہر بات اگلے سے شروع ہو کر اگلے ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔"

"اوئیں اچھا ہے ماس سب سے اچھا۔"

"اسے ایک حلاق یا پانڈی لڑکی جسے اس کے کزن نے چھوڑ دیا ہو سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"خدا کے لئے میرا اچھا چھوڑ دو" وہ چلائی تھی اور پھر دوبارہ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

☆☆☆

وہ پوری رات اور اگلا پورا دن اپنے کمرے میں بند رہی تھی۔ ملازمہ آکر تاک کر کے کھانے کے لئے بلانے لگی تھی مگر وہ کوئی جواب نہ دینے دے ہی پڑی تھی۔ شام میں بھی اس کے بیڈ روم میں آئی تھیں۔ ان کے آواز دینے پر اس نے اٹھ کر کمرے کا لاکھ کھولا تھا۔

"کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو فیک ہے۔ اسکول میں بھی تنگیں اور کھانے کے لئے بھی نہیں آئیں۔" وہ اس کے سوتے ہوئے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولیں۔

"جی کچھ بھلا تھا اس لئے۔" وہ سر جھکا کر جواب دیتی دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گئی تو وہ بھی اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھے ہوئے بولیں۔

"کوئی دوا لی۔" وہ اپنے لئے ان کی تشویش پر تعجب سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں فیک ہوں آپ گھر مت کریں۔"

"کچھ فکر نہ کرو تم اتنی چپ اور سب سے الگ تھک جوتی ہو۔ پتا کھر والوں کے ساتھ مکمل مل کر اور ایک ساتھ رہا کرو۔" وہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی تھیں۔ اس کے چہرے پر سوچو تاثرات سے نظریں چراتے ہوئے وہ کچھ نرم دلی سے بولیں۔

"مجھے پتہ ہے تم مجھ سے ناراض ہو۔ تم کبھی ہو میں نے جان بوجھ کر تمہارا خالد سے نکاح کر دیا تھا۔ بیوی سوئٹ ہاٹ میں تمہاری ماں ہوں میں نے کبھی کسی تمہارا نہیں چاہا۔ جو کچھ ہوا میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔ کیا میں نے تمھیں اپنی لکھ سے نہیں جنم دیا۔ مجھے تم بھی اتنی ہی عزیز ہو جتنے تمہارے باقی بہن بھائی۔ ہاں! میں تمھیں کبھی زیادہ توجہ نہ دے سکی۔ یہ بات میں مافی ہوں لیکن تم مجھ سے بہت پیار ہے تم تو میری بہت پیاری بیٹی ہو۔" وہ اس کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے بولی تھیں۔

بعض لمحوں میں زندگی میں اس وقت بھی تھی جب ہمیں ان کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ کبھی اتنی ہی چاہت ظاہر کریں کہ ان کی چاہت اس آٹھ سال کی معصومی کو دوا بن لاسکتی ہے جو ان کی ایک نگاہ اذیت کے لئے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار رہا کرتی تھی۔ کچھ خوشیاں جب اپنے وقت پر نہیں ملتی تو پھر بعد میں وہ میں نہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

وہ سات چہرے کے ساتھ ان کا دلہانہ انداز دیکھ رہی تھی جبکہ بڑی خوشوار سکرماٹ چہرے پر لاتے ہوئے کھد رہی تھیں۔

"تمہارے لئے اوئیں لودھی کا پر پڈل آیا ہے۔ جیسا صاحب خود بخش نفس یہاں آئے اور بڑی چاہت سے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ وہ خالد تم کو بھی تمہارے لائق نہ تھا۔ میری بیٹی کا جوڑ تو اوئیں جیسے پیڑم اور

کوالینا بیٹھ کر ساتھ چٹا ہے۔ تمہارے ڈیڑی چاہے کسی بھی وجہ سے اس رشتے کے حامی ہوں لیکن میں صرف تمہاری ماں ہونے کے باطنے اس رشتے پر خوش ہوں۔ میری بیٹی کسی بھی وجہ سے اس قدر دان لوگ ملیں جس میری خوشی صرف جکی ہے۔ مجھے یہ ہے تم بہت حساس ہو اور بشر لودھی کا گھر ان تمہارے شایان شان ہے۔ وہ لوگ جہیں بہت خوش رکھیں گے۔" وہ ان کے کندھے پر سے اپنا سر اٹھاتے ہوئے بڑے غم سے بولے۔

"میں اس رشتے سے انکار کر دیتا ہوں۔ میں اویس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ اس کی بات پر حیرت سے منگ رہی تھی۔

"بلیز می ابھی ابھی آپ نے کہا تھا کہ آپ میری ماں ہونے کے باطنے اس رشتے پر خوش ہیں اور اگر میں اس رشتے سے انکار کر دیتی ہوں وہاں میری مرضی اور خوشی نہیں ہے تو ایک ماں ہونے کے باطنے آپ کو میری بات ماننی چاہئے۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولی تھی۔

"لیکن اجالا اویس بہت اچھا ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ تم بھی وہاں انضمام ہو۔" می نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ان کی بات کا ٹکڑا کر فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"میں آپ سے زندگی میں پہلی بار کبھی رنج رہی ہوں۔ بلیز مجھے مجبور مت کریں۔" وہ اس کے انداز پر چپ ہو گئی تھیں۔ پھر کئی ہی دہائیوں کے بعد اسے اس رشتے کی اچھائیاں کھائی تھیں لیکن وہ اپنے فیصلے میں اٹل تھیں۔ آخر کاری بار بار مانتے ہوئے بھی تھیں۔

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔ مجھے تمہاری خوشی پر ہر چیز سے زیادہ مقدم ہے۔ تم خوش رہو میں بس صرف یہی چاہتی ہوں۔" وہ اس کے ماتھے کو چومتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

☆☆☆

اس نے اس بات کو جانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہاں انکار کھلا دیا گیا ہے یا نہیں۔ وہ اپنے آپ میں الجھی ہوئی سارا سامان کرے میں گزار دی تھی۔ می کے بلانے پر گھر والوں کے ساتھ کھانا کھانے کے علاوہ اس کا تمام وقت کمرے میں گزارتا تھا۔ اسکول سے لوٹنے کے بعد اسے اس کے گھر میں ساری دینا سے لے کر وہ اس کی ہوتی تھی۔ وہ اپنے اس سے اس دن کے حوالے سے کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور وہ خود بھی اس کے گھر سے کسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اس کے انکار کے چوتھا دن تھا۔ جب وہ اپنے گھر سے نکلا تو اس کے ہاتھ میں چکڑا کر تھا "آپ کا فون ہے۔" اور وہ ان دنوں کسی سے کسی کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بغیر ہاتھ کے لائن ڈس کنکٹ کر دی تھی۔ پھر اس دن دوسرے دن اور اگلے تین چار مہینے سے پیغام کا ٹکڑا اٹھل کا فون ہے۔ لیکن اس نے بے مروتی اور بدتمیزی کی حد کرتے ہوئے ان سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

"مجھے صاف کر دیں اگلے لیکن میں آپ سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔" وہ بعد میں روتے ہوئے اپنے آپ سے بولی تھی۔ اگلے روز وہ پھر بھی اسے اسے کمرے میں اس کے اطلاع دی کہ اگلے دن اسے ملنے آئے ہیں۔ وہ اپنے گھر میں ان سے ملنے سے انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے فوراً ہی اٹھ کر دروازے پر دم مٹا آئی۔ سامنے ہی صوفے پر بیٹھے ہوئے اگلے کو دیکھ کر اس کا بے ساختہ دل چاہا کہ ان کے گھر آجائے اور غریب سارا روٹنے کے

بعد ان سے اویس کی دعا کی اور یہ نہیں کہ کسی کی شکایتیں کریں۔ لیکن اپنے دل کی اس خواہش کو نظر انداز کرتی وہ انہیں سلام کرتے ہوئے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیسی ہے میری بیٹی؟" وہ خود ہی اٹھ کر اس کے برابر میں آکر بیٹھ گئے اور بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں اگل۔" وہ آنسوؤں پر بند باندھی مضبوط لہجے میں بولی۔

"تمہاری بیٹی کے بغیر میں ٹھیک کیسے ہو سکتا ہوں۔ تم تو میرے لئے آنکھیں کی طرح اہم ہو۔" وہ اس کا چہرہ اپنے جھپٹوں سے ڈھکیا تھا۔ وہ اس کی طرح اداس ہے۔ میری جان اگل سے اس بات کی ناراضگی ہے۔ وہ اس کا چہرہ اپنے جھپٹوں سے ڈھکتے ہوئے جھپٹوں سے چھوڑ دیتے ہوئے بولے تھے۔ وہ اس کے گھر پر زور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اس کی بہت سے بچے بچے کے گھر پر زور کر رہی تھی اور وہ ان کی طرف دیکھتے تھے۔ خود کو سنبھالتے ہوئے وہ سر جھکا کر بولی۔

"میری آپ سے کوئی ناراضگی نہیں ہے اگل۔"

"گھر کی بات ہے چچا دیکھو جو کئی بات ہے کہ وہ۔ بات کرنے سے اپنے دل کا حال کھد دینے سے انسان بہت سے مصائب سے بچتا ہے۔ تمہارے اور اویس کے درمیان جو کئی سس انڈر شیڈنگ ہوئی ہے مجھے بتاؤ۔ اگر اس کی غلطی ہوئی تو میں اسے چھوڑ دوں گا لیکن مجھے بتاؤ تو کسی۔" وہ بڑی بے چارگی سے بولے تھے۔

"کوئی سس انڈر شیڈنگ نہیں ہے اگل۔ آپ بلیز اس کا ٹکڑا کچھ چھینیں۔ مجھے آپ کی بہت پر کوئی شک نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں آپ مجھے بہت چاہتے ہیں لیکن بلیز اس بات کو سنبھال دیں۔ وہ کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ "آپ کا بہت شکر ہے آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میرے لئے اپنے ہوتے کا رشتہ لائے۔ لیکن اسے میری بھی لڑکی سوٹ نہیں کرتی۔ آپ اس کے لئے دعا کیا یا اس سے ملتی جلتی کسی لڑکی کا انتخاب کریں۔" وہ بڑے سکون سے اپنی بات مکمل کر کے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر گہری نگاہ ڈالنے سے گھر سے نکلے ہوئے۔

"اس وقت تم ڈیڑھ بیٹھ کر رہی ہو۔ میں بعد میں آؤں گا۔ پھر تم سے بہت ساری باتیں کروں گا۔" وہ اس کی طرف بخود دیکھتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئے تو وہ بھی ان کے پیچھے جاتی انہیں تک چھوڑنے آئی تھی۔

"اجالا میں اور اویس تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اس بات پر ہمیشہ یقین رکھنا۔" وہ گیت سے نکلے ہوئے اس سے بولے تھے اور وہ خاموش کھڑی انہیں جاتا دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

وہ بڑے غم سے اگل کے گھر میں داخل ہوئے تو لاؤنج میں بیٹھے اویس کو دیکھ کر کہنے لگے۔

"خیریت آج جلدی آگئے؟"

"جی کیسے؟ آج جلدی آگیا۔" وہ ان کی طرف بڑے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

"کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے جہیں اس سوال کا جواب معلوم ہے اسی سے یہاں چھ کر میرا انتقاد کر رہے تھے۔ یقیناً اخلاق نے جہیں بتا دیا ہو گا کہ میں اجالا سے ملنے گیا تھا۔" وہ بڑے سکون سے جواب دیتے ہوئے اس کے سامنے

والے سونے پر بیٹھ گئے۔

"آپ دہاں کیسے گئے تھے؟" وہ ٹنگی بھرے انداز میں بولا۔

"کیا مجھے نہیں جانا چاہئے تھا؟" وہ اس کے سوال کے جواب میں سوال کرنے لگے تھے۔ "بزرگ نہیں جانا چاہئے تھا۔ وہ خود کو بھیجنا پسند کیا ہے کہ آپ اس کی تیش کرنے اس کے مہنگے پھر رہے ہیں۔" وہ اپنا غصہ کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا تھا۔

"اوکس وہ نادان ہے تو کیا ہم بھی جذباتی ہو کر جھوٹا فائدہ کر سکتے شروع کر دیں۔" جنہیں اس سے محبت کا دعویٰ ہے تو اس کی ٹینکس کو کھینچنے کی کوشش بھی کر رہا۔ جس طرح کے حالات کا شکار رہی ہے تو ایسے میں اسے اسی طرح ہی ایک کرنا چاہئے۔ اس نے بیٹھ لوگوں کی دھوکا دہی، جھوٹ اور منافقت دیکھی ہے اسی لئے اس کا رشتوں پر سے محبتیں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ ہمیں اس کا اعتبار بحال کرنا ہے۔ مجھ سے بہتر تو یہ کام کر سکتے ہو۔ جنہیں چاہئے کہ اس سے طوعا یا سفیحا دلہاؤ کر تم اس کے ساتھ قلعے میں اس کا ٹھکانا ہوا اور اس اعتبار سے اوکس بولا۔" وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے تو اپنی اپنی تسکین چھپانے لگا۔

"سودی پاپا جانی میں! اپنی تیشیں کر سکتا۔" میں نے ساری زندگی کسی کسی کے سامنے مضامین دی ہیں نہ اب دوں گا۔ اگر میں درست ہوں تو ہوں مجھے کسی کے سامنے اپنی پوزیشن کمزور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرا دل میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا تو میں اس کے پیچھے کیوں جاؤں۔ اس نے مجھے کلیا ترین الفاظ کی فہرست میں بڑے آرام سے شامل کر دیا بغیر مجھ کے وضاحت چاہے۔ اب چاہئے دھار کے ادھر ہو جائے میں اس سے نہیں ملوں گا۔ مجھے محبت سے زیادہ اپنی عزت اور انعام ہے۔ اور آج کے بعد اگر کبھی بھی اس سے ایسے کسی سلسلے میں ملے تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔ وہ ایک Suspicious لڑکی ہے اور اس کی اس بیماری کا علاج دینا کسی کی حکیم کے پاس نہیں ہے۔ اس نے میری اسلٹ کی ہے اور میں اسے کبھی بھی معاف نہیں کر سکتا۔ "I will never forgive her" اور اپنی بات ختم کر کے لاؤنج سے چلا گیا تھا اور وہ اپنا سر دووں ہاتھوں میں تھا سے بڑی سے کسی سے پیچھے کچھ سوچ رہے تھے۔

ان کے اچالا سے ملنے جانے پر اس کا موڈ اتنی ہی طرح آف ہوا تھا کہ وہ دوبارہ آفس جانے کا ارادہ ترک کر کے جوتوں سمیت ہی بستر پر لیٹ گیا تھا۔

"تم کوئی دنیا کی آخری اچھی لڑکی تو نہیں ہو جو میں تمہارے لئے جوگ لوں گا۔ اس دنیا میں تم سے کہیں بہتر اور اچھی لڑکیاں بھی موجود ہیں۔" وہ بے غصے سے سوچ رہا تھا۔ "مگر وہ اندازہ شہریا تو نہیں ہوں گی۔" کوئی اس کے اندر سے بولا تھا۔ "کتنی ہی طرح تم نے مجھے Let down کیا ہے۔" وہ اپنے اندر سے ابھرنی کی آواز کو نظر انداز کر کے خود سے بولا تھا۔ "میں تمہارے لئے کیا کیا سوچتا تھا اور تم نے مجھ سے محبت تو کر لی مگر میرا اعتبار نہیں کیا۔ اور انکی محبت جس میں ایک دوسرے پر بھروسہ اور یقین نہ ہو میرے نزدیک بیکار ترین ہے۔ تمہارے خلاف اگر ساری دنیا بھی اٹھ اٹھ کر میرے سامنے اٹھ کر بیٹھتی ہوئی اور تمہارے خلاف گواہی دیتی۔" میں جب بھی کسی بات کا یقین نہ کرتا کیونکہ مجھے تم پر اعتبار تھا۔ کتنے آرام سے تم نے وہ بدترین الفاظ اپنی زبان سے استعمال کئے تھے بغیر یہ سوچے کہ یہ

الفاظ سمجھنا کتنا دکھ دے رہے ہیں۔ کیا جو زبان سے بڑے بڑے دعوے کرے صرف وہی سچا ہوتا ہے جو اپنے منہ سے کہنے کے میں تمہارے لئے جان دوں گا کہ میں اس کے پاس جاؤں گا؟ آپ جہاں دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ میں تمہارے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ جنہیں خوش دیکھنے کے لئے تمہارے آرام اور سکون کی خاطر میں اپنی جان کی پروا کے بغیر کچھ بھی کر سکتا تھا لیکن تم نے مجھ پر بھروسہ نہ کیا۔ تمہارے نزدیک وہ تمہارے آزمائے ہوئے بدترین رشتے دار مجھ سے زیادہ معتبر ٹھہرے اور میں مستحب قرار پایا۔

اور وہ پاپا جانی کیسے ہیں کہ میں تمہارے پاس جا کر اپنی صفائیاں چیش کروں۔ نیند ایسا کبھی بھی نہیں ہو گا۔ تمہارے خلاف راپنوں پر مجھ سے اتنی سیدھی کھواس کرتی ہے کہ میرے بھائی نے اسے اس کی بعض بری باتوں کی وجہ سے چھوڑ دیا تو میں اسے جھڑک کر اور اسے نہ دیکھنے کا کہہ کر ریسورسج دیا جتا ہوں۔ اور تمہارے اوپر افسوس کرتا ہوں کہ تم اتنے تھکناؤ کوں کے بچ رہی ہو۔ جس روز یہاں سے پروڈیال گیا تھا میں رات دیر سے فون کی تھا اور میں نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اسے بڑے لوگوں کے درمیان سے ہمیں جلد سے جلد نکال لاؤں۔ وہ جہنم تمہارے رہنے کی جگہ تو نہیں۔ پھر دعا سامنے آتی ہے۔ دعا شہر یا جسے میں ایک دوڑے سال سے جانتا ہوں۔ MBA کی سٹوڈنٹ کو بکچر دینے کی بات دہیوں وہ کسی بجلی کی طرح میرے پیچھے پڑ گئی۔ ایک دوسرے فائدہ کے ساتھ اپنے کسی اسائنمنٹ کے سلسلے میں دو لینے میرے آفس آئی تو میں نے فائدہ کی محرومت میں خوش اخلاقی سے بات کر لی۔ مگر وہ مختصر کسی طرح پیچھا چھوڑے پر آمادہ ہو نہ سکیں۔ اس کے بعد فائدہ کے بغیر ہی اپنی پڑھائی کا کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے آفس آئی تو میں نے اسے انکار کرنا شروع کر دیا۔ ساری کرنسی ایک طرف رکھ کر میں نے بد اخلاقی ظاہر کی تو اس نے میرا پیچھا چھوڑا۔

پھر اس روز پاپا جانی کی برتھ ڈے پر جنہیں چھوڑنے گیا تو میں نے کمری دعا کو دیکھ کر مجھے پتہ چلا کہ وہ تمہاری بہن ہے۔ اور میں کتنا حیران ہوں ہوا تھا کہ کہاں تم شرقی روایات کی آئینہ دار شہرانی ہوئی ہی لڑکی اور کہاں وہ بے تحاشا مالدار ڈاؤن اسٹینڈنگ دعا۔ اس سے اگلے ہی دن وہ میرے آفس چلی آئی اور تمہارے خلاف وہی خالہ کا قصہ سنانے کے لئے بیٹھی گئی تو میں نے اس کی بہت اسلٹ کی اور اسے اپنے آفس سے بہت بری طرح ڈانٹ نکال دیا۔ اس واقعے کے بعد وہ دوبارہ میرے پاس نہیں آئی میں نے تم سے بھی ایسی کسی بات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ میں جنہیں بہت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس روز جب تم مجھ سے لڑ جھڑک کر میں دعا تمہارے آنے سے چند منٹ پہلے ہی آئی تھی اور یہ اتفاق ہی تھا کہ میں وہاں لان میں بیٹھا ہوا تھا سے دیکھ کر میرا منہ تن گیا تھا کہیں وہ میرے صدمہ بنانے کی پروا کے بغیر میرے سامنے کسی ٹھیکٹ کر بیٹھ گئی تو میں نے بھی سوچا کہ آج اس کا داغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے درست کر دینا چاہئے تاکہ یہ میرا چھوڑا دے۔ اس نے بات کرنا شروع ہی کی تھی کہ میں دہاں آگئیں اور تم نے اس ساری چوچیں کے بہت ہی غلط قسمی لگائے۔ میں نے تمہارے خلاف کسی کی بات کا کوئی یقین نہیں کیا۔ تو جواب میں مجھے اپنے لئے بھی ایسی ہی عزت چاہئے تھی۔

تم نے میرے ساتھ بہت برا کیا ہے اجالا بہت برا۔ میں تمہارے راستوں کے چھڑ رہا تھا۔ تمہاری

راہوں کے عارضیت رہا تھا۔ تم تک پہنچنے کے لئے میں نے درست راستہ کا انتخاب کیا تھا۔ تم جس کی میں نے بیشک عزت کی۔ اپنے گھر میں آنے والے ایک مہمان اور باپا جانی کو مزید ہونے کے ناٹے۔ مگر اس روز جب تم میرے چنے پر سرگرد کہ رقص نہیں مجھے ایک دم کیا ہوا تھا۔ میں اس ایک لمحہ میں مکمل طور پر بدل گیا تھا۔ اپنی اس کیفیت پر میں خود کی تحران رہ گیا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ ان تمام لوگوں کو سرعام چھائی دلوں جنہوں نے تمہیں دکھائے۔ میں اس نے وقت بھی سوچا تھا کہ میں تمہیں اپنی خیریاں دوں گا کہ تم کو شہ تمام غموں اور بد صورت یادوں کو بھول جاؤ گی۔ کوئی خالد جہار اصیب کیسے ہو سکتا تھا۔ تمہیں تو خدا نے میرے لئے بنایا تھا۔

میرا دل چاہتا تھا کہ تمہیں تباؤں کی قسم کتنی خصوصیت ہو سب سے منفرد تمہارا احتیاط اور شرمناک ہوا انداز تمہیں سب سے الگ کرتا ہے۔ تم لوگوں کے درویش سے ملاپ ہو کر اپنے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہو گئی تھیں۔ میں تمہیں بتا چاہتا تھا کہ تمہیں کسی نے رنجشک نہیں کیا بلکہ تمہیں میرے لئے مجھ سے ملنے کے لئے شاید ان تمام حالات سے گزرنا پڑا۔ شاید میں کچھ دے رہا تھا۔ مگر فوس میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتا سکا۔ یہ بھی نہیں کہ تم اس روز باپا جانی کے ہتھوڑے پر بہت حسین لگ رہی تھیں ان کی میرا دل چاہ رہا تھا کہ بس تمہیں ہی دیکھتا رہوں اور یہ بھی تمہیں بتا سکا تھا کہ سب سے اچھے کتنے حسین ہیں۔ تمہاری مسکراہٹ کتنی دل فریب ہے۔ میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتا سکا۔ وہ تمام باتیں جو میں نے سوچیں ہوئی تھیں کہ ہماری شادی کے دن تم سے کروں گا شاید اب بھی نہ کہہ سکوں اس لئے کہ ایسا کوئی دن ہماری زندگی میں آنے والا ہی نہیں ہے۔ تمہاری بے اعتباری مجھے بہت دکھ دے رہی ہے۔ تم ایک بار مجھے موقع تو دیتی۔ رک کر میری بات سن لیتیں۔ کیوں اجالا تم نے میرے ساتھ ایسا کیا؟ اس تھا میرے لئے First String بنا چاہتا تھا لیکن تم نے مجھے اسان سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ وہ سارا مجھ سے زیادہ قابل اعتبار قرار پائے۔ وہ اپنے ہنسر پر لینا بڑے دکھ سے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ نماز پڑھ کر اٹھی جب حیدر نے اسے اخلاق کے فون کی بات بتایا۔ بات کرنے سے انکار کرنے کے وہ اچانک ہی رک گئی تھی۔ آخر ایسی کیا بات ہو گئی کہ اخلاق نے فون کیا ہے۔ وہ سوچتے ہوئے گاڑیس اس کے ہاتھ سے لے کر بات کرنے کے لئے آباد ہو گئی۔ دوسری طرف اخلاق کی روٹی آواز سن کر اس کے کوسمان خطا ہو گئے تھے۔ وہ روئے ہوئے اگل کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع دے رہا تھا۔

”میں کسے نہیں کھانا لے کر گیا تو وہ کارپٹ پر بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ طبیعت تو ان کی دو جین روز سے خراب چل رہی تھی۔ میری تو فوراً کچھ نہیں آیا کہ کیا کروں۔ پھر اوں بھائی کو فون کیا اور وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی صاحب کا ہاسٹل لے کر گئے ہیں۔“ وہ ان کی طبیعت کا سن کر خود ایسی بری طرح پریشان ہو گئی کہ ڈھک سے اسے تسلی بھی نہیں دے سکی۔ اس سے ہاسٹل کا نام پر چھو کر جس محلے میں جی ایس می گاڑی کی چابی اٹھا کر پھر کی طرف آئی تھی۔ گاڑی اچھٹی تھوڑی عمارت سے دوڑا ہے وہ وہ ان کی صحت اور وطن مری کے لئے دعا میں کرتی ہوئی ہاسٹل کے اماطے میں داخل ہوئی تھی۔ ایک ایک قدم کی سن دہنی معلوم ہوتا تھا۔

”اگل آپ کو زندہ رہتا ہے میرے لئے بیڑہ خیر کیلانت کیجئے گا۔“ وہ دل میں دل میں ان سے مخاطب

جواس ہاتھ دینشیں تک پہنچ گئی تھی۔ اسی ہاسٹل میں وہ ایک مرتبہ پہلے ہی اس سے ملنے آئی تھی۔ مگر تب میں ادراپ میں بہت فرق تھا۔ کچھ ہی دیر میں ایک کمرے کے باہر کھڑی خود کو اندر جانے کا حوصلہ دے رہی تھی۔ دروازے پر پہنچنے سے دھک دے کر وہ اندر داخل ہوئی تو ڈاکٹر ثروت حسین بخاری سے باتیں کرتے ہوئے اوہیں نے گردن سوز کر اسے دیکھا تھا۔ اس پر نظر پڑے ہی اس نے اپنا رخ دوبارہ ڈاکٹر بخاری کی طرف کر لیا تھا۔ اس کی سر درد سہاٹ لگا ہوں سے اندر ہی اندر خائف ہوئی وہ اگل کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ وہ انھیں سونے کے کمرے کی گھڑی نیند سے ہونے لگے۔ ڈاکٹر بخاری نے نواد کو بڑی گھڑی لگا ہوں سے دیکھا تھا اور پھر دوبارہ اوہیں سے مخاطب ہو گئے تھے۔

”گھڑی کوئی بات نہیں ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ بس یہ ہے کہ ان کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک تھوڑا کر گیا تھا اور پھر سب سے بڑی بات پریشان کنجی تھی۔ اس رات میں انسان کے نروس بہت کمزور ہو جاتے ہیں جسے ایسا لگتا ہے ان دنوں وہ کسی پریشانی میں مبتلا تھے۔ تمہیں ان کے خلاف مزاج کچھ بھی نہیں کرنا چاہئے۔ ہارٹ پیسٹ کے نروس کے لئے کسی بھی قسم کا Stress نقصان دہ ہوتا ہے۔ کوشش کرو کہ وہ خوش رہیں۔ ان کی مرضی اور خواہشات کے مطابق ہر چیز ہو۔“ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بہت خامسا انداز میں اس سے بات کر رہے تھے۔ وہ بھی چند لمحوں کے فاصلے پر کھڑی ان کی بات بڑے غور سے سن رہی تھی۔

وہ خود ان کی پریشانی کا سب سے بڑا سبب یہ بات اسے بری طرح نام کر رہی تھی۔ انہوں نے بیشک مجھ سے چار کیا میرا خیال رکھا اور میں نے جواب میں انہیں ڈاکٹر بخاری اور بخاری دی۔ دوسرے جگہ سے سوچ رہی تھی، ڈاکٹر بخاری اوہیں کو تسلی دے کر باہر جا گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد وہ اس کی طرف نگاہ ڈالے بغیر اگل کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اور پاس رکھی کر ہی پرینتہ کرنا چاہ رہا تھا۔ اچالانے ایک چورنگا اس کے چہرے پر ڈالی تھی تو وہ بہت پریشان اور الجھا ہوا نظر آیا۔ کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد وہ سامنے رکھ سونے پر بیٹھ گئی۔ اس نے ناس کے کھڑے رہنے کا کوئی ٹوش لیا تھا اور نہ ہی بیٹھنے کا۔

اس کا اسٹائل ایسا تھا جسے اس وقت یہاں صرف وہ اور باپا جانی ہی موجود ہیں۔ کسی تیسرے فرد کی موجودگی سے اسے کوئی بچھی نہیں تھی۔ ایک مختصری طرح ٹوڑ گیا تھا۔ وہ دونوں ہی سادہ سادہ اگل پر نظر میں جمائے بیٹھے رہے تھے۔ ان کے جسم میں ڈاکٹر کی حرکت محسوس ہوئی اور انھوں نے پوچھنے کے لئے ہوئے گئے تو وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آگئی اوہیں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھا کہ انہیں آواز دی تھی۔

”باپا جانی آپ کیسے ہیں؟“ انہوں نے ہشکل انھیں کھول کر اسے دیکھا اور بڑی پست آواز میں جواب دیا۔ ”خوب ہیں۔“ ایسا لگ رہا تھا کہ بولنے کے لئے انہیں خاصی محنت اور طاقت صرف کرنی پڑی ہے۔ انہیں اس حال میں دیکھ کر وہ بے اختیار سسک اٹھی تھی۔ وہ جو اسے جواب دے کر دوبارہ انھیں بند کر چکے تھے ایک دم انھیں کھول کر اپنے بائیں طرف سر جھکا کر دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر بدلت مسکراتے ہوئے بولے تھے۔

”پیلو میرے ہمارے ہونے کا کچھ تو قانہ ہوا۔ میری اجالا اگل سے ہمارا کسی قسم کے آگئی۔ اگر مجھے پتہ ہوتا تو پہلے ہی چار ہو جاتا۔“ ان کی بات پر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے گئی تھی۔ انہوں نے اس کا ہاتھ تھامنا تو وہ روئے ہوئے ان کے ہنسر پر ہی بیٹھ گئی۔

”آپ بس جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ آپ نے ہراس کیا تھا کہ میری برتھ ڈے پر میرے بھی پسند کا کفٹ دیں گے۔ میری برتھ ڈے سے پہلے آپ کو ٹھیک ہوتا ہے۔“ وہ روتے ہوئے بولی تھی اور اس کی اس بات پر وہ مسکرائیں رہے تھے۔ ادیس بڑی خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر جانے لگا تو اگلے دن اس کا بازو ہمام لیا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”کہیں نہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“ وہ اپنے بازو چھراتے ہوئے کچھ بیڑا سے انداز میں بولا تو اچالانے پہلی بار چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اسے مکمل طور پر نظر انداز کئے وہ ہر قیمت پر یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔

”یہ کیا تم بچوں جیسی کرتیں کر رہے ہو۔ کچھ تو پیچرونی کا ثبوت دو۔“ وہ اپنی آواز کی کمزوری پر قابو پاتے ہوئے مشکل بولے تھے۔ ”تم دونوں ہی کا رویہ اسچور ہے۔ غلط فہمیاں کہاں نہیں ہوئیں۔ لیکن اسے اناد عزت کا مسئلہ بنا کر ہر کوئی تم لوگوں کی طرح نہیں جیتے جاتا۔ اگر آپس میں کوئی بدگمانی آگئی ہے تو بیٹہ کر بات کر کے اپنے مسئلے کا حل نکالو۔ ایک دوسرے کے ساتھ Communicate کرو۔ پڑھ لکھے لوگوں کے بیچ Communication gap کبھی بھی نہیں آتا چاہئے۔ ہر مسئلے کا حل ڈکشن میں پوشیدہ ہوتا ہے۔“ وہ دونوں کی طرف باری باری نگاہ ڈالے ہوئے بولے تھے۔

وہ دیکھ کر کھڑا جیسے اپنے آپ پر قابو پا رہا تھا۔ پھر بڑی دقتوں سے خود کو آزاد کرتا ہوا کرسی پر دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔ ان کی بنیادی کا لحاظ کرتے ہوئے جیتے تو کیا تھیں چہرے پر موجود ناگوار اور فحش کے تاثرات کو وہ چپا نہیں پا رہا تھا۔ انہوں نے دوبارہ کچھ کہنے کی کوشش کی تو ادیس بڑی سے مردتی سے انہیں ٹوٹا ہوا بولا۔

”پلیز بابا جانی I Beg You کسی تاپندہ یہ موضوع کو یہاں زیر بحث نہ لائیں۔ میں آپ کی طبیعت کی وجہ سے مجبور ہوں آپ مجھے کچھ بولنے پر مت اکسائیں۔“ اس نے اٹھ کھڑا ہوا سر اٹھا کر بولے غور سے ادیس کو دھج کی طرف دیکھا تھا۔ کیا جو بولنے ہوئے ہیں ان کا لہجہ اتنا مستحضر ہوتا ہے۔ کیا خالوں کے چہرے اسے روش ہوتے ہیں۔ کیا ریاکاروں اور منافقوں کی آنکھوں میں اتنی چمک اور سچائی ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ وہ اپنے چہرے پر مرکوز اس کی نگاہوں سے بے نیاز اس سے مخاطب تھا۔

”مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔“ تاج نہ سکی۔ میں چوں جیسے ہیں مجھے معلوم ہے۔“ وہ اپنے مخصوص مستحضر اور دو ٹوک انداز میں بولا تو وہ بڑی بے بسی محسوس کرتے ہوئے چپ ہو گئے تھے۔ وہ اس وقت سے مسلسل اسی کی طرف دیکھ رہی تھی جو سارے زمانے سے خفا نظر آ رہا تھا۔ اس کا اپنا دل اور داغ اس کے حق میں گواہی دینے لگے تھے وہ چاہے اسے اگلے اسے کسی کا درمیں۔ یہ شخص کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ کوئی اس کے اندر سے بول رہا تھا اور وہ اپنی ایک کی بدگمانیوں پر غرضاً بیٹھی ہوئی تھی۔ کیا اس کا پچھلا رویہ میرے سامنے نہیں تھا۔ کیا وہ بھی ایسا کر سکتا تھا جیسا میں نے اسے سمجھا۔ اگر وہ مجھے دھوکہ دے رہا ہوتا تو اس دن رات گئے ہاتھوں دعا کے ساتھ چکے جانے پر ہولکا جاتا۔ وہ وہ اپنی اور اس کی اس روز کی گفتگو یاد کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ کتنی دور تک دوسرے جھگڑے اپنے آپ سے الجھتی رہی تھی۔ کیا میری اس دن کی تمام باتوں پر مجھے کبھی معاف کرے گا۔ نہیں کبھی نہیں۔ اس نے بھی میرا دل نہیں

دکھایا بھی مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی اور میں نے اسے کتنی بڑی طرح ہرٹ کیا۔ کیا ایک سوری میری تمام بد نظریوں کا ہوا ہو سکتی ہے۔ نہیں کبھی نہیں۔ میں نے جنھوں کی سازشوں کو سمجھے بغیر اتحاد و صداقت پر اعتبار کر لیا اور اپنی جلد بازی اور حماقت کے ہاتھوں اسے خود سے ہمیشہ ہمیش کے لئے ناراض کر دیا۔ وہ اب شاید مجھے کبھی بھی معاف نہ کرے اور شاید مجھے جیسے لوگوں کے ساتھ ہونا بھی ایسا ہی چاہئے۔ میری Short Sightedness نے مجھے کہیں کانٹیں چھوڑا۔“ وہ اپنی سوچوں سے گھبرا کر ان کے پاس سے مڑی ہو گئی۔

کمرے سے نکل کر بیوے کے لئے اور اوروں کے قدموں سے چلتی وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی اپنی زندگی میں کھلنے والے خوشیوں کے اس در کو میں نے خود اپنے ہی ہاتھوں بند کر دیا۔ کیا کوئی اور بھی مجھ کا ماحق اور جلد باز ہو گا۔

ابھی کیا کہیں، ابھی کیا سنیں؟

کہ سر فصل سکوت جاں

کف روز شب پہ شر نہا

وہ جو حرف حرف چراغ تھا

اسے جس ہوا نے بجھا دیا

کبھی لب لبیب کے تو پوچھنا

سر مہر مہر وصال دل

وہ نگہوں کا بھجھ تھا

اسے دست موج فراق نے

خاک کب سے ملا دیا

کبھی محل تھکلیں تو پوچھنا

ابھی کیا کہیں، ابھی کیا سنیں

پوئی خواہشوں کے نظار میں

کبھی بے سبب کبھی بے خلل

کہاں کون کس سے بچھڑ گیا؟

کسے کس نے کیسے گھٹا دیا؟

کبھی پھر لبیب کے تو پوچھنا

وہ پرانگ میں آکر اپنی گاڑی کا لاک کھولے ہوئے خود کو ہمیشہ سے زیادہ غما اور دھج محسوس کر رہی تھی۔ اپنی پشت پر کسی کی سوچوں کا احساس ہوا تو وہ پلے بغیر ہی اس کے مخصوص پر لوم کی خوشبو سے اسے بچانے لگی۔ مڑ کر دیکھا تو وہ اس کے بالکل سامنے کھڑا ہے۔ میری بڑی نگاہوں سے وہ دیکھ رہا تھا۔

”تم نے کبھی مجھے نہیں سمجھا۔ لیکن میں تمہارے چہرے پر موجود تاثرات سے تمہارے دل کی ہر بات جان

لیتا ہوں۔ مجھے نہیں جھکانے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ لیکن کم از کم اتنا تو کہہ دو کہ تم میرے اوپر اعتبار کرتی ہو ساری دنیا میں سب سے زیادہ۔ صرف اتنا ہی کہہ دو کہ تمہارے دل سے تمام شکوک دور ہو گئے ہیں جنہیں مجھ پر یقین آ گیا ہے۔" وہ اس کے سامنے کھڑا دونوں ہاتھ سینے پر ہاندے مضبوط لیچے میں کھد ہاتھ۔

"کیا آپ مجھے معاف کر دیں گے؟" وہ اس سے نظریں ملانے کی ہمت خود میں نہیں پارتی تھی۔ اس نے سر جھکا کر بولی تھی۔

"ہاں اس شرط پر کہ آئندہ کبھی مجھ سے بدگمان نہیں ہوگی۔ ہر شخص سابق اور دھوکے باز نہیں ہوتا۔ دنیا میں ابھی جی محبت اور ظلم اس کتاب بھی نہیں ہوا کہ ہر آدمی کو شکوک کی ٹیپ لگا کر دیکھا جائے۔ وہ اتنی دیر میں جھکی مرتبہ مسکرایا تھا اور اس کی اس بات پر وہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ لے کر اقرار میں گردن ہلا رہی تھی۔

☆☆☆

"آج اجالا نے سچ بچ میرے گھر میں اجالا کر دیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں اسے رخصت کر کے اپنے گھر لایا ہوں۔ آج سے ٹھیک ایک سال پہلے آج ہی کے دن وہ مجھے پہلی مرتبہ پارک میں ملی تھی اور اب میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ اتنی پیاری اور مضبوطی لڑکی میرے گھر میں اتنی ساری خوشیاں اور بہاریں لے کر آئے گی۔ میں خوش ہوں بے تحاشا اور بے حساب خوش ہوں۔ میرے بچوں کو ان کی خوش فہمی وہ مطمئن اور آسودہ ہو گئے اور اپنے بچوں کو خوش دیکھ کر میں کیوں نہ خوش ہوں۔ اجالا دہن بن کر اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ میں بتائیں سکتا۔ کاش آج ہم لوگوں کے درمیان صیغہ، وانیل اور تین بھی ہوئے تو ہماری خوشیاں دو بالا ہو جاتیں۔ خیر میں اپنے رب کی رضا میں راضی ہوں۔ اس نے مجھے بے حد نوازا ہے۔ میرا اوئیں اور میری اجالا میرے پاس ہیں۔ میرا گھر مکمل ہو گیا ہے۔ اب اس گھر میں قہقہے کو گونجا کریں گے۔ میرے بچے اپنی زندگی کو خوشگوار انداز میں بسر کریں گے اور میں انہیں بستا سکرانا دیکھ کر بک کائنات کا شہزادہ کروں گا۔ کچھ عرصہ پہلے کے مجھے یہ سب کچھ ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔

اجالا اور اوئیں کے سچ اتنی مس اندر سینٹنگ ہو گئی تھی اور میرے سمجھانے بھانے کا دونوں ہی پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اگر بچوں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اجالا اور اوئیں دونوں ہی اپنی اپنی جگہ صحیح تھے۔ اجالا جس نے اپنے خوشی رشتوں کی بے اعتباری اور ناقص روی کا دکھ اٹھایا ہوا تھا کیسے کیسے کی اور پر ہر دورہ کر لیتی اور اوئیں اپنے جذباتوں میں سچا تھا اس لئے وہ کیوں جھک جاتا۔ ان دونوں کے دو بے اپنی جگہ درست تھے لیکن میں اپنے بچوں کو ایک دوسرے سے ناامنی کا پرچم بلند کئے کیسے دیکھتا رہتا۔ خاموش قناتی جاتا اپنے بچوں کی برادری دیکھتا رہتا۔ وہ ناخوش تھے ایک دوسرے سے فضا تھے اور میں دونوں میں سے کسی کو بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ جوش مشہور ہے کہ جو ان گھر سے بھاگنے سے ڈرتا ہے اور بڑا حاصر ہے۔ سو اس کی شکل پر عمل پیرا ہوتے ہوئے میں نے ایک درامہ تیار کیا۔ اس ڈرامے میں میرے ساتھ اخلاق اور بخاری نے بھی اپنا اپنا کردار نبھایا تھا۔ اجالا تو خیر ہے یہی سیدھی سادی اور مصمم اصل خطرہ تو اوئیں سے تھا۔ وہ آخر میرا پوتا ہے اس کی ذہنی اور حیثیت نظر میں مجھے خوف تھا۔ لیکن آخر میں اسی کا روادا ہوں ایسی کا سیاب اداکاری کی کہ اس کے فریضے بھی اصل حقیقت نہیں جان سکے ہوں۔ اخلاق کو میں نے سمجھا دیا

تھا کہ پہلے اوئیں کو روکے ہوئے فون کرے پھر جب وہ مجھے باہر لے جائے تو اجالا کو۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ملوانے کا اور کوئی طریقہ ہی نہیں تھا میرے پاس۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری ترکیب کامیاب رہی۔ ان دونوں کے سچ موجود تمام شکوک اور ناراضگیوں کی دھند چھٹ گئی۔ اپنی اس چالاکی کا تو میں انہیں کبھی بھی پتہ نہیں چلے دوں گا۔ وہ وہ آئندہ کبھی میری کسی بات کا یقین نہیں کریں گے۔

اپنے آشیانے کی حفاظت میں نے بھیر و خونی کر لی اور میں خدا کے بزرگ و برتر کا احسان مند ہوں جس نے میرے بچوں کو ان کی روٹی ہوئی خوشیاں لوٹا دیں۔ میری دعا ہے کہ اوئیں اور اجالا کے سچ اب کبھی کوئی دعا کوئی ماریہ نہ آئے اور اگر آئے بھی تو وہ ہر سازش اور ہر حاسد کی حسد اور دشمنی کو کام بنا دیں۔ پارک العالمین میرے بچوں کو سدا خوش اور آباد رکھنا۔ انہیں کبھی کوئی دکھ نہ پہنچے۔ انہیں حاسدوں کے حسد اور شر پندوں کے شر سے بچانا۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے پر اعتبار کریں ایک دوسرے سے پیار کریں۔ انہیں کبھی کوئی دکھ چھو کر بھی نہ گزرے آمین ثم آمین۔



ہوں۔ ایک سو فیصد پر فیضیل اعزاز رکھنے والی لڑکی بن گئی تھی میں۔

یہ میرا پر فیضیلم ہی تو ہے کہ ایک بار جو کلاٹ میرے پاس آجائے وہ پھر کسی پارلر میں جانا پسند نہیں کرتا۔ اس کی وجوہات میں میری کام میں مہارت اور کام کو پوری توجہ سے کرنا شامل ہے ہی لیکن اس کے علاوہ کچھ اور عوامل بھی اس میں شامل ہیں۔ اچھا برنس مین یا دوں کہ وہ ہوتا ہے، جو دیو یا اور دوسرے نتائج پر نگاہ رکھے۔ اگرچہ میں نے کسی نامی گرامی انسٹی ٹیوٹ سے برنس ایلمنٹیشن میں کوئی ڈگری نہیں لے رکھی یا برنس، مارکیٹنگ اور پبلک ریلیشنز وغیرہ کو بطور سبکیٹ پڑھ رکھا ہو، لیکن بغیر ہڈے میں کسی برنس اسکول کے گریجویٹ سے زیادہ چالاک اور ڈچین برنس دوں ہوں۔ اپنے ہر کلاٹ کے ساتھ خوش اخلاقی اور خوش دلی سے ملنا تو میرا وصف ہی ہے۔ میرا ہر کلاٹ دل ہی دل میں خود کو میرا سب سے خاص کلاٹ سمجھتا ہے۔ اچھے کاروباری ادارے اور ملکی پیشکش کنسیاں جو طریقہ اختیار کرتی ہیں کہ وہ صاف کو تو ایک مفت، تو فٹ چیسٹ کے ساتھ برنس مفت اور سبکی کے ایک ٹکڑے کے پڑوس روپے کی بچت وغیرہ ایسا ہی کچھ میں بھی کرتی ہوں۔ جو کلاٹ پہلی مرتبہ آتی ہے اور اس نے صرف آئی بروز بخواتین ہیں تو میں اپنا مفت میں بنا دوں گی کیونکہ میرے آئی ہے تو میں مفت میں بیک بیٹے بھی نکال کر اسے کلیننگ کے بیسوں میں پیشل کے حوالے کر دواؤں گی۔ وہ فوٹو اساتذہان بعد میں میری مستقل آنے والی کانٹنس میں ایک اور کلاٹ کا اضافہ کر دیتا ہے۔ حالانکہ ان کا کل کنٹناخت مقابلہ ہے۔ ہر گلی محلے میں بیوی پارلر کا جھہ بازار لگا ہوا ہے، لوگوں کے پاس بے تحاشا چائیں ہے۔ ایسے میں یہ میری کاروباری کاسابی ہی ہے کہ میرے پاس ایک بار آنے والا پھر میرے علاوہ اور کہیں نہیں جاتا۔ باوجود اس کے کہ پھر دوبارہ میں بیسوں میں اس طرح کی رعایت بھی بھی نہیں کرتی۔

پانچ سال پہلے جب میں نے اپنے اس پارلر کا آغاز کیا، اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں میرا پارلر اتنے زبردست طریقے سے چلنے لگے گا۔ یہ ایک ایسا کام تھا جو میں نے انتہائی مشکل حالات میں بہت دُور سے ڈرتے ڈرتے شروع کیا تھا۔ کچھ میں خود دواؤں گی تھی، بچوای اور بہنوں نے بھی ڈرایا ہوا تھا۔

”تم کیسے کرو گی یہ کام اس قسم کے کاموں کے لئے جس طرح کی چالاک اور ہوشیاری دکھا رہی ہو، وہ تمہارے پاس ہے نہیں۔ ایک سے ایک چالاک اور چلتی روزہ قسم کی عورتیں اور لڑکیاں آیا کریں گی تمہارے پاس۔ تم اس طرح کے لوگوں کو کس طرح پینل کرو گی۔“

وہ لوگ دھکا دھکا اس طرح کی باتیں کر کے میرا حوصلہ پست کرنے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ اہی کو کچھ سے اس بات کا شکوہ تھا کہ اگر میں نے ان کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے کچھ پڑھ لکھ کر دے دیا ہوتا تو بجائے اس مشکل کام میں پڑنے کے سیدھے سیدھے کہیں کوئی مناسب جگہ جی کر لیتی۔ مگر اب اس بی بی جی عوامی ڈگری کے ساتھ اور وہ بھی سینڈ ڈو جن میں مجھے کون اپنے اس بلازمستو سے سنا تھا۔

ہر آدمی، ہر چرچ میں اچھا نہیں ہو سکتا، ہر آدمی ہر کام اچھا نہیں کر سکتا۔ میں بہت سے کاموں میں بہتر تھی لیکن انھوں نے ان کاموں میں پڑھائی کبھی شام نہیں ہو سکی۔ حالانکہ میرے علاوہ بی بی جی چاروں بیٹنیں پڑھائی میں بہت

خوشی کو دھونڈتے ہوئے

کہتے ہیں وقت سب سے بڑا استاد ہے، وہ باتیں جو آپ کو نہ کتاب میں پڑھ کر سمجھ میں آتی ہیں اور نہ ہی کالجوں، یونیورسٹیوں میں کسی اعلیٰ ترین ڈگری کے حصول کے دوران، وہ سب وقت بے بسا کاغذ اعزاز میں خود بخود ہی سمجھا دیا کرتا ہے۔ مجھے بھی وقت نے بہت کچھ سمجھا اور سکھا دیا ہے۔

آج سے پانچ سال پہلے دلی نیرو ڈاکٹر اور آج کی نیرو ڈاکٹر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

بجی میں خود بھی بے تحاشا خوش رہا کرتی تھی اور اپنے ارد گرد موجود دوسرے لوگوں کو بھی اپنی باتوں اور زندگی سے بھرپور مسکراہٹوں سے خوش رکھا کرتی تھی۔

جب نیرو ڈاکٹر نے دنیا کو کھٹا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ سادہ سی لڑکی سب لوگوں کو اپنے جیسا ہی سادہ سمجھا کرتی تھی۔

لوگوں کی چالاکیاں، مکاریاں، منہ پر کچھ اور چیلنے پیچھے کچھ والی باتوں کا اسے اور اک ہی نہیں تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ وقت اسے سب کچھ سمجھا دیا گیا۔ شروع شروع میں جب میں نے لوگوں کی منافقت دیکھی تو میں حیران رہ گئی۔ میں شریہ دکھ میں چلا ہو گئی۔ بہت قریبی افراد بھی اس طرح حسد اور نفرت میں مبتلا ہوئے ہیں۔ یہ سب میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے لوگوں کے ایک چہرے کے پیچھے چھپے کی چہرے دیکھے ہیں۔

یہ بالکل شروع شروع کی بات ہے، جب مجھے لوگوں کی منافقت اور جھوٹ سے بہت تکلیف پہنچی تھی۔ اب کم از کم ایسا نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ میں لوگوں کی طرح جھوٹ نہیں بول سکتی، منافقت نہ انداز نہیں اختیار کر سکتی، لیکن کم از کم اتنا تو کر سکتی ہوں کہ خود بھی لوگوں پر غلطی اور محبت نہ نمودار نہ کروں۔ اگر بہت سے لوگوں کو میں صرف ضرورت پڑنے پر ہی یاد آتی ہوں تو پھر میں بھی جوا بآئیں اسی وقت یاد کرتی ہوں جس مجھے ان سے کوئی کام ہوتا ہے۔

کراہی جیسے بڑے شہر میں، میں اپنا ذاتی بیوی پارلر چلا رہی ہوں اور ہر روز میں کی قسم کے لوگوں سے ملتی ہوں کہ اب کسی کی بھی صرف مل، کیونکہ کرسی اس کا شعلی بیکر ڈاؤن کر سکتی ہوں۔ پبلک ڈینگ بہت مشکل کام ہے۔ ہر کسی کے پاس کانٹنس ہے یہ کام اور یہ بے حد مشکل کام میں پچھلے پانچ سالوں سے بڑی خوبصورتی سے انجام دے رہی

بچہ بچاس فیصد شکست ہماری کم ہمتی اور منفی سوچیں خود بخود حمایت کر دیں گی۔ تجربہ جیزی اور چالاکی کوئی بازار میں بچنے والی چیز تو ہے نہیں کہ میں بازار جاؤں اور خرید کر لے آؤں اور نہ ہی بے چیزیں کھیں آسان ہے جھگڑیں گی۔ میں بھی کام کر کے پیسوں کی۔ جب تک ٹھوکر نہیں کھاؤں گی جب تک سہلنا اور دھنک سے چلتا بھی نہیں سیکھ پاؤں گی۔"

ان لوگوں کے اعتراضات کے جواب میں، میں نے بہت عزم اور حوصلے کے ساتھ اسے خیالات ان لوگوں کے سامنے رکھے تھے۔ بہت بحث و کھمار کے بعد میں اسی اور سارہ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

ایک کمرہ پائی گھر سے ذرا الگ بنا ہوا تھا۔ میں نے اسی میں پارکھولے کا ارادہ کیا۔ اللہ کا نام لے کر میں نے اپنے بیوی یا پارک آغا ذکر کیا۔ شروع شروع میں مجھے سختی شکلات پیش آئیں، یہ بہت ہی طویل داستان ہے۔ وہ جو امی اور سارہ مجھے لوگوں کی چالاکیوں سے ڈرایا کرتی تھیں اس کا بھی مجھے خوب اطمینان تجربہ ہوا۔ شروع میں میرے پاس آنے والی کانٹیشن میں زیادہ تعداد ہمارے پردوں میں رہنے والی خواتین اور لڑکیوں کی تھی یا پھر خاندان کی لڑکیوں کی۔ اکثر میں پردوں اور ریشہ داروں کے چکر میں اپنی مروت کے ہاتھوں نقصان اٹھاتی رہتی تھی۔ مجھے کی کوئی خاتون میرے پاس اگر بال ٹرم (Trim) کروانے آئیں تو ہالوں کی فرنگ کروانے کرواتے وہ پوری کنگھی کر دیا کرتیں۔

"نیرہ! ذرا سا پیچھے سے ہلکا سا چھپچھپے دے دو ہالوں کو۔" فرم کرواتے کرواتے وہ لا پڑاؤں سے کہتیں۔ ابھی میں ہالوں کو پیچھے سے چھپچھپے دے رہی ہوتی تو وہ فرماتیں۔

"آگے سے کبھی کبھی لیئرڈ اگر دے دی جائیں تو کیسا گام؟" یوں "ہلکا" اور "ہلکی" کرتے وہ مجھ سے پوری لیئر کنگھ کر دیا کرتیں اور پیچھے لیے وقت مجھ سے مارے مروت اور لحاظ کے یہ بات کبھی کی نہیں جاتی تھی کہ "آئی آپ نے فل کنگھ کروائی ہے، آپ اس کے پیچھے دیں۔"

ان کی چالاکی اور مکاری میری مجھ تو آتی تھی مگر کسی کو منہ پر کس طرح اور کس انداز میں جواب دیتے ہیں یہ بات مجھے اتنی ہی نہیں تھی۔

ایک کو میری اس حرکت کا بچلا اور پتہ بھی تھا میرے میرے چلتے پرتے چلا تھا تو وہ مجھ پر غور ناراض ہوئیں۔ "اگر نی کینل اللہ اور خدمت طلوع کے طور پر کام کرنے کا اتنا ہی شوق ہو رہا ہے تو پھر باہر ایک بڑا سا بورڈ لگو، لو جس پر "میں تمام کام منت کئے جاتے ہیں۔" جلی حرفت میں لکھا ہوا ہو۔"

"میں کیا کروں اسی مجھ سے بچوں کے بارے میں کسی سے کہو کہ نہیں جانتا، مجب سار لگتا ہے۔ انہیں تو خود اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ انہوں نے کیا کام کر دیا ہے۔ خود کہنا کتنا برا لگتا ہے۔"

میں نے شرمندگی سے سر جھکا کر اپنی کردہ کردی کا اعتراف کیا تو امی خدا اور ناراضی بھلا کر مجھے سمجھانے بیٹھ گئیں۔

"ان حرکتوں پر لوگ جنہیں کسی بہت اعلیٰ خاندان کی افراد دیکھ پیچھے پر جان نہ دیتے دانی شخصیت نہیں سمجھیں گے۔ بلکہ بے وقوف اور پاگل سمجھیں گے۔ بات دوسرے دوسرے پر گزار دے کہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ کو اپنا حق لینا آتا ہے۔ انہیں اور اس بات میں جنہیں شرمندگی بھی محسوس نہیں کرتی چاہئے۔ تم اپنے حق سے زیادہ تو کہو

طلب نہیں کریں۔"

کچھ امی کے سمجھانے اور کچھ خود ہی لوگوں کی تیزی اور چالاکی دیکھ کر آہستہ آہستہ میں نے کاہلیاں طور طریقے سیکھنے شروع کر دیے۔ میں کام پوری محنت اور دیانتداری سے کیا کرتی تھی، بہت سے دوسرے پارلر کی طرح میں بھی کوئی نو نمبر اور سستی پروڈکٹ امپورٹ اور بیچل بولٹ پاؤں میں مگر کراپے کٹائش کو بے وقوف بنانے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔

چند ہی سالوں میں، میں نے اپنے پاؤں بجائے اور ٹھوکر کھا کھا کر سہلنا اور مضبوط قدموں سے چلتا سیکھ لیا تھا۔ اسی جو میری نالائقیوں اور بے وقوفیوں سے باخبر رہ کر تھی میں میری کامیابیوں پر بے حد خوش تھیں۔ میں نے اور سارہ نے امی کی تمام نیرخوش فحش کردی تھیں۔ اسکول کی چاب انہوں نے ہم لوگوں کے بہت کہنے پر بھی نہیں چھوڑی تھی۔ البتہ وہاں سے لوگ لیو (Long leave) لے لی تھی۔ اس لوگ لیو کے بعد انہوں نے وہ بارہ سے اسکول جوائن کر لیا تو ہم لوگ اس بات پر خوش تو ہو گئے تھے، لیکن انہیں روک بھی نہیں پائے تھے۔

سارہ کی عقلی اس کے لیے ایسی ہی کے دوران ہی امی کی ایک کو لگ کے بیٹے کے ساتھ ہو چکی تھی۔ ادھر سارہ کا کام ایسے ہی مکمل ہوا۔ ادھر ان لوگوں نے شادی کی جلدی چھادی۔ امی نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کہنے کو وہ مجھ سے ایک سال بڑی بہن تھی، لیکن میری اس سے باہل دوستوں جیسی انڈر شیڈنگ تھی، اس لیے اس کی شادی کے بعد میں نے اس کی کسی بے حد عذرت سے محسوس کی تھی۔

اپنے سماجی مسائل کے عمل اور امی کی پریشانیوں کو کم کرنے کے لئے میں نے محنت اور لگن سے جو کام شروع کیا تھا، اس سے میں مطمئن تو تھی لیکن پھر بھی کبھی کبھار مجھ پر مایوسیوں کا حملہ بھی ہو جایا کرتا تھا۔ اپنی اہم عمر بہت ہی دوسری لڑکیوں کو بے غلری کی زندگی گزار رہے دیکھ کر کبھی میں اللہ سے شکوے کرنے بیٹھ جایا کرتی تھی۔ لیکن زندگی سے یہ تمام شکوے اور کھاتیں صرف اس وقت تک تھیں جب تک میں صانع عظمیٰ سے نہیں ملی تھی۔

صانع علی میری مستقل گناہت ہے۔ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ زندہ دلی، بہادری، خود اعتمادی۔ کہنے کو وہ میری عمر ہی کم عمر ہے مگر عزم اور ہمت میں وہ مجھ سے کہیں آگے ہے۔ وہ ایک بہت ہی سخت اور آزمائشوں سے بھری ہوئی زندگی گزار رہی ہے، پھر کبھی وہ میری طرح زندگی سے کبھی ناراض نہیں ہوتی وہ کبھی بھی یہ نہیں کہتی کہ صرف میرے ہی ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ دوسری لڑکیاں تو سب مزے کی زندگی گزار رہی ہیں۔

زندہ دلی سے نتیجہ کافور اور خوشحالی ہوئی اس لیے ہم خاصا شین اور بہت لکڑی کوئی انداز دہی نہیں لگنا کہ زندگی کس کس انداز میں اس کا امتحان لے رہی ہے۔

صانع کو میرے پاس آتے ہوئے غائب تین سال ہو گئے ہیں۔ وہ ایک غیر ملکی فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں CRO ہے۔ پہلی مرتبہ جب وہ میرے پاس آئی تو میں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ دوسرے لوگوں کی طرح امی بھی میرے کام کرنے کا انداز پند کیا تھا اس لیے وہ اس ایک مرتبہ کے بعد پابندی سے ہر دوسرے نمبر سے میرے ہی پاس آئے تھے۔ اس کا ریسٹورنٹ ہمارے گھر سے بہت قریب تھا۔ اکثر وہاں سے ڈیوٹی آف ہونے پر میرے پارٹ میں آیا کرتی تھی۔

جتنی دیر میں اس کا فیشل یا بالوں کی کٹنگ کر دی ہوئی، وہ مسلسل کچھ نہ کچھ ہلکتی رہتی لیکن ایک روز جب وہ میرے پاس آئی تو بہت چپ چاپ تھی۔

"تمہارے بالوں کا طبع بھی بالکل بگڑا ہوا ہے صاف سارا مٹی پر خراب ہو گیا ہے۔ کھوتو کٹنگ کرو۔"

میں نے دھاگا داہیں دراز میں ڈالے ہوئے اس سے کہا تو اس نے بیزاری سے بھر پور انداز میں منہ کر دیا۔ "موتو نہیں ہو رہا۔ بالوں کو تو کھپ لگا کر جینڈ میں بیکڑ کرنا تو کیا جا سکتا ہے۔ یہ خودی کی بجموری ہے۔ ورنہ میرا تو انہیں ہوائے کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کسمز سے ساتھ اچھے فیشلینرز رکھنے کے لئے یہ بھی تو ضروری ہے کہ آپ خوبصورت نظر آ رہی ہوں، آپ کے چہرے پر مصنوعی کمرہات ہو۔ پٹاروں جیسی روٹی بسورٹی شکل دیکھ کر کسمز فیشلینرز بھاگ ہی جائیں گے۔"

وہ بہت طبعی طبعی انداز میں بولی تھی۔ شاید بہت بھری ہوئی ہنسی تھی۔ غالباً اسے اپنے دکھ کہنے کے لئے ایک سننے والا درکار تھا۔ اتفاق سے اس وقت پارٹنر، میں اور وہ ایکلیے تھے۔

صاف ساری زبان اس کی ساری کہانی سن کر میں اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام شکوکوں پر پتی بھر کر شرمندہ ہوئی تھی۔ صاف ساری چادر تو ہر طرح سے حالات کے ظلم و ستم کا شکار تھی۔

"مات صاف ساری بہن بھائی تھے۔ میں سب سے بڑی تھی۔ پندرہ سال کی تھی جب ابا کا انتقال ہو گیا۔ مگر لوگ کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔

میں نے ابھی صرف میٹرک ہی کیا تھا کہ زندگی یوں آندھریوں کی زد میں آگئی۔ کالج میں پڑھنے اور ڈاکٹر بننے کے تمام خواب چٹکا چور ہو گئے تھے۔ کوئی رشتہ دار، کوئی دوست اور کوئی پردی ان مشکل حالات میں کام نہیں آیا تھا۔ بہت کوششوں سے مجھے ایک فیکٹری میں ملازمت ملی تھی۔ اسی مگر ہنگاموں کے کپڑے سینے کا کام کر تیں اور میں رات رات سارا دن فیکٹری میں سخت ترین مشقت کرتی، جب کہیں جا کر ان کے مگر میں چلنا چلا کرتا۔ ان سب فیکٹریوں سے گزرنے کے ساتھ ساتھ پرائیوٹ ایجنٹ کے امتحان کی بھی تیاری کرنا۔ انٹر کرنے کے بعد میں نے فیکٹری کی ملازمت چھوڑ کر کہیں اور جبر ملازمت کرنے کا سوچا۔ جہاں معاوضہ ذرا بہتر مل سکے۔ اخبار میں اشتہار دیکھ کر میں ایک پرائیوٹ فٹ فرم میں سیکرٹری کی جاب کے لئے نکل پڑی۔ میری جرات اور خوشی کی انتہا نہ رہی جب وہاں کے مالک نے چند آسان آسان سے سوال پوچھنے کے بعد اپنے پاس جاب دے دی۔ وہاں کی تنخواہ فیکٹری میں ملنے والی تنخواہ سے کہیں انچھی تھی۔

پاس کا دور یہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ مجھے ٹائپنگ کرنی اور ڈیکٹیشن لینا نہیں آتا تھا لیکن وہ پھر بھی میری حوصلہ افزائی کر دیتے تھے۔ میں کسی کام میں کوئی غلطی کر دیتی تو اسے بڑے آرام سے نظر انداز کر دیا کرتے۔ میں بہت کم عمر کی تھی اس وقت۔ مجھے باہر کی دنیا اور درسوں کی کینگیں کا بچہ ہی نہیں تھا۔ وہ مجھ سے چھ پانچ برس کے بات کرتے تو میں نے انہیں بچہ بچہ اپنے والد ہی کی طرح سمجھ لیا تھا۔ مجھے اپنی عقل ہی نہیں تھی کہ انتر بھی کم تعلیم اور بچہ کی تجربہ ٹائپنگ، شارٹ پیئر اور دیگر دفتری امور میں کتنا واقفیت ہے، باوجود بھی انہوں نے مجھے اپنے پاس جاب کیوں دے دی ہے۔ میں تو بس اسے اپنی خوش قسمتی سمجھ کر تھا جسے خوش قسمتی تھی۔ وہ مجھے اہمیت دیتے، میری حوصلہ افزائی کرتے یہ سب کچھ

ان کے ہاں جاب کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے آگے لی اے کے امتحان کی تیاری بھی شروع کر دینی چاہئے وہ کہتے تھے کہ آگے جاتے جاتے سلسلے میں وہ میری بھرپور مدد کریں گے۔ صرف دو مہینوں میں ہی میں نے خواہاں ہی خواہاں میں خود کو لی اے اور ایم اے کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اسی امید میں سیکرٹری کی جگہ کی اور اچھی پوسٹ پر کام کرتے ہوئے میں خود کو تصور میں دیکھ کر کرتی تھی۔

وہ انکو بھیجتے تھے کہ بعد بھی آفس میں روک لیا کرتے تھے۔ ایک روز چھٹی کے بعد انہوں نے مجھ سے رکنے کے لئے کہا تو میں ہمیشہ کی طرح بڑے آرام سے رک گئی۔ یہ دیکھے بغیر کے باقی سارا شاف چھٹی کر کے چکا ہے۔ ہمارا آفس پانچویں منزل پر تھا اور اس فلور پر ہمارے آفس کے علاوہ دو آفسور تھے۔ وہاں چھٹی ہمارے آفس سے پہلے ہو جایا کرتی تھی اس لئے اس وقت وہاں مکمل شاف اور دیرانی تھی۔ میں کم عمر اور نادان تھی تو میری ماں بھی بہت سیدھی مکمل تھیں اور بے وقوف عورت تھی۔ ورنہ یہ بات ضرور سوچتی کہ کسی غیر معمولی کو انکلیکیشن کے نہ ہونے کے باوجود اس کی بیٹی پر اس کا پاس کیوں میراں ہو رہا ہے۔

سارے خدائی کی میری یہ عقل تھی نیرو اور میری یہ حسین صورت۔ یہ خوبصورتی جس میں اس وقت بہت سی معصومیت اور بھولن بھی شامل تھا۔ میری یہ خوبصورتی جس کا مجھے احساس نہیں تھا۔ کبھی ہم قلموں میں اس طرح کا سینہ دیکھتے ہیں تو کس قدر ناخوش کرتے ہیں۔ ایک ایک بیچ رہی ہے، بچاؤ بچاؤ کی آوازیں لگا رہی ہے۔ قلموں میں نہیں معلوم ہوتا ہے میری پر کوئی آج نہیں آئے گی، ایک خود مراد سید مراد کی داکٹین ہو کر، سارے زمانے سے نکل لیتا ہے بچانے آجائے گا۔ لیکن حقیقی زندگی میں کوئی میری نہیں آتا، نیرو کو ایک نیرو، کسی سرائیکی کو بچانے نہیں آتا نیرو۔"

وہ میرے سامنے بیٹھ کر بھرائی ہوئی آواز میں رو رہی تھی۔ میں مدام سامنے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"اس کا خیال تھا کہ میں کم عمر اور بے وقوف سی لڑکی ہوں۔ اس کی بہن بھائیوں اور اپنے معاشی مسائل کا سونپنے ہوئے اور یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے ملازمت سے نکال دے گا، پھر مجھے کہاں ملازمت ملے گی۔ خود کو بڑے آرام سے اس کے حوالے کر دوں گی۔ وہ مجھے بہت سے سبزیوں کا کھانا دے گا، پھر میری تنخواہ میں اضافہ ہو جائے گا اور میری بہت سی بھینس ملیں گی۔ اور روز مجھے یہ بات پہل چلی نیرو کہ یہ ملازمت میری میری عقل، صورت اور کم عمری کی وجہ سے ملی ہے۔ وہ دو مہینوں کی تنخواہ جو میں نے اپنے کام کا معاوضہ سمجھ کر وصول کی تھی، وہ میرے کام کی وجہ سے نہیں بلکہ میرے حسن اور خوبصورتی کی وجہ سے مجھے ملی تھی۔ میں نے خود کو اس سے کم طرز پر پایا میں نہیں سمجھتی تھی۔ چھ مہینے میرے ماں باپ کی کوئی نیکیاں نہیں لائی تھیں یا کچھ پر ہم آگیا تھا جو میں اس درندے سے بچ بچنے کے کام کیا ہوا ہوئی تھی۔ اندھا دھند بھائی میں تیزی سے سبز حیاں اتر کر اس بڑے بڑکے سے باہر نکل آئی تھی۔ مجھے پچھتائیں تھا میں زندہ ہوں بھی بائیں۔

بہت دیر تک میں روڈ پر پوچھتی رہی تھی کہ انداز میں چلتی اور پھر تھک کر میں روڈ کے ایک طرف فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی تھی۔ میرے پاس سے گزرتی ایک دایرہ گورت نے مجھے ہچکچاتے سمجھ کر چند کچھ میری بھولی میں ڈال دیئے۔ وہ مجھے بھگانے لگے میں حق بجانب تھی۔ میرا طبع ایسا تھا۔ میرا وہ ہزاروں دفعہ کا پینا ہوا سوت جسے اس سچ میں خوب کلف لگا کر اور دستری جھاک کر کہاں کر تھی، کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا نیرو وہ پڑے ہوا ہاں آفس کے کسی کمرے میں

ہی کر چکا تھا۔ میں کتنی دیر تک وہاں بیٹھ کر روٹی بھی یاد نہیں۔ مجھے دنیا سے، زندگی سے، لوگوں سے ہر چیز سے نفرت ہو رہی تھی، شدید نفرت۔ میں نے اس لمحہ ہی شدت سے اللہ سے اپنے لئے موت مانگی تھی۔ قرب تھا کہ میں سامنے سے آتی کسی بھی گاڑی کے آگے اور خود کو موت کے حوالے کر دیتی کہ اچانک میرے ذہن میں میری ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کے آنسوؤں سے جھپکے ہوئے چہرے آ گئے۔ اپنے گھر کا بچا ہوا چڑھا آ گیا۔ نہیں مجھے زندہ رہنا ہے۔ اپنی ماں اور بہن بھائیوں کے لئے۔

اس لمحہ میں نے ایک نیا جنم لیا تھا۔ ایک نئی صائر علی نے جنم لیا تھا۔ وہ رہا، بے خوف، سیدھی اور لوگوں پر انہیں بدکر کے بھروسہ کرنے والی صائر علی کو میں نے اسی فٹ پاتھ پر ان سکوں کے ساتھ بیٹھا چھوڑ دیا تھا اور خود وہاں اپنے گھر آ گئی تھی۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ مجھے اسی دنیا میں اور ان ہی لوگوں کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ لوگ میری خاطر نہیں بدلیں گے، مجھے خود کو لوگوں کی خاطر بدلا دینا ہوگا۔ اپنی حفاظت کرنا سیکھنا ہوگی۔ بہادری سے زندگی سے لڑنا ہوگا۔

اس نے اپنے آصاف کو کرتے ہوئے ایک ہلے کے لئے میری طرف دیکھا اور میری آنکھوں میں اپنے لئے دکھا اور آنسو دیکھ کر بہت دکھ میرے انداز میں لگا سا سکرانی۔

”بھروسے میں نے بہت جگہوں پر نوکریاں کیں، کبھی کسی اسکول میں کیشری کی، کبھی کسی آفس میں ٹیلی فون آپریٹر کی، کبھی ریپنٹنٹ کی۔ لیکن ہر دو بارہ میں نے کسی مرد کے ہاتھوں میں جھک کر نہیں کھایا۔ میں نے لوگوں کے چہرے اور ان کی نگاہیں پڑھنا سیکھ لی تھیں۔ اپنے رویے میں بخوبی انداز اور دھڑلہ پڑھا لیا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے اپنی تعلیم سے زیادہ اپنے بہن بھائیوں کی تعلیم کی پڑھ لی۔ وہ سب اچھی تعلیم حاصل کریں تاکہ انہیں میری طرح کے مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

پھر ایک روز میں اپنی ایک نوکری کے ساتھ قسمت آزمائی کے لئے اس ریسٹورنٹ میں انٹرو دینے کے لئے پہنچی تھی۔ وہاں نوکری کے لئے ابھی پڑھائی اور اچھی انگلش لازمی چیزیں تھیں اور وہ دونوں ہی چیزیں میرے پاس تھیں۔ میں دودھ دیکھ کر کہ کھانسی پڑا کر گئی تھی۔ مجھے یہاں جاب کی تو میرا بہت بڑا مسئلہ ہو گیا۔ میں نے گھر جا کر خوشی خوشی اس کو اس جاب کا تیا کر دیا تو وہ بجائے خوش ہونے کے مجھ سے تاراشی ہو گئیں، پورے پارون انہوں نے مجھ سے بول چال بند کر دی۔

”میری بیٹی اب لوگوں کو برگر، پیزا اور کولڈ ڈرنکس پیش کیا کرے گی۔ یہی دن دیکھنے کے لئے زندہ چلی گیا میں کہ میری بیٹی پیرا گیری کرے گی۔“

میں انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں پیرا گیری نہیں کر رہی۔ ہم لوگ تو کاؤنٹر پر کھڑے، ہمارے پاس ہے، لوگ اپنی ٹرے اٹھا کر خود اپنی میز پر لے کر جایا کریں گے۔ بہت مشکلوں سے اسی کو تیا کر خاندان والوں کے اعتراضات شروع ہو گئے۔ ماموں، چچا، چھوٹی سب سے خوب لکھن میں کی۔ ماموں نے تو باقاعدہ ہم لوگوں کا سوشل بائیکاٹ کر دیا۔ اسی سے صاف کہہ دیا گیا کہ وہ اب ہم لوگوں سے ٹیکس ملا کر لیں گے۔ ان کی بیٹی کوٹ بھلون بابی کرنٹریوں کے سے رنگ و ڈھنگ اختیار کر کے لوگوں کو ٹرے میں کھانے پر جاتا کر دیا کرے گی۔ انکی ماں کی فریخت۔

ہے اور ایسی کمائی جس گھر میں آئے، اس گھر والوں پر بھی لحت ہے۔ اسی ان کے طعنوں پر بہت روٹی تھیں۔ مجھے ان کے رونے پر شدید غصہ آیا تھا۔ جب ہم بہن بھائی بھوک سے تڑپ رہے تھے۔ جب ہمارے گھر کا چولہا بند پڑا تھا، جب مالک مکان کرنا دینے پر دیکھیں پر دیکھیاں دے رہا تھا اس وقت کہاں تھے یہ رشتے دار۔

میں نے ان لحت پیچھے والوں پر جوابی لحت بھیجی اور اپنی جاب میں معروف ہو گئی۔ میرے لئے قیامی یہ جاب پہلی دلی جاہ سے زیادہ اچھی ثابت ہوئی۔ اللہ نے مجھے ترقی اور عزت بھی دے دی ہے۔“

وہ اپنی بات کے اختتام پر خوشگوار سے انداز میں سکرانی تو بے ساختہ ہی میرا دھیان اس کے کچھ دیر پہلے کے خاموش خاموش اور بیزار سے انداز کی طرف چلا گیا۔ اس نے اپنی ساری گفتگو کے بعد اب مجھے اس بارے میں پوچھا برا نہیں لگا، لہذا میں فوراً ہی اس سے اس بارے میں پوچھنے کی۔ وہ میرا سوال سن کر سکرادی۔

”کچھ خاص بات نہیں یاد آ رہی۔ پوچھیں تو میں نہیں ہو سکتی تھی۔ مضبوط اعصاب کے حامل لوگ بھی تو کبھی کبھار کسی چھوٹی سی بات پر پیشان ہو سکتے ہیں۔“

اس نے بیٹے سے جواب دیا اور پھر مجھے اس بارے میں تجسس دیکھ کر خود ہی اپنی ٹینشن کی وجہ بتانے لگی۔

”ہمارے پاس آنے والے اکثر لوگ بڑے کمے اور مذہب قسم کے ہیں۔ زیادہ تر سکمز اور ٹیچرز اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، لیکن ان ہی ٹیچرز اور مذہب لوگوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار کچھ بے ہودہ کمے کے لوگ بھی آ جاتے ہیں۔

ایسے ای آج کل ایک فنل سلاز کا وہاں آ رہا ہے۔ بہت قیمتی گاڑی میں، خوب مہنگا سامان ہاں ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھا کھا بھی گئے۔ لگتا تو یہی ہے کہ کسی اچھی بڑھتی سی میں دھڑکا ہو لیکن تعلیم اس نے ہندے کا کچھ نہیں لگاؤ۔ امیر ماں باپ کا یہ بھڑا ہوا بیٹا آج کل مجھے بہت پریشان کر رہا ہے۔ دینے تو خیر اس طرح کے لوگوں کی میں پڑھ نہیں کرتی۔

ہمارے ہاں سکریٹری کا انتظام بھی بہت اچھا ہے لیکن اس ہندے سے ریسٹورنٹ میں آ کر خوب بگاڑ کیا۔ شراب پی ہوئی تھی اس نے اور شراب کے لئے میں اس نے وہاں جوڑ جوڑ بھڑا اور بگاڑ کیا تو پھر فورٹ پولیس بلائے تک پہنچی تھی۔

اسنے لوگوں کے سامنے وہ میری طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں لیکن یہ میری محبت کا جواب محبت سے نہیں دیتی۔ اسنے سارے لوگوں کے سامنے مجھے اسی بات پر بہت شرمندگی ہوئی۔ حالانکہ بعد میں

ہمارے سبٹر نے مجھے ہلا کر اپنی قتل دی تھی اور گھبراہٹ میں اس واقعہ پر پریشان نہ ہوں۔ ریسٹورنٹ میں، میں ہر طرح محفوظ ہوں اور یہاں سے باہر بھی مجھے گھر تک پہنچانے ریسٹورنٹ کی گاڑی ہی جاتی ہے اور میں بھی اس طرح کے لوگ صرف اس طرح کی ہلا بازی ہی کر سکتے ہیں۔ ان سے ڈرنا بالکل بھی نہیں چاہئے۔“

وہ ساری بات بتاتے ہوئے خاموش ہوئی، تب میں بھی اس کی طرف یونہی خاموشی سے، تجسس سے انداز میں دیکھتی رہی۔

”اس طرح کی باتوں پر میں پریشان نہیں ہوتی۔ تو یہ ابھی تازہ زہر کی سی کا واقعہ ہے اس لئے تمہیں میں ابھی ہوئی تھی ہوں۔ ایک دو روز کے بعد میں اس بات کو سرے سے بھول ہی چکی ہوں گی۔“

وہ ایک مرتبہ پھر دی ہنسی سکرانی ہوئی صائر علی کی۔ پھر اس روز کے بعد سے میری صائر سے بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی اور اس دوستی کا سبب اس کی بہن بہادری اور دھڑلہ سی تھی۔ زندگی میں تنگیوں تو بہت سے لوگ اٹھاتے

ہیں۔ لیکن ہر کوئی ان تفتیش کو اتنے حوصلے سے مت ہے برداشت نہیں کرتا جتنا وہ لڑکی کرتی تھی۔ وہ کہیں بھی خود پر ترس کھانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس سے ملنے والا کوئی بھی فرد یہ اندازہ لگا ہی نہیں سکتا تھا کہ بظاہر یہ فنی اور کھٹکھٹائی لڑی اپنے دل کے اندر کتنے غم اور کتنے آنسو چھپائے ہوئے تھے۔ اس سے مجھے بہت کچھ سکھایا تھا۔ بہت حوصلہ، بہادری، زندہ دلی۔ وہ زندگی سے خوش تھی، اسے زندگی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ حالانکہ وہ ابھی بھی بہت سے مسائل کا شکار تھی۔

اس سے چھوٹی B.Sc. کرنے کے بعد ایک اسکول میں پڑھانے لگی تھی۔ لیکن وہ اپنی نخواستہ خود اپنے آپ پر ہی خرچ کر لیا کرتی تھی۔ ساتھ یہ پبلک گسٹس اسکول کی طالبہ تھی تو اب چار افراد کی تھی۔ وہ انہیں بہت اچھی تعلیم دلا رہی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے بھائی کی خوب ساری تعلیم حاصل کریں۔ یوں اس کی جدوجہد ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

ساتھ سے کیا، میری مایوسیاں اور زندگی سے شکایتیں سکری ختم ہو گئیں۔
آنے والے دنوں میں اللہ تعالیٰ نے میرے پارکو کو مزید ترقی عطا کر دی تھی، اکیلے لوگوں کے دوش سے نمٹنا میرے لئے مشکل ہونے لگا تو میں نے شفقت اور ہندہ کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔ وقت دے پاؤں گزرتا چلا گیا تھا۔ اب مرکز دیکھو تو کل کی بات لگتی ہے حالانکہ پورے پانچ برس ہو گئے ہیں مجھے اپنے پارکو کو چلاتے ہوئے۔ ان گزرتے برسوں میں ای کی صحت میں خراب ہو گئی تو انہیں مجھ پر چھوڑ دی گئی۔
گئی بات تو یہ تھی کہ اب ان کے چاب کے بغیر بھی جارا گزرا بہت، ابھی طرح ہو سکتا تھا، اسی لئے میرے سنبھالنے پر وہ خاموشی سے میری بات مان گئی تھی۔

☆☆☆

میں حرم کو ساتھ لے کر قریب داریکٹ سے سینے بھر کا سودا لینے آئی ہوئی تھی۔ وہ سارے کام جو پہلے ای کیا کرتی تھیں میں نے ازخود اپنے ذمے لے لئے تھے۔ اب آکر ای کے بغیر ہی کسی نہ کسی بہن کو ساتھ لے کر داریکٹ آ جایا کرتی تھیں۔ پار میرا گیارہ بیچے سے پہلے نہیں کھتا تھا اور صبح آتے تھے کسی خاص لوگ آتے تھے نہیں تھے، اسی لئے مجھے جرحی کام کرنا پڑتا، میں اسے صبح ہی منڈالائی کرتی تھی۔ خریداری سے فارغ ہو کر میرا کھلی کا صلح کر دیتے ہوئے گھر واپس جانے کا ارادہ تھا۔ داریکٹ سے خریداری کر کے میں نے بینک کی طرف سے جانے والی سڑک پر چھپے ہی گاڑی موڑی، پیچھے سے آنے والی ایک بمبیر نے بڑی زوردار کرکری آٹو کو مارا۔ شہر کھار کوئی حادثہ پیش ہوا تھا۔ مجھے اور حرم کو کوئی پتہ نہیں تھا، البتہ میری چھوٹی سی آنسو ابھی خاموش رہی ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اتر کر بمبیر وہیں بیٹھنے اور دونوں لڑکوں کے پاس پہنچتی، وہ میرا ارادہ بھانپ کر فوراً ہی تیز رفتاری سے سیٹل توڑتے گاڑی بھاگے گئے تھے۔

میرا ان سے ٹھیک ٹھاک بھگڑا کرنے اور اپنا نقصان وصول کرنے کا ارادہ تھا اسی لئے میں نے ٹریفک رکتے اور پیچھے سے آنے والی گاڑیوں کے مسلسل بارن دینے کے باوجود بھی گاڑی سچ مرکز پر روک دی۔ لیکن جیسے ہی انہیں بھاگتے دیکھا تو میں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ گاڑی نقل پینہ میں ان کے پیچھے دوڑائی شروع کر دی۔

”باپ کی کمانی پر پیش کر رہے ہیں اور باپ کے پاس کوئی ٹھکانہ کی اور محنت کی کمانی سے آئی ہوگی یہ مجھ پر۔ محنت سے کمایا ہو تو درجہ بھی ہو۔“

میں نے پاؤں آواز بلند کر کے صفحہ کا اظہار حرم سے کیا۔ ایک نظر میں ہی میں دیکھ چکی تھی کہ وہ دونوں لڑکے اظہار انش سال سے زیادہ عمر کے نہیں تھے باپ کا پیسہ، باپ کی گاڑی۔ اس طرح کی پڑوسی ایسے ہی لوگوں کو ہوتی ہے۔ حرم مجھے ان لوگوں کے پیچھے سے بھرے اعزاز میں گاڑی دوڑاتے دیکھ کر کھٹکھٹائی ہوئی بیٹھی تھی۔

”چھوڑیں نا چلیا جانے دیں۔“ وہ دوڑتے دوڑتے آہستہ سے مجھ سے بولی تو میں نے ایک تیز نگاہ اس پر ڈالی۔

”تم اپنی چانچ بندھو۔“ اسے ڈانٹ کر میں نے دوبارہ اپنی نگاہیں ان کے تعاقب میں مرکوز کر دی تھیں۔ مجھے وہ مسلسل اپنے پیچھے آتے دیکھ کر کچھ پرکھلا تھے اسی لئے گاڑی میں روئے سے نکال کر ہانپی مکانات کی گھیس کی طرف موڑ دی۔ ایک گلی میں وہ سڑے تو ان کے پیچھے میں نے بھی اسی گلی میں گاڑی موڑی۔ میری بہت کوششوں کے باوجود بھی وہ لوگ مجھ سے بہت آگے تھے، اس لئے میں صفحہ کے ساتھ ساتھ جھلکناٹ اور کوفت میں بھی جھلکا ہونے لگی اور اسی جھلکناٹ میں میری پیٹھ فخرناک حد تک تھرتھرتی ہوئی۔ بے احتیاجی اور صفحہ کی شدت کے سبب ٹرن کرتے ہی میری گاڑی سامنے سے انتہائی مناسب رفتار سے آئی، اس بالکل نئے بالکل سٹور بلیک ٹرکی کو پانا سے ٹکرائی تھی۔ کوکر میں نے فوراً ہی بلیک پر پاؤں رکھ دیا تھا، لیکن چرچری رکتے رکتے ہی میری گاڑی اس سامنے والی گاڑی سے ٹکرائی۔

سامنے ٹوپیوٹا میں بیٹھا بندہ بھی کوئی میرا بھائی بندہ ہی تھا۔ اسی لئے فوراً ہی بڑے صفحہ سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اتر اٹھا۔ حالانکہ اس کی گاڑی بالکل سچ سلامت تھی۔ اس مصیبت سے بچنا چھڑانے کے لئے میں خود بھی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ باہر تھکے ہی چھپے ہی میں نے اپنی طرف بڑے صفحہ سے آتے اس بندے کو بغور دیکھا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔

”نعمان خادرا“ میرے ہونٹوں سے بے آواز اس کا نام نکلا تھا۔ وہ جو گاڑی کا دروازہ دھماکے سے بند کرتا بڑے صفحہ سے میری طرف بوجھا، مجھے دیکھنے کے ساتھ ہی اس کے صفحہ سے تاثرات فوراً ہی غائب ہو گئے۔ ”اس قسم کی ڈرائیونگ کی امید میں آپ سے ہی کر سکتا تھا۔ بغیر آپ کی طرف دیکھنے بھی گاڑی کی پیٹھ دیکھتے ہوئے میرے دل میں یہی بات آتی تھی کہ جو کہیں بھی خاتون ہیں تیرو ڈاک کے سے انداز میں ڈرائیو کر رہی ہیں۔“ وہ میرے پاس آ کر کھڑک کر سکرنا سے ہونے لگا۔ میں نے اعتقاد سکرنا کی کوشش کی تو تھی، لیکن باوجود کوشش کے بھی میرے لبوں پر ہلکی سی بھی سکرنا نہیں آ سکی۔

”آپ ہی جیسے شاکر ہوئے ہیں جو اساتذہ کا نام روشن کرتے ہیں۔ کبھی کوئی آپ سے پوچھے کہ آپ نے گاڑی کس سے چلائی تھی تو ازراہ ہمارے میرا مینہ راز میں ہی رکھنے گا۔“ وہ کچھ شرارتی سے انداز میں سکرناٹ لبوں پر روکتے ہوئے بولا۔ ”لوگوں میری ساری محنت خالص ہو گئی۔“

اب اس کا کچھ بہت دکھ بھرا تھا۔

”وہیے ہو کیا ہے آج کل۔ وہی بیوی پارلری چلا رہی ہیں یا کچھ اور کر رہی ہیں۔“ اس نے خود ہی موضوع تبدیل کر دیا۔

”ہی وہی پارلری چلا رہی ہوں۔“ میں نے بہت تنبیہ کی اور صاف بتا دیا، بغیر چہرے پر مسکراہٹ لائے۔

”آپ ٹھیک تو رہیں اسے انہوں۔ کافی عرصے بعد آپ سے ملاقات ہوئی۔“ وہ یوں بولا گویا ہم دونوں اس سے پہلے بھی آپس میں کافی دوستانہ انداز میں ملے رہے ہوں۔

”میں خیر تھیں۔“ میں نے ایک مرتبہ بھر تنبیہ کی ہے جواب دے کر خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اصولاً تو مجھے اس سے معذرت کرنی چاہئے لیکن وہ مصروف ضرورت سے زیادہ خوش اخلاقی اور بے تکلفی کا مظاہرہ کر کے مجھے بلاوجہ چڑا رہے تھے اسی لئے میں نے اپنی الغور معذرت کرنے اور شک سا انداز اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

”میں بھی آپ کی دعاؤں سے بالکل خیر تھیں۔“ میں نے ہوں اور ذرا نیچے اسکوٹ بھی آپ کی دعاؤں سے خوب اچھا حال رہا ہے۔“

میرے خیریت پوچھتے بغیر وہ خود ہی اپنی خیریت سے آگاہ کر رہا تھا۔ میں اب جلد سے جلد اس سے بیچھا جھڑانے کے بہرے میں تھی۔

”دیکھیں صرف ڈیڑھ سال میں اللہ نے مجھے کتنی کامیابی دی ہے۔ پہلے صرف گھنٹن میں تھا میرا ڈرائیونگ اسکول، اب میرا ڈرائیونگ سارا گھر میں بھی میرے اسکول کی پانچ بج کر کھل گئی ہیں اور اللہ اللہ سے تینوں ہی جگہ میرا اسکول خوب اچھی طرح چل رہا ہے۔“

اسے میری بیزار نظری نہیں آ رہی تھی۔ وہی خوشی خوشی وہی اعلیٰ طرح سے سب مجھے بتا رہا تھا۔ اپنے والدین سے اس نے اپنا ڈرائیونگ کارڈ نکال کر میرے ہاتھ میں پکڑا لیجئے میں نے بے دلی سے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

”اس میں میرے تینوں سکولز کے ایئر میسر موجود ہیں اور میرا موبائل نمبر بھی ہے۔ کبھی کوئی کام ہو تو مجھے کہئے گا، مجھے خوشی ہو گی۔“

وہ داییں اپنی گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ میں شکر کا سانس لیتے جلدی سے گاڑی میں بیٹھنے کی تھی اور پھر اس سے بھی پہلے گاڑی نکالت کر کے وہاں سے روانہ ہو گئی تھی۔ بیک جانے کا تو میرا مودومتم ہو چکا تھا اس لئے گاڑی گھر جانے والے راستے پر ڈال دی تھی۔

”ایسا یا آپ کے انسٹرکٹر تھے نا۔ اسی سے آپ نے گاڑی چلائی تھی کبھی؟“ حرم مجھ سے پوچھنے لگی۔

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر گردن ہلا دی تھی۔

”آپ ان سے اتنے روز پڑھتے سے کیوں ملیں۔ وہ بے چارے کتنی خوش اخلاقی سے آپ سے بات کر رہے تھے۔“ حرم نے گویا مجھے میری بد اخلاقی اور بد ہمتی سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

”ناوہ بے چارے ہیں اور نا ہی اتنے با اخلاقی اور نامرمت۔ ان مردوں کو تمام تر اخلاقیات اور خوش اخلاقی، خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر ہی یاد آتی ہیں۔ میری جگہ کوئی عرصہ بدو اور عامی شکل صورت کی خاتون ہوتی

جنہوں نے ان سے گاڑی چلانا سیکھی ہوئی ہے ان کے ساتھ کبھی اتنے ہی اخلاقیات دکھاتے تو میں باقی۔ میرے روکے اور سرد و سٹ انداز پر تو ان کا یہ حال تھا اگر جو میں تنویرا سا مکی اخلاقی بھگارد بنی تو حضرت بالکل ہی ریشہ مندی ہو جاتے۔“

میں نے ایک نظر حرم پر ڈال کر اپنے خیالات کا تفصیلی اظہار کیا۔

”خیر اس طرح کے کوہہ بالکل بھی نہیں لگ رہے تھے۔ ان کے دیکھنے اور بات کرنے کا انداز بھی بہت مہذب سا تھا۔“ اس نے مجھ سے فوراً ہی اختلاف کیا تھا۔

”حرم لی لی ابھی آپ بگ ہیں۔“ کالج کی دنیا سے ابھر کر ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔ یہ مردوں کی قوم تھی خبیث ہے اس سے ابھی آپ آگاہ ہی نہیں ہیں۔“ میں نے جواب اس کا مذاق اڑایا تو وہ ہراسنے والے انداز میں خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔

جس شخص کے بارے میں، میں نے رائے دی رہی تھی اس سے میرا واسطہ کو بہت ہی مختصر عرصے کے لئے رہا تھا۔ لیکن اس مختصر عرصے میں بھی میں نے اسے بہت مہذب اور شائستہ سا انسان ہی پایا تھا۔ کبھی کوئی غیر شائستہ یا غیر مہذب انداز اختیار کرتے، میں نے اسے نہیں دیکھا تھا، لیکن پھر بھی صرف بارہ دن کسی بھی انسان کو اچھا یا برا قرار دینے کے لئے بہت ہی کم ہیں۔

یہ اب سے ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے جب میں پہلی مرتبہ نعلیان خادہ سے ملی تھی۔ ہمارے ایک بزنس نے اپنی آنکھ کھلی گاڑی خریدنے کا ارادہ کیا تو ان کی آنکھوں میں نے خرید لی۔ گاڑی تو خرید لی تھی مگر چلانی ہم بہنوں میں سے کسی کو کبھی نہیں آتی تھی۔ جب میں پہلی مرتبہ نعلیان خادہ کے ڈرائیونگ اسکول میں گئی تو رپشن پر موجود صاحب سے میری اس بات پر کالی بحث و بھڑک ہوئی تھی کہ مجھے آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کا نام چاہئے۔

اس کا کہنا تھا کہ صبح کے وقت تمام انسٹرکٹرز مصروف ہیں مجھے شام چھ بجے کا نام مل سکتا ہے۔ آسانی سے فائل ہو جانا اور مردوں کی سمجھ بوجھ لینا تو میں نے سیکھا ہی نہیں ہے، اسی لئے میں خواہناؤں اس بندے سے الجھ رہی تھی۔

میرے پیچھے ایک کمرے کا دروازہ کھلے اور بند ہونے کی آواز آئی تھی۔ میں اپنی بحث و بھڑک میں مصروف تھی میں نے اس بات پر مانتی کوئی خاص توجہ دی نہیں تھی۔

”آپ صبح کا نام کون کھنا چاہتی ہیں؟“ میرے برابر میں آکر کھڑا ہو جانے والا وہ بندہ سولہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے چونک کر اپنے برابر میں کھڑے اس شخص کو دیکھا تھا۔ اپنے حلیہ، شکل و صورت اور گفتگو کے انداز سے وہ بہت مہذب اور پڑا کھلا انسان لگ رہا تھا لیکن میں پھر بھی اس ”تو کون، تو خواہناؤ“ والے انداز پر چڑی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں اپنی عادت کے مطابق کسی بدتمیزی اور تنہا چھٹ پنے کا مظاہرہ کر سکی اس نے اپنا تعارف کر دیا۔

”میں نعلیان خادہ ہوں۔ اس ڈرائیونگ اسکول کا انور۔ کافی دیر سے آپ لوگوں کی Argument من رہا تھا۔ آئیے آپ میرے ساتھ، میں آپ کا مسئلہ کر دیتا ہوں۔“

دیکھیں پھر کمرے اس سڑیل مزاج بندے سے مجھ سے جان چوٹ جانے پر گہری طمانیت بھری سانس لی تھی۔ میں اسے گھر کر دیکھتی ہوئی نعلیان خادہ کے ساتھ اس کے آفس میں آکر بیٹھ گئی تھی۔

میں نے ایک نظر حرم پر ڈال کر اپنے خیالات کا تفصیلی اظہار کیا۔

”خیر اس طرح کے کوہہ بالکل بھی نہیں لگ رہے تھے۔ ان کے دیکھنے اور بات کرنے کا انداز بھی بہت مہذب سا تھا۔“ اس نے مجھ سے فوراً ہی اختلاف کیا تھا۔

”حرم لی لی ابھی آپ بگ ہیں۔“ کالج کی دنیا سے ابھر کر ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔ یہ مردوں کی قوم تھی خبیث ہے اس سے ابھی آپ آگاہ ہی نہیں ہیں۔“ میں نے جواب اس کا مذاق اڑایا تو وہ ہراسنے والے انداز میں خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔

”ڈرائیونگ اسکول آج کل چپے چپے پر کھلے ہیں۔ میں تو صرف آپ لوگوں کی اچھی شہرت سے حائر ہو کر یہاں آگئی تھی۔ لیکن انہوں نے آپ کے ہاں تو ریکشن پر اتنے غیر پیشہ ور اور بدیزخ افراد موجود ہیں۔ مجھے بہت ہاپسی ہوئی یہاں آکر“

میں نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے ہی بدلنا اپنی پابندی کی کا اظہار کیا۔ اس نے میری تنقید بہت سنجیدگی اور بردباری سے سنی اور چہرے پر کسی قسم کے ناگوار تاثرات کو بھی نہیں آنے دیا۔

”آپ صبح میں ہی سیکسٹا جا رہی ہیں تو پمپس ٹھیک ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح اس کا بندوبست کر دوں گا۔ اصل میں آج کل جون جولائی کی چھٹیوں کی وجہ سے پمپس والوں کا کافی رش ہے۔ اکثر سٹوڈنٹس چھٹیوں میں ڈرائیونگ سیکھنے کے لیے ہی وہاں سے تقریباً تمام انٹرکسٹرکشنز مکمل طور پر بند ہیں۔“ وہ اس وسیع و عریض میز پر اپنے بالکل سامنے کبھی ڈائری کو کھول کر اس میں سے صفحے پلٹ پلٹ کر کچھ دیکھنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا ”10,9 بجے ٹھیک رہے گا۔“ اس بات پر میں نے ہلکی سی سر ہلایا۔

”مجھے بھی ناگم سوٹ کرتا ہے۔ میرا اپنا بیوی پار ہے۔ میں صبح کا ہی ڈنم رکھنا چاہتی ہوں تاکہ میرے کام میں کوئی پریشانی نہ ہو۔“ وہ بچے کا نام رکھا تو خواہ مخواہ رینکشن میں جھڑکوں کی، ڈرائیونگ سیکھنے کے زیادہ میری توجہ پار اور اسے کلائنٹس کی طرف ہوجاے گی۔

فعل اس کے کہ میں اسے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے نکلی ہوئی، اس نے کچھ سوچتے ہوئے مجھے رینکشن سے فارم لے کر کمرے اور فیس جمع کروانے کے لیے کہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے صدفرت کر لے گا، ڈرائیونگ اسکول بہت، میں نہیں اودے سے سیکھ لو گی۔

”آپ فارم بھر کر باہر کاؤنٹر پر فیس جمع کروادیں۔ کل صبح آپ کی پہلی کلاس ہو گی تیار رہئے گا۔“ اس نے بات ختم کرنے والے انداز میں گویا مجھے وہاں سے چلے جانے کو کہہ دیا۔ میں نے ایک دہی سا جھٹک کر کہہ کر وہاں سے اٹھ کر باہر کاؤنٹر پر آکر فیس جمع کروادی۔

اگلے روز صبح ٹھیک آٹھ بجے وہاں سے گھوڑے گیٹ سے باہر ایک گاڑی کا ہارن بجایا۔ گیٹ سے باہر نکل کر میں نے چھپے ہی گاڑی میں بیٹھے اپنے اسٹرکٹر کی طرف دیکھا تو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے سلمان خاد کو دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی تھی۔ آنکھوں پر گمن گمن چڑھا حادہ گردن سوڈ کر گیٹ کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر اس نے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ مجھے اس کے خود آنے پر حیرت تو ہوئی تھی، لیکن میں نے اسے ظاہر بالکل بھی نہیں ہونے دیا تھا۔ بہت سنجیدگی سے اسے سلام کرتی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”جب میں نے نانا اپنا ڈرائیونگ اسکول شروع کیا تھا اس وقت میرے پاس انٹرکسٹرکشن بہت کم تھے اسی لئے میں خود بھی ڈرائیونگ سکھایا کرتا تھا۔ لیکن اب کیونکہ میرے پاس انٹرکسٹرکشن کا تعداد میں موجود ہیں، اس لئے میں جینٹل دیکھتا ہوں۔ لیکن آپ کیونکہ میرے اسکول کی اچھی شہرت سے حائر ہو کر وہاں آئی ہیں تو مجھے آپ کو بایوں کر نا اچھا نہیں لگا۔“

مجھ سے پوچھتے پھر اس نے خود ہی بڑی سنجیدگی سے اپنے آپ کی وجہ بتائی۔

”پمپس اب ہم اپنی کلاس شروع کرتے ہیں۔“

میری طرف دیکھ کر غصے سے انہیں غصے میں چاہی تھا تاہم وہاں بارہ گویا ہوا۔

میں روزانہ اس سے ڈرائیونگ کی کلاسز لینے لگی تھی وہ میرے اعتماد کی بہت تعریف کرتا، لیکن ایک ایسی بات تھی، جس پر ہر روز وہ مجھے ٹوکتا اور ہر روز میں اس نصیحت کو سننے کے بعد فوراً ہی بھول جاتی تھی۔ اسٹرکٹ سسٹم سے لے کر پمپس کا ہونا تھا میرا ایک دم سے دل گاڑی کو بہت تیز تیز دوڑانے کو چاہنے لگا اور میں بے سوچے سمجھے رفتار بڑھا دیا کرتی۔

”آپ کا کیا مستقبل میں بس ڈرائیونگ بننے کا ارادہ ہے؟“

چوٹی کلاس کے اختتام پر جب اس روز میں نے گاڑی کو انتہائی تیز رفتاری سے چلائے ہوئے اپنے گیٹ پر لاکر وہ تو اس نے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے پوچھا۔ ”یقیناً کریں۔“ آپ کے گاڑی چلانے کا انداز بالکل نئی بسوں اور کوہڑے ڈرائیوروں جیسا ہے۔“ اس نے بہت مہذب سا انداز اختیار کر کے مجھ پر طنز کرنے کی کوشش کی۔

اپنی جگہ ہوئی بات پر وہ خود ہی محفوظ سے انداز میں ہنس رہا تھا، ابھی اسے مسکراہٹ میرے لیوں پر بھی بکھری تھی۔ ”اور یہ بات بھی سچ ہے کہ اس طرح کی ڈرائیونگ آپ کو کوئی خاتون انٹرکسٹرکشن بھی نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ یہ ٹیک ٹائی میرے ہی نامہ اعمال میں کبھی تھی۔“

اس نے انہوں میرے انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے گاڑی شارٹ کر دی۔ اور میں بھی گیٹ کھول کر اس کے کھسک کے بارے میں ہی سوچتے ہوئے گھر کے اندر آگئی۔

پھر اس روز شام میری فوین یا صوفی کلاس تھی جب ایک روڈ پر سڑک کے پچھون چچ ایک بس کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے ٹریفک جام ہو گیا تھا اور اس ٹریفک جام میں ہم لوگ بھی پھنس گئے تھے۔ ہارن کا شور پر باقاعدہ سب لوگ ہلچل مچا رہے تھے۔ حالانکہ اس ایکسیڈنٹ میں وہاں ہم پہنچے ہوئے لوگوں میں سے کسی کا بھی قصور نہیں تھا، لیکن لوگ بے مہربانی اور جلدی سے جلدی اپنی منزل پر پہنچنے کی دھن میں خواہوا ایک دوسرے سے جھڑپ رہے تھے۔ اتنے دھن دھن میں، میں بھی کمرہ زبردست ہوئی تھی۔ حالانکہ میرا میں بیٹھے اپنے اسٹرکٹر کی وجہ سے مجھے کسی قدر اطمینان تو تھا، لیکن آج بھی مجھے سے بچتے ہارن اور لوگوں کی چیخ و پکار نے مجھے بھی کمرہ زبردست کر دیا تھا۔ ہماری گاڑی اتنی جلدی طرح پھنسی ہوئی تھی کہ وہ میرے سے بجائے خود ڈرائیونگ سیٹ پر نہیں آسکتا تھا۔ گوکہ گاڑی کا کنٹرول تو اس کے پاس بھی تھا لیکن اسٹرکٹر تو میرے ہی ہاتھ میں تھا۔ وہ بہت پر سکون اور نابل تھا۔ مجھے مسلسل گائیڈ کرتا اور سمجھاتا، اس نے اسٹرکٹر پر ہاتھ رکھ کر گاڑی کو تھوڑا سا خود بھی کنٹرول کرنے کی کوشش کی تو میں نے فوراً ہی اسٹرکٹر پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ حالانکہ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے بہت دور تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے اپنا ہاتھ جلدی سے اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔

وہ میری طرح بالکل توجہ سجتے تھے اس کی توجہ گاڑی اور اسٹرکٹر کی طرف تھی لیکن میرے اس طرح ایک دم سے ہاتھ ہٹانے پر اس نے بہت چونک کر مجھے دیکھا۔ صرف ایک لمبے کے لئے مجھے غور دیکھنے کے بعد اس نے اپنی نگاہیں واپس ہٹائی۔ میں نے اس کی نگاہوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس رش میں سے گاڑی نکلی تو اس نے اپنا

ہاتھ سترنگ پر سے ہٹا لیا اور پرسکون سے انداز میں سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اس کے ہاتھ جھانپنے پر میں نے دوبارہ اپنا ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھ لیا تھا۔

”بہت اچھا چانس مل گیا آج کرش میں سے گاڑی نکالنے کا طریقہ سمجھنے کا۔ جو کراچی میں ڈرائیو کر سکتا ہے وہ دنیا کے کسی بھی ملک اور کسی بھی شہر میں ڈرائیو کر سکتا ہے، یہ بات یونی یونی نہیں جانی جاتی آپ کو کراچی میں ڈرائیو کرنا ہے تو اس طرح کے حالات اور واقعات سے آپ کو اکثر گزرنا پڑے۔“

اس نے کچھ دیر پہلے کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

اس آخری کلاس کے بعد میری دوبارہ بھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اور آج جب ڈیڑھ سال بعد وہ مجھے دوبارہ ملا تو میں اس کے خود کو پہچان لینے اور نام کے ساتھ یاد کرنے پر بہت حیران ہوئی۔ کتنے لوگ آتے اور جاتے ہوں گے، اس کے ڈرائیونگ اسکول میں ڈرائیونگ کیجئے کے لئے۔ ان میں سے کسی کو نام کے ساتھ یاد رکھنا اور وہ بھی اسے دوسرے بعد۔ میں اس بندے کی اب بھی یادداشت پر حیران تو ضرور ہوئی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ مجھے اس کا بلاوجہ شکوکہ کرنا اور فری ہونا بھی پسند نہیں آیا تھا۔ آئندہ بھی ان صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے میرے ساتھ خوش اخلاقی دکھانے کی کوشش کی تو میں ان کا مزاج درست کر دوں گی۔ آج کے واقعہ پر میں نے دل ہی دل میں خود سے کہا تھا۔

☆☆☆

ای کو دو تین دنوں سے کافی شدید کھانسی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹروں کے پاس جانے کی تو وہ ہمیشہ سے چورھیں اسی لئے کھانسی کی دوا میڈیکل سٹور سے منگوا کر اپنا علاج خود ہی کر رہی تھیں۔ میرے بہت کہنے سننے اور ناراض ہونے پر وہ آج میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنے کے لئے تیار ہوئی تھیں۔

”ذرا می کھانسی ہی تو ہے۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے گی مجرد تو میں باقاعدگی سے لے ہی رہی ہوں۔“

وہ جانے کے لئے دل سے ابھی بھی آمادہ نہیں تھیں بس صرف میری جبر سے مجبوراً مان گئی تھیں۔ میں نے اپنے مخصوص انداز میں گاڑی دوڑانی شروع کی تو ای دل پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

”کتنی بار تمہیں سمجھا ہے تیرا گاڑی آہستہ چلایا کرو۔ کبھی کبھی لڑکی کو بس ڈرائیو کر کے سے انداز میں گاڑی چلائے دیکھا ہے۔“

میں نے ان کی ڈانٹ پر فوراً ہی گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ لیکن یہ ای کی وہ واحد نصیحت تھی جو میں روز بھر اور روز بھر مل جایا کرتی۔ ای کے بس ڈرائیو کر کہنے پر مجھے بے ساختہ انعام کے دیئے جانے والے کھسکے یاد آتے تھے۔

”شام میں پارلر تو ڈی دیر کے لئے تیار نہ کر دیتا۔ کچھ کھانا آئے والے ہیں۔“

کچھ دیر کے بعد ای نے بہت تنبیہ کی سے حکم دینے والے انداز میں مجھ سے کہا تو میں نے کسی قسم کے سوال جواب کے بغیر خاموشی سے سر ہل دیا، جب سے ٹائیپ کی ہمارے خالہ اور بھائی جہانگیر سے ملنے ہوئی تھی۔ جب سے ای کو میری فکر پہلے سے بھی زیادہ رہنے لگی تھی۔ مگر سال پہلے ٹائیپ کی جہانگیر کے ساتھ ملنے ہوئی تھی خالہ کا مگر نہ بہت اچھا تھا اور پھر جہانگیر بھی بہت اچھا اور پڑا کھانا لڑکا تھا اس لئے وہ رشتہ اور کو پسند تو بہت تھا، لیکن ٹائیپ کے لئے نہیں بلکہ

میرے لئے۔ اپنی سگی بہن سے ان کا اپنا کوئی تکلف بھی نہیں تھا، اسی لئے انہوں نے خالہ سے یہ بات کہی تھی کہ انہوں نے میرے بجائے ٹائیپ کا رشتہ کیوں مانگا ہے۔

”میرے لئے تو تیرہ اور ٹائیپ میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں ہی مجھے ایک جیسی عزت دیں۔ لیکن بات تو جہانگیر کی خواہش کی ہے۔ وہ ٹائیپ ہی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

خالہ نے ای کی بات کے جواب میں اپنی طرف سے صفائی پیش کی اور جہانگیر کی پسند کا حوالہ دیا تو وہ خاموش ہو گئیں۔ یوں ٹائیپ کی جہانگیر کے ساتھ ملنے ہوئی۔ اور ای میری شادی کے لئے پہلے سے بھی زیادہ مگرمگم۔

ابتداء میں، میں نے ای سے کافی جھگڑا دیا۔ ”جہانگیر پارلر نہیں تھا تو کیا تب ہم بھوکے سر پر تھے۔ جب پہلے اللہ نے عزت سے گزارا کر دیا تو اب بھی وہ کوئی نہ کوئی نکمیل پیدا کر دے گا۔ ٹائیپ کی پڑھائی مکمل ہونے والی ہے۔ حرم اور انٹینس ریسرچ میں کے بعد سائنس کرنا چاہیں گی تو کچھ ٹیچرز وغیرہ کر لیں گی۔ میں بھی کوئی معذور یا پالیا نہیں ہوگی۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ مجھے تمہاری شادی کی فکر ہے۔ ٹائیپ سے پہلے میں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

اس ایک سال کے عرصے میں بہت سے رشتے آئے تھے، کچھ کو ای نے رنجش کر دیا تھا اور کچھ نے ہمیں۔

☆☆☆

”تم ہمیشہ اس وقت نازل ہوا کرو۔“ میں نے پارلر میں آنے کے ساتھ ہی صابر کو گھور کر دیکھا تھا۔

”کل رات تپتی دیر سے فارغ ہوئی تھی میں۔ میرا خیال ہے دو توج ہی مجھے تھے۔ ذرا ہی دیر سوئی ہوں گی کہ صبح کا ٹام ہو گیا۔ اب تھوڑے سکون سے سو رہی تھی تو تم ٹیکہ پڑیں۔“

میں اسے صبح پارلر میں دیکھ کر ناراض ہوئی تھی۔ وہ میری ناراضی کے جواب میں کچھ بھی نہیں بولی۔ بس پچھنے سے انداز میں ڈرا سا سکر دی تھی۔

”اب جلدی پھوٹو کا کام کیا کروا تا ہے۔“

میں اس کی خاموشی پر صبراً نہ دیئے بغیر بوے پر فیشنل انداز میں بولی۔ خالص قسم کا رو باری اور پرفیشنل لیجو۔ میرا خیال تھا۔ وہ جبراً دوسرے جاکر کچھ کہے گی۔ لیکن جب وہ جواب میں کچھ بھی نہیں بولی تو میں نے اتنی دیر میں کبھی مرتبہ جوت کراں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے یہاں آنے سے پہلے بھی وہ بہت سارے جوت ہو گئی۔

”کیا ہوا صابر؟“ میں اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

”آج میں تمہارے پاس بیٹھ کر رونے آئی ہوں تیرا مجھے اس وقت رونے کے لئے ایک کنکرہ کی تلاش ہے اور تم سے بجز اور تم سے زیادہ ستر بھی مجھے نہ لگا۔“

میری بات کا جواب دیتے دیتے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

”مجھے پتہ ہے کہ تم سے اگر میں اٹھ دو کہوں تو تم اسے کچھ بھی کہو۔ آج صابر بہت تنہا ہے تیرا وہ اسے اپنے پاس بیٹھ کر روئے۔ وہ اگر نہیں روئی تو میرا دل پھٹ جائے گا۔“

وہ پتہ نہیں کس طرح کی باتیں کر رہی تھی۔ وہ زندہ دل اور خوش مزاج لڑکی تھی کہ بہت جلد ہی کسی کو چھٹی سی بات پر یوں دل پارہ بناتی۔ کوئی بڑی بات نہ ہوتی تھی، اس کی برداشت اور محبت سے بڑی جھڑپ نہ بکھرتی تھی۔

میں چپ چاپ ابھی وہ انداز میں اسے روٹے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ "میں زندگی سے لڑ رہی ہوں، کتنے برسوں سے لڑ رہی ہوں۔ لوگوں کے غلو، زندگی کی سختیاں پر بارگاہ بات خوشی خوشی ختم ہوتی رہی۔ کس کے لئے؟ ۱۹ یا ۱۸ ماں اور بہن بھائیوں کے لئے۔ بڑا آسان کام میرے لئے کہ میں انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر خود اپنے لئے کوئی بہتر فیصلہ کر لیتی۔ اس ریسٹورنٹ میں چاب سے بہت پہلے اس وقت جب میرا کردار لوگوں کی نظر میں مشکوک نہیں ٹھہرا تھا، میں اس وقت اپنے لئے کوئی فیصلہ کر چکی تھی۔ بہت لوگ تمہیں میری تصویر اور کردار کی منہ پھڑکی تھی، میں خود غرض ہوتی تو ایسا ہی کرتی۔ میرے پاس اعلیٰ تعلیم نہیں تھی، اس کے حامل کرنے کے مواقع بھی نہیں تھے ایسے میں یہ چاب میرے لئے بہترین چاب تھی اور اس ریسٹورنٹ میں چاب کس کے لئے کی تھی میں نے؟ اپنے ہی ان ہی لوگوں کے لئے کرتی رہی، انہی کے لئے جنہیں آج میرے اس کام سے نفرت ہو رہی ہے۔ میری چاب ان کے لئے شرمندگی کا باعث بن رہی ہے۔ میری بہن بھی یہ کہ اس کے لئے ایک بہترین مشرف میری وجہ سے ملے نہیں ہو سکا۔ لڑکے والوں کو یہ بات پتہ چل چکی تھی کہ لڑکی کی بہن ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں چاب کر رہی ہے۔ میری وہ بہن جسے میں نے پر حیا لکھا، اس کا قبل بنایا کراچ و خواتین کے کمانے کے قابل ہو گئی ہے۔ اسے میرے اور اپنے رشتے پر شرمندگی ہوتی ہے۔ میں اس کی خوشیوں کے سامنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوں اور میرا وہ بھائی جس کے کالج کی فیس اور پڑھائی لکھائی کے تمام اخراجات میری اسی چاب سے پورے ہوتے ہیں۔ اسے میری اس چاب سے شدید نفرت ہے۔ میں اپنے بہن بھائیوں کے لئے باعث ندامت ہوں۔ انہیں اس بات سے ڈر لگتا ہے کہ ان کے کسی جاننے والے کو یہ بات پتہ چل جائے کہ ان کی بہن ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں چاب کر رہی ہے۔"

وہ میرے گلے لگی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ میں بے بسی سے اسے روٹے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"دوسرے لوگ کچھ بھی کہتے تھے۔ میں پر دانی نہیں کرتی تھی لیکن وہ جن کے لئے میں یہ سب کچھ کر رہی ہوں، ان کی تحقیر بھری نگاہیں اور جب تک باتیں میں سہ نہیں پاری۔ میں نے کیا فائدہ کیا ہے نہ! اخراجات کی زندگی گزار رہی، کبھی کسی مرد کو اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ میرے پاس اعلیٰ تعلیم ہوتی تو کسی ایسی ہی جگہ ملازمت کرتی لیکن اگر ایسا نہیں ہو سکا تو اس میں میرا قصور کیا ہے؟ یہ لوگ مجھے جان ڈنکلیں کہ یہ جیسا؟" وہ میرے کندھے سے لگی روٹی رہی اور میں اس کا دکھ دل کی گھرائیوں سے محسوس کرتی ہوئے ہوئے اس کے بالوں میں اٹھایاں چلاتی رہی۔

"تجھ میں نے امیر زادے کے بارے میں بتایا تھا تاہم وہ وہ جو بتا تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔ پتہ ہے ایک روز میں نے اس سے کیا کہا تھا؟" وہ میرے کندھے پر سے ہٹ کر سیدھے ہوتے ہوئے بولی۔ میں نے سوا لیکھا تو اس نے اس کی جانب دیکھا۔

"میں نے اس سے کہا کہ اگر تمہیں مجھ سے ایسی ہی شدید محبت ہو گئی ہے تو پھر شریف لوگوں کی طرح میرے گھر رشتہ بھگادو۔ وہ میری اس بات پر غصہ ہنسا تھا۔ اس نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا لیکن اس کے چہرے پر

صاف لکھا ہوا تھا، شادی اور تم سے؟ شادی تو میں کسی محوِ خاندان کی پڑھی لکھی لڑکی سے کروں گا۔ تم جیسی ریسٹورنٹ میں کام کرنے والی لڑکی کے ساتھ تو میں صرف دل باندھ کر رہتا ہوں۔ جب میں نے اس کی حقارت سے بھری ہوئی کسی کو نظر انداز کر دیا، لیکن آج مجھ کی وہ بھی اپنے چاروں جانب گونجتی ہوئی سنائی دے رہی ہے۔ ریسٹورنٹ میں کام کرنے والی لڑکی، لوگوں کو مسکرا کر مسکرا کر دیکھنے والی لڑکی؟ فرسے میں بیڑا، برگر، چکن، فرائز اور کولڈ ڈرنکس رکھ رکھ کر دینے والی لڑکی۔"

وہ ایک مرتبہ پھر چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی۔ میں اسے صاف سے دیکھے جا رہی تھی۔ میری کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح تسلی دوں، اس کے کھوں کا دوا کس طرح کروں۔

"سب لوگ اس طرح کے نہیں ہوتے سامعہ! صرف چند لوگوں کے غمی رویوں سے بدل ہو کر تم اس طرح کی باتیں مت سوچو۔ تم بھی اتنی اچھی ہو جتنی میں ہوں یا جتنی دوسری کوئی لڑکی ہو سکتی ہے۔"

وہ ابھی کی جن انتہاؤں پر پہنچی ہوئی تھی، میں اسے ان سے نکالنا چاہتی تھی۔ وہ میری بات سن کر طوفانِ انداز میں فحش دی۔

"تم مجھے یہ طفل تسلیم مت دو نہ! وہ مجھے چائوں کا سامنا کرنے دو۔ یہ بے کار کے دلا سے اور کتابی بات مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں کر سکتیں۔"

میں بے بسی سے اس کی طوفانی فحش کو دیکھ رہی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میری کوئی تسلی اور کوئی بھرپور بات اس کے کچھ کام نہیں آ سکتی۔

وہ میرے پاس بیٹھ کر رونے اور اپنے دکھ کہنے آئی تھی۔ میں اسے روٹا ہوا دیکھتی رہی۔ پھر وہ اپنے آنسو صاف کرتی ہوئی جانے کے لئے کھڑی ہو گئی تھی۔

"تمہاری دیر تک کاؤ سامعہ۔" میں اسے اس حالت میں جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ انکار میں سر ہلاتی پارک کار دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی۔

"تم پریشان مت ہو، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ میرے چہرے پر پھیلی تنویر اور گہر مندئی کو دیکھ کر دھیمے فہمی۔ ایسی جہش میں اس آنسوئی آنسو مجھ سے ہوتے تھے۔

☆☆☆

آج چاند رات تھی، اس لئے پارک میں شہر میں غیر معمولی تھا۔ میں، اور میری ہمپیر زہری طرح مصروف تھے۔ شام میں منیفہ باہمی اپنی بیٹی کے ساتھ آگئیں۔

منیفہ باہمی جب سے میں نے پارک شروع کیا۔ اسی وقت سے ہی آ رہی تھیں۔ ان کا گھر ہمارے ہی بلاک میں تھا۔ خود بہت سادگی سے دہشت تھیں۔ صرف اپنی بیٹی کے بالوں کی تنگ کے لئے وہ میرے پاس آتی تھیں۔ بہت اچھی اور کھلس خاتون تھیں۔ وہ سیر کی سادگی اور سادگت سے پاک۔ وہ میری بہت بڑی داد تھیں۔

اس وقت جب وہ آئیں تو میں نے مسکراتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ اس وقت پارک میں صرف ایک ہی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جو کھلتے سے بالوں کی تنگ کر رہی تھی۔ اس لڑکی کو فارغ کر کے میرا ایک ٹکڑا پار بند کرنے کا

ارادہ تھا۔ اندر مگر میں خال کی ٹپٹی، چاند کی عیدی لے کر آئی ہوتی تھی۔ مجھے تھوڑی دیر ان لوگوں کو بھی گنتی دینا چاہی۔
منہ بانی سے یہ کہنا کہ آپ مغرب کی نماز کے بعد آئیے گا مجھے مناسب نہیں لگا، اس لئے ان کی بیٹی کو کرسی پر بیٹھنے کا
کہہ کر خود ہی اس کی کنگ کے لئے کرسی کے پاس چائے لگی۔

"مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے یہ تو گفت فارغ ہونے ہی والی ہے۔ شہوار کی کنگ وہ کر
دے گی۔" انہوں نے گفت کے ہاتھ میں ہنر ڈال دیا کہ کہا میں بلاتی ہوئی ان کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھی تو وہ
بہت آہستہ آواز میں تنبیہ باندھتے گئیں۔

"لو بیٹے تو یہ بات مجھے تمہاری امی سے کرنی چاہئے تھی، لیکن پھر میں نے سوچا کہ یہ نہیں تم اس بات کو پسند
کر دو گی انہیں، اس لئے تم سے ہی بات کر لیتی ہوں۔"

وہ میرے بالکل قریب بیٹھ کر آئی آہستہ آواز میں بات کر رہی تھیں کہ پارلر کے دوسرے سرے پر موجود
گھنٹہ کو اس لڑکی کو اور ان کی بیٹی کو ان کی آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔

"آج میں تمہارے پاس آئی ہی اس لئے ہوں۔ یہ شہوار تو زبردستی لٹک کر ساتھ آ گئی ہے کہ مجھے کنگ
کر دانی ہے۔"

"یہ آقا ہے۔ میرا سا بھائی نہیں ہے لیکن مجھے سکوں سے بڑھ کر عزیز ہے۔ بہت اچھا اور بہت شریف لڑکا
ہے۔" انہوں نے اپنے پر س میں سے ایک تصویر نکال کر میرے ہاتھ میں چلائی۔ میں نے ایک نگاہ تصویر پر ڈالی، وہ
جو کوئی بھی تھا، بہت چمک رہا تھا۔

"مجھے بہن بتایا ہے اس نے اور صرف بہن کہتا ہی نہیں بلکہ بھتیجا بھی ہے۔ کافی سال پہلے اس کی والدہ
بھی حیات تھیں۔ میرے بڑے بیٹے کو یوش پڑھانے آتا تھا یہ ان دونوں۔ والدہ اس کے بچپن میں ہی انتقال کر گئے
تھے، بہن بھائی بھی کوئی نہیں ہیں۔ تب یہ خود بھی شاید اٹھ کر رہا تھا۔ ٹیوشن پڑھا کر یہاں وہاں چھوٹی موٹی نوکریاں کر
کے اپنی معذور اور بیمار ماں کا علاج کرنے کے لئے پھر جمع کرتا تھا، بہت ٹیک اور خدمت گزار۔ نہایت توجہ سے وہ
اپنی معذور ماں کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا کرتا تھا۔ اس کی سب ضرورتوں کا خیال رکھتا تھا۔ اس طرح میں نے کسی
لڑکے کو ماں کی خدمت کرنے نہیں دیکھا جس طرح یہ کرتا تھا، تب ہی سے اس کا ہمارے گھر آتا جاتا ہے۔ مجھے آج کہتے
کہتے اس نے بچ بچ مجھے اپنی بہن ہی مان لیا۔ والدہ کا انتقال ہو گیا تو یہ بالکل ہی تنہا ہو گیا۔ لی کام کے بعد ہی
اسے ایک فرم میں جاب مل گئی تھی۔ اپنی عورت اور بابت سے اس نے اپنی جاب میں بہت ترقی کر لی ہے۔ آج کل
ایک پرائیویٹ بیورو میں ایم پی اے بھی کر رہا ہے۔ صرف ایک سبسٹری باقی ہے اس کا۔ اس نے اتنی
خت اور اتنی مشکل زندگی گزار دی ہے کہ میرا دل چاہتا ہے اس کے لئے کوئی بہت فکس لیڈ لڑکی دھوڑ کر لاؤں، جو اس
کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں بھر دے۔ اس کے لئے لڑکی کو دھوڑتے ہوئے میرے ذہن میں سب سے پہلے تم
آ گئیں۔ تم جو خود بھی اتنی چھوڑ چھوڑے پھر وہ زندگی گزار رہی ہو۔ تم اسے دیکھی ہی بہت اور دیکھا سکون دے سکتی ہو جس
کا وہ مستحق ہے اور جو دوسری کوئی اور لڑکی شاید اسے نہیں دے سکتی۔"

منہ بانی کی نگاہوں میں میرے لئے غلوں کی غلوں تھا۔ اپنے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمیاں لاحق نہیں

تھیں۔ میں کسی شہزادہ گنگام کا انتظار نہیں کر رہی تھی۔ امی چاند کی شادی سے پہلے میری شادی کرنا چاہتی تھیں۔
انہیں دن رات میری شادی کی گھر بتاتی رہتی تھی، ایسے میں یہ ایک انڈیل رشتہ قہر سے لئے۔ امی نے مجھے یہ
بات نہیں بتائی، لیکن میں جانتی ہوں کہ اس سے پہلے میرے لئے جو جو بھی رشتے آئے یا تو وہ اس لالچ میں آتے
تھے کہ لڑکی خوب کما رہی ہے۔ ان کے بیٹے کو بیوی کے ذریعے معاشی استحکام سے لگا دی ان لوگوں کا لالچی امداد دیکھ کر
انکار کر دیا کرتی تھیں۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہوتی جو یہ دیکھ کر کہ لڑکی امی طور پر ذاتی متکلم ہے۔ یہ انہیں دان کے بیٹے کو کیا خاطر
میں لائے گی۔ مجھے رنجش تک کر دیا کرتے۔

ان کے خیال میں امی طور پر متکلم لڑکیاں شوہروں اور سسرالوں کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہیں۔ انہیں دبا کر
نہیں رکھا جاسکتا۔ انہیں کوئی دلی دہائی اور خاموشی سے طے نہیں والی لڑکی چاہئے جسے جیسے کانا آتا ہو۔ جو شہر کے
پیسے کی محتاج ہو۔ اس لئے میری شادی میں مشکل پیش آ رہی تھی۔

قریب تھا کہ میں منہ بانی سے یہ کہہ کر وہ اس بارے میں امی سے بات کر لیں ایک طرح سے انہیں اپنی
طرف سے رضامندی دے دیتی کہ اگر چاہک میرے کانوں میں ایک روٹی ہوئی آواز گونجی۔

"ہر معیار پر میں سوچتی ہوں کہ اگر امی عید سے عقیقہ اور خوشیوں کی پیا بہر بن کر آئے گی، لیکن وہ عید بھی
نہیں آئی تیرہ اور مجھ بھی لڑکیوں کی زندگی میں وہ عید بھی آتی بھی نہیں ہے۔"

"آپ کو شاید یہ بات معلوم نہیں منہ بانی، میری تو عقلی ہو چکی ہے۔"

بالکل بے ساختگی میں یہ جملہ میرے منہ سے نکلا تھا۔ اسے منہ سے نکلے ان لفظوں پر میں خود حیران ہو رہی
تھی۔ میں کوئی بہت دباؤ والی لڑکی نہیں کہ ایک ایسی چیز جو میرے لئے بھی اتنی ہی اہم اور ضروری ہے جتنی صانع کے لئے
اسے خوشی خوشی اس کے حوالے کرنے کا سچا ہے۔

منہ بانی کے چہرے پر میرا جواب سن کر قدرے افسردہ چھا گئی تھی۔

"تم نے بھی بتایا ہی نہیں۔"

"بہن! کسی ایسا کوئی ذکر نہیں نکلا۔" میں نے ان کے سوال کا بھینک دیا۔ "آپ کے بھائی
نے بہت مشکل اور سخت زندگی گزار دی ہے منہ بانی تو یقیناً انہیں وہ لوگ ضرور اچھے لگتے ہوں گے جو مشکلات کا بہت
اور بھاری سے مقابلہ کرتے ہیں۔ میں آپ کو کبھی گنتی ہوں، لیکن مجھ بات تو یہ ہے کہ میں نے ایسی کوئی خاص
مشکلات کا سامنا بھی نہیں کیا۔ جو مجھ کو کمری ہوں وہ وہاں ہمارے ارد گرد بے شمار لڑکیاں کر رہی ہیں۔ لیکن ایک ایسی
لڑکی کو میں جانتی ہوں جو عام لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔ صاحبزادے عام سے اس کا۔ میری بہت اچھی دوست ہے وہ۔
جن حالات سے وہ گزری اور اچھے طرح اس نے اپنی عزت اور آزادی کی حفاظت کی ایسا ہر لڑکی نہیں کر سکتی۔ ابھی آپ
نے بتایا ہے کہ آپ کے بھائی نے بہت سی سختیاں، جھیلیں، چھوٹی بڑی ہر طرح کی نوکریاں کیں تو پھر یقیناً وہ عزت کی
محظرت کے قطعی محضوں سے واقف بھی ہوں گے۔ کسی ایسی کام کو وہ حقیر نہیں سمجھتے ہوں گے جس میں انسان
شرافت اور عزت کے ساتھ اپنی روزی کاتا ہو۔"

وہ بہت فور سے میری بات سن رہی تھیں۔ میں انہیں سامنے کی جھوٹے کھائی اور اس کی موجودہ جاب کے بارے میں مختصر لفظوں میں سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

”آپ ایک بار اس سے مل ضرور لیں۔ آپ کو میری سب باتوں پر یقین آجائے گا۔“ میں نے اپنی کھٹکھٹ کے اختتام پر ان سے کہا تھا۔

”میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی نہ تو اتفاق سے بات کر کے ہی میں کوئی فیصلہ کر سکتی ہوں۔ میں تو اس نے خود بھی جب وہ لی کام کر رہا تھا تب ایک فاسٹ فوڈ ریٹورنٹ میں جاب کی تھی لیکن اپنی وہ دلی بیوی کے لئے اس حوالے سے اس کے کیا خیالات ہیں۔ مجھے اس سے بات کر کے ہی پتہ چلے گا۔“ انہوں نے بہت چپقلی اور صاف گوئی سے میری بات کا جواب دیا اور پھر گھڑی میں غم کو دیکھ کر گھڑی ہو گئیں۔

میں نے ان کی بات سننے ہوئے کچھ سوچ کر جلدی جلدی ایک کانڈ پر صائر کے گھر کا پتہ اور فون نمبر لکھ کر ان کے ہاتھ میں پکڑایا۔ انہوں نے خاموشی سے وہ کانڈ میرے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

ساری رات پارلر کھارہا تھا۔ فجر سے کچھ پہلے ہی ہم لوگ فارغ ہوئے تھے۔ پارلر سے فارغ ہو کر میں کمرے میں آ کر لیٹ تو گئی تھی، لیکن ہمیشہ کی طرح بے خبر ہو کر سوئی نہیں تھی۔ اتنا کھٹکے کے باوجود بھی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ تو دُری ہی دُری میں گھر میں چل پھل شروع ہوئی تھی۔ ای کی اور دیتیں، بیہوش کی آواز میں سنائی دے رہی تھیں۔ جب نیند نہیں آ رہی تھی تو بے کار لیٹ کر میں کیا کرتی۔ مجھے کمرے سے نکلا دیکھ کر ابھی توجہ رہی۔

”تم ابھی تک سوئیں نہیں؟“

”نیند نہیں آ رہی اس لئے میں اٹھ گئی۔“

ہمیشہ میرا صبر کا دن سوتے ہوئے گزارتا تھا اور آج میرا سونے کا دن ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

گھر میں قربانی ہوئی تھی، جائیداد اور حرم یکں میں کسی قسم کی بات نہیں ہوئی تھی۔ اسی اور اٹھیں بھی مجھے نہیں کہاں معروف تھیں۔ میں صبر سے پرہیز مارتا گزری رات کی مصروفیت کے بارے میں سوچ رہی تھی جب فون کی بیل بجی۔ میں نے لیٹے لیٹے ہی ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آتی صائر کی آواز کو سن کر میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں ناشوری طور پر فون کی بھڑکی اور شاید اس نے ٹیبل فون کے بالکل قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

”کل رات ہمارے گھر ایک خانقاہ آئی تھی، منیہ۔ تم جاننا کہ تم نے کچھ بھیجا تھا انہیں۔ وہ تمہارا نام لے رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ تیرے لئے انہیں یہاں رکھنے سے جائے کے لئے کہا ہے۔“ اس کی بات سن کر میرا دل خوش کے احساس سے بھر گیا تھا۔

”ہاں۔ میں نے انہیں تمہارا بتایا تھا۔ میری کافی پرانی جانتے والی ہیں منیہ۔ بائی۔“ میں جرابا گویا ہوئی اور پھر فوراً ہی پرخس انداز میں اس سے پوچھنے لگی۔

”پھر آگے کیا بات ہوئی؟“

”ابھی تو کچھ خاص بات نہیں ہوئی۔ بس وہ امی سے اور مجھ سے ملیں۔ تم تو سارا وقت حیران ہی ہوتی رہی۔ وہ بے بات جاننے کے باوجود بھی کہ میں کیا جاب کرتی ہوں، میرے لئے رشتہ لے آئیں۔ ان کے انداز سے ایسا

لگ رہا تھا کہ انہوں نے مجھے پسند کر لیا ہے۔ آج وہ اپنے بھائی کے لئے آئیں گی ہمارے گھر۔ میں ابھی تک حیرت میں جھٹکا ہوں۔ میری محسوس نہیں آ رہا کہ یہ سب ہو گیا رہا ہے۔“

وہ بہت دُور سے دُور انداز میں بول رہی تھی۔ میں اس کی بے یقینی اور خوف کو پوری طرح محسوس کر رہی تھی۔ ”یہ سب بھی بالکل ایسی طرح کی کھائی ہے، جیسے اس سے پہلے کے تمام دکھ اور تمام تکلیفیں چھپائیں تھیں۔ کل تمہیں میری باتیں مٹل تھیں اور کتنی باتیں گئی تھیں۔ لیکن صائر کتنی سچی ہے کہ زندگی میں ہمیشہ اگر سب کچھ اچھا نہیں ہوتا تو ہمیشہ سب کچھ برا بھی نہیں ہوتا۔ اگر ہمیں ملنے والے سب لوگ اچھے نہیں ہوتے تو سب لوگ برے بھی نہیں ہوتے۔“

وہ سب باتیں جواگر کل میں اس سے کہتی تو وہ انہیں رتی برابر بھی اہمیت نہ دیتی، اس وقت وہ انہیں بڑی توجہ سے سن رہی تھی۔

”خدا کا نام ہے بندوں پر ان کی برواغت سے بڑھ کر آزمائش نہیں ڈالتی، تم بالکل بے خوف ہو کر اپنے اللہ پر یقین رکھتے ہوئے ان خوشیوں کا استقبال کرو۔“

”لیکن نہ تو.....“ اس نے کچھ مضطرب سے انداز میں مجھے مخاطب کیا تھا لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”کوئی لیکن نہیں صائر! تم آج اتفاق سے طوتم دوں ساتھ بیٹھ کر بات کرو، اس نے بھی تمہاری ہی طرح کی سخت زندگی گزار دی ہے، وہ تمہاری سب مشکلات کو سمجھ لے گا۔ تم دیکھنا، وہ تم سے سختی محبت کرنے کا تمہاری سختی قدر کرے گا۔ شاید وہ جانے کے بعد کوئی تمہارا رشتہ تم کو ختم نہیں ہو جائے گا۔ اپنے گھر والوں کے ساتھ۔ اس بات پر صرف اپنے بارے میں سوچو۔ صرف اپنے بارے میں۔ اور اپنی بہن سے میری طرف سے یہ ضرور کہہ دینا کہ تمہاری جس جاب کی وجہ سے اس کی شادی نہیں ہو پا رہی تھی، اسی جاب کے ہوتے ہوئے خود تمہاری اپنی شادی ہو رہی ہے۔“

وہ ایک مرتبہ پھر بہت خاموشی سے میری باتیں سن رہی تھی۔

”اچھا! میں فون بند کر رہی ہوں۔ اب رات میں تمہیں فون کروں گی، تم میرے لئے وہ خوشخبری تیار رکھا جو میں جانتا چاہتی ہوں اور ایک بات میں تمہیں پہلے ہی ٹیکس کروں کہ میں صبر سے تمہارے لئے ہائیڈل میک اپ کے پیسے بچا رہا ہوں۔ تم اب میری امید رکھنا کہ میں دوستی کا لحاظ کرتے ہوئے تم سے پرانے والے پیسے وصول کروں گی۔“ میں نے بیٹھ کر اچھا اتر کر خوشی سے کہا تو وہ بے ساختہ کھٹکھٹا کر کہنے لگی۔ اس کی وہ دہلی میں نے بڑی توجہ سے سن لی تھی۔ کل جولاڑی زندگی سے بچاؤ تھا، آج اس کے لیوے پر سکراہٹ تھی۔ میں اس بات پر بے تحاشہ خوش تھی۔ بہت خوش خوش میں نے اپنا صبر کا جواڑا پہنا۔ مجھے اسی طرح اہتمام سے تیار ہوتا اور بہت زیادہ خوش دیکھ کر امی سمیت سب ہی حیران تھے۔

خوب اچھی طرح تیار ہو کر اور خانیہ اور حرم کی عید کی تمام پیشکش ڈشز سے لطف اندوز ہونے کے بعد میں انہیں سے اپنے ہاتھوں پر ہنسی لگوانے چھٹی گئی۔ خانیہ بھی وہیں بیٹھی مختلف مٹھو پر عید کے دن خصوصی پروگرام دیکھنے اور ان پر تبصرے کرنے میں مصروف تھی۔ فون کی بیل بجی۔ فون خانیہ حرم نے ریسیو کیا تھا، اس نے مٹی کو آواز

دے کر بلایا تھا۔

”مجھے صبح سے ہی شک ہو رہا تھا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ بیشک کی طرح دنیا بانی سے بے خبر ہو کر سو یا بھی نہیں گیا، پھر یہ اہتمام اپنی تبادری اور تو اور مہندی بھی لگائی جا رہی ہے۔ کبھی میری چادری پہنواؤ راؤ بہن پر زور ڈال کر یہ بات بتاؤ کہ اس سے پہلے کبھی کسی عید پر اپنا کھمبڈی لگاتے دیکھا ہے؟“

حزیم نے اندر آتے ساتھ ہی میری طرف متنی خیر لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے عاید اور افشین کو مخاطب کیا۔ ان لوگوں نے فوراً ہی نفی میں سر ہلا کر اس کے سوال کا جواب دے دیا تھا۔ ای خاموشی سے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔

”صاف صاف بتا بھی کیوں خیرات کیا ہے؟“ عاید اور افشین نے بے ہماری سے پوچھا تھا۔

”نیرہ نے کہاں سے ڈرامیسیک کبھی تھی؟ کیا نام تیری تھیں وہ؟“

ای جواب دیتے دیتے خاموش ہو کر اس کا نام سوچنے لگیں تو حزیم نے فوراً ان کی مشکل آسان کر دی۔

”نعمان خاوند۔“

”ہاں نعمان خاوند اس کی والدہ کا فون تھا۔ وہ نیرہ کو اپنے بیٹے کے لئے پروپوز کرتا جانتی ہیں۔ وہ کبہری تھیں کہ ایک دم سے اس طرح گھبرا گئے کہ انہیں یہ بات بھی نہیں معلوم کہ نیرہ کی کہیں بات چیت طے تو نہیں ہوگی، انہیں مناسب نہیں لگا۔ وہ فون پر مجھ سے بلی پوچھ رہی تھیں کہ نیرہ کی کہیں بات طے تو نہیں ہوئی۔“

حزیم سمیت عاید اور افشین بھی میری طرف بلی متنی خیر لگا ہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ میری تیار یوں کو جس بات کے ساتھ جوڑ رہی تھیں وہ تو میرے دہم و دمان میں بھی نہیں تھی۔ میں اس بات پر اتنی حیران تھی کہ سکتے کے سے عالم میں منہ پھڑپھڑاتی تھی۔ میری سیدی سادی، ان دو سلیک زندگی میں اس طرح کی کسی بات کا تو دور در تک گزر نہیں تھا۔ ای یہ بات بتاتے ہوئے کہ وہ لوگ ابھی تھوڑی دیر میں آنے والے ہیں، کمرے سے اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ ان کے جاتے ہی وہ تیزوں جوا کی آواز بہت لحاظ کر رہی تھیں، جس نے مجھ کو کمرے سے پیچھے پڑ گئیں۔

شام میں وہ لوگ آئے تھے۔ کچھ دیر بعد جانیے مجھے بلانے آئی تو اپنی تمام تر خود اعتمادی کے باوجود مجھے ڈانگ روم میں جا کر نعمان کی چٹلی سے ملنا بہت مشکل کام لگا۔ یہیں اس کی والدہ کی میرے بارے میں کیا رازے ہوگی، یہ نہیں دوا بھی ہوں گی کہ میرا ان کے بیٹے کے ساتھ کتنا زبردست قسم کا بغض چلا ہے۔ یہی سب سوچتے ہوئے میں نشوونما کر سیک اپ صاف کرنے لگی تو جانیے چلائی۔

”اتنی ابھی لگ رہی ہیں، کیوں خانخواہ طیبہ بگڑی ہیں۔“

”وہ سمجھیں گی۔ میں خاموش طور پر ان کی وجہ سے تیار ہوئی ہوں۔“ میں نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں اسے

سمجھانا چاہا تو وہ ہنسنے ہوئے بولی۔

”بھروسہ وہی کیوں، سمجھ تو تم لوگ بھی نہیں رہے ہیں۔“ میں نے جواباً اسے غصے سے دیکھا لیکن وہ میرے غصے کا نظر انداز کر کے ہاتھ پکڑ کھینچتے ہوئے مجھے ڈانگ روم میں لے آئی تھی۔ وہاں نعمان کی کمی اور بہن اوی کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ملیں۔ ان لوگوں کا انداز میری توقعات کے

بالکل برعکس تھا۔ نہ انہوں نے سر سے لے کر پاؤں تک مجھے خوب گھور گھور کر پوسٹ مارٹم کرنے والے انداز میں دیکھا تھا نہ یہ بات بتائی تھی کہ وہ بیٹے کے کپتے پر میاں آئی ہیں۔ میں پانچ دس منٹ میں وہاں سے بڑی چالاکی سے ٹھک لی تھی، یہ ساری باتیں اور یہ تمام تر محال میں اتنی آسانی سے قبول کر لینے والوں میں سے نہیں تھی۔ مجھے سائنر کی بات بھی یاد آ رہی تھی۔

”خانخواہ سامنے والے بندے کو کچھ ذکر کرو۔ اس کو یہ نہ جاناؤ کہ تم ناقابل تغیر ہو۔ اگر ایسا کر دو گی تو وہ جہیں تغیر کرے گا کتنا ہراسہ پیچھے پڑ جائے گا۔“

ان مردوں کی انڈرازا رازی بات سے ہرٹ ہوئی ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ایسا صرف مجھے تغیر کرنے کو کہ رہا ہے۔ مردوں کے بارے میں تو یوں میری ہر کی رازے کچھ خاص ابھی نہیں۔ میں تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور اپنے بیک کو پرکا کا پرکا پڑا ہوا پلٹ کر اس میں سے گرے ڈھیرے سارے کاغذوں اور دیگر اہم علم میں سے ایک دو ٹینک کا رو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں اسے ڈھونڈ لگالے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس پر لکھا ہوا سوا کھ نمبر میں نے بڑی تیز رفتاری سے ملایا تھا۔

”ہیلو! اس کی بڑی جاندار آواز سنائی دی تھی۔“

”میں نیرہ۔“ میں نے ابھی صرف اپنا نام ہی لیا تھا کہ وہ بڑی طرح جھکے ہوئے بولا۔

”جی نیرہ! کیسے کیا کام ہے؟“ بولے کا انداز ایسا تھا جیسے اس سے پہلے میرے سب کام وہی کرتا رہا تھا۔ میں اس معصومانہ انداز پر چڑ گئی تھی۔

”آپ نے اپنی گئی کو میرے گھر کیوں بھیجا ہے؟“ میرا انداز بہت رعب دار اور بڑا دھوکہ خیز تھا۔

”وہ وہ جس میں وجہ سے آئی ہیں، اس کی انہوں نے جب بھی ضرور بتائی ہوگی۔“ اس نے مہذب انداز میں جواب دیا۔

”میں آپ سے سننا چاہتی ہوں وہ وجہ۔“ میں اس سے بات کرتے ہوئے بالکل بھی نرم نہیں تھی۔ میرا لہجہ بہت برا امتداد تھا۔

”کسی لڑکی کے گھر رشیدی لے لے بھجوا جاتا ہے کہ اس سے شادی کرنی ہوتی ہے۔“ وہاں ہنوز وہی بچیہ اور مہذب سا انداز تھا۔

”کیوں تو پھر میری سر آپ کو کچھ ہی سے کیوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ میں نے مجھ ہی پر خاص زور دلاتا تھا۔

”مجھے ریسپر میں سے اس کی لپکی میٹھی کی آواز سنائی دی تھی، چند منٹ میرے سوال میں اس کی کیا بات تھی مجھے وہ انجانے کر رہا تھا۔

”اگر آپ وعدہ کریں کہ آپ کے اس سوال کے جواب میں، میں جو بات بتاؤں گا، اسے سن کر آپ ناراض نہیں ہوں گی تو میں بتانے کے لئے تیار ہوں۔“

چند منٹ اس کے لمحے میں اس کی کیا بات تھی، جو میں بڑی طرح بھول گئی تھی۔ مجھ سے جواب میں کچھ بھی نہیں بولا جاسکا تھا۔ اس نے ایک سیکنڈ میرے جواب کا انتظار کیا پھر خود ہی ہولنا شروع ہو گیا۔

”اب چاہے تمہیں میرا تم کہنا ہی برا لگے تو یہ بات بڑی عجیب سی لگے گی کہ جس لڑکی سے میں انکھار محبت کرنے جا رہا ہوں اسے آپ کے ہر لکھنے لکھنے میں غائب کروں۔“
مجھے اپنی طراری رخصت ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی وقت گیت پر تل کی آواز سنائی دی تھی۔
”گیت پر تل ہو رہی ہے۔ میں آپ سے بعد میں بات کروں گی۔“

میں نے اس کا جواب سنے بغیر ہی فون بند کر دیا تھا۔ خود کو اس مشکل سے نکالنے کا اور کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ تیل چھوٹے والے گیت پر ہوئی تھی اور اس گیت کی تیل کی آواز ڈراما گھر دم اور لاؤنچ میں ڈراما مشکل سے سنائی دیتی تھی۔ میں تیزی سے چلتی ہوئی گیت پر آئی اور پیڈ نہیں کر دیا۔ ان میں بغیر پوچھے ہی گیت کھول لی جس میں غصے سے ابھی ابھی میں فون پر پیچھا چھڑا کر آئی تھی۔ اسے اپنے سامنے ٹکڑے دیکھ کر میری ساری بہادری اور اتحاد ہوا ہو گیا۔ وہ میرے چہرے پر شکریہ ادا کر رہی تھی اور گھبراہٹ کو دیکھ کر سنبھلا رہی تھی۔

”میں اور صوف کچھ دیر بھی میں ہی کیا تھا اور اب واپس لینے کے لئے آ رہا تھا جب راستے میں تم نے مجھے اپنے رعب اور دبے سے ڈرانے کی کوشش کی۔“

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سونے کی طرف اشارہ کر کے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔
”تم مجھے لڑکی سے اس قسم کے ٹکڑے سے بھی زیادہ غیظ و کراہت میں تو قہر کر رہا تھا۔ ڈر کے مارے ایسے خود تمہیں فون بھی نہیں کیا تھا۔ تم نے کہا کہ آپ کی فون کریں۔ آپ کے کھانا میں شاید کچھ نہ کھیں۔ کتنی بد دلانا بات ہے کہ جس لڑکی سے آپ محبت کرتے ہوں، اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکے ہوں۔ اس سے اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکیں۔“

وہ بہت حسے سے اپنی بددلی کا اور مجھ سے خوفزدہ ہونے کا اعتراف کر رہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے اصرار نہ تھا کہ کوئی نہیں کھاتا۔

”تم سے شادی کا فیصلہ میری ہی وقت کر چکا تھا جب تم نے مجھ سے ڈرانے کی کوشش کی۔ تمہاری بہادری، تمہارا اتحاد اور سب سے بڑھ کر خود اپنی حفاظت کرنے والا ایسا انداز کہ کوئی تم سے غیر ضروری بات تک کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ مجھے اتنا اچھا اور اتنا مختلف لگا تھا کہ میں نے سوچ لیا تھا مجھے ایسی لڑکی سے شادی کرنی ہے۔ لیکن میں چاہے ہوں بھی تم سے اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کر سکا تھا۔ مجھے ڈر لگا تھا کہ کہیں تم یہ نہ سمجھو کہ میں تمہارے ساتھ غلط کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اس وقت شادی کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مجھے اپنی دونوں بہنوں کی شادیوں کرنا تھیں، ان کی شادی سے پہلے میں اپنے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے یہ تھا تم تک پہنچنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ تمہارے گھر آ کر باقاعدہ رہنما مانگ جائے۔ اس بات کے بغیر خالی خالی میرے اظہار محبت اور شادی کے وعدے کو تو تم بکھرے کے ڈبے میں ہی ڈال دیتیں اور مجھے ایسی ایسی باتیں کہ میرے ہوش ٹھکانے آجاتے۔ یہی سب سوچ کر میں خاموش رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اگر میری گن گئی ہے تو یہ لڑکی مجھے ہی ملے گی۔ اور آج جب اس وقت میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں تو پورے اتحاد سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میری گن گئی اور میری محبت بالکل ختم ہو گئی۔“
محبت کیسی ہوتی ہے؟ چاہے جانے کا احساس کیا ہوتا ہے؟ آپ کسی کے لئے اسنے ام ہو جائیں کہ وہ اکثر

آپ ہی کے بارے میں سوچا کرے۔

یہ احساس کیا ہوتا ہے مجھے ان سوالوں کے جواب مل رہے تھے۔ محبت میرے بالکل قریب تھی۔ میں اسے دیکھ سکتی تھی، محسوس کر سکتی تھی، جس کے لئے میں بہت اہم تھی اور وہ میرے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ خوشیوں نے چاروں طرف سے مجھے اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ میرے لئے یہ میری پچھلی تمام عیدوں سے مختلف اور کبھی بھی نہ بھولی جانے والی عید تھی۔

آخر سال کی عمر میں اپنی انکھ کی کتاب میں، میں نے ایک سبق پڑھا تھا اس کی ایک بات مجھے آج تک یاد ہے۔

”خوشیوں کو پانا چاہتے ہو تو کہیں ان کے پیچھے بھاگنے کی کوشش نہ کرو، بلکہ دوسروں کے دلوں میں خوشیاں پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ تم دیکھو گے کہ خوشیاں خود تمہارے پیچھے بھاگنے لگی ہیں۔“

میرے ساتھ بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔ وہ ایک دل جس تک عید کی کوئی خوشی نہیں پہنچ رہی تھی، میں نے اس تک عید کی خوشیاں پہنچانے کی کوشش کی بالکل بے غرض ہو کر۔ یہ سوچے بغیر کہ اس نیکی کے عوض اللہ مجھے کچھ عطا کرے گا یا نہیں۔ ہم سب بہت سی نیکیاں کرتا چاہتے ہیں۔ صدقات، خیرات، عبادتیں۔ کسی کے دل میں خوشی کا احساس پیدا کرنا بھی تو ایک عبادت ہے۔

یہ عید تو گزر چکی، اگلی عید پر آپ بھی ایسی ہی نیکی کر کے دیکھیں گے، مجھے پتہ ہے میری ہی طرح آپ سب بھی خوشیوں کے چٹکائی پٹی ٹمٹی میں بند کر لینا چاہتے ہیں۔

ہم سب خوشیوں کو دھڑلے ہیں، انکھ پانا چاہتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہیں، ہمیں ہمارے حصے کی سب خوشیاں مل جائیں ہم اس کوشش میں لگے رہیں ہیں۔ ایک ہمارے دل کو خوشی دینے کی کوشش کے ضرور دیکھیں، میری ہی طرح خوشیاں آپ کے بھی قلوب میں آجائیں گی۔ آپ خوشیوں کو انکھ دھڑلے گئے خوشیاں آپ کو دھڑلے گی۔

تھا۔ رمیو کے خیال سے تو گھر بر لحاظ سے مکمل ہو گیا تھا کیا سمجھا کہ وہاں ابھی تک کوئی بے گھر نہیں تھا۔ اس نے خوبصورت گھر میں یہ دیرانی اسے ابھی نہیں لگ رہی تھی۔

”خالہ! پیچھے والے گھر میں نے لوگ شفت ہو گئے ہیں۔“ ناشٹے کی میز پر وہ اربب، عاشری اور بیما بیٹھے تھے جبکہ باہمی بچن میں مصروف تھے۔ اربب کی بات پر اس نے چونک کر اخبار پر سر اٹھایا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”میں کل خرم کے گھر گیا تھا تو وہاں پوریا ٹیکو میں بلیک سوک کمری تھی اور اندر لائٹس بھی آن نظر آ رہی تھیں۔“ اربب نے جوابا کہا تھا۔

”جس کا وقت اتنی آفر تفری اور بہاگ دوڑا دل ہوتا تھا کہ اس سے زیادہ نصیلات وہ معلوم نہیں کر سکتی تھی۔ روزانہ اس کی بیج جبری اذان کے ساتھ ہوتی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر جلدی جلدی امی کے لیے ناشتا پکارتی۔ انہیں نماز کے فوراً بعد چائے چاہیے ہوتی تھی۔ اگر کسی روز اسے چائے لے جانے میں دیر ہو جاتی تو وہ ناراض ہو کر ناشتی بھی نہیں کرتی تھیں۔ مسلسل بیماری نے انہیں شدید بنا دیا تھا۔ اسے بچوں کی طرح انہیں بھلانا پڑا تھا۔ بارش چھٹ تو وہ برسوں سے تھیں مگر پانچ سال پہلے جب وہ گھر کی بیڑیاں اترنے لگی تھیں۔ اس کے بعد سے ان کی بیک یون اتنی ہی طرح حشر ہوئی تھی کہ تمام تر علاج معالجے اور احتیاط کے باوجود تکلیف اپنی جگہ برقرار تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ بالکل مندور ہی ہوئی تھیں۔ وہ جہل پھر پھرتی تھیں، مگر جبکہ کران سے کوئی کام نہیں کیا جاتا تھا ہی لے رمیو کو ان پانچ سالوں میں ان کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنا پڑا تھا۔

ای کو تاشکر کے اور ان کے دیگر تمام کارکنین ہاں بنانا کیڑے بڑھانا اور غیرہ انتظام وہ جلدی جلدی اپنی تیار کرتی تھی۔ ناشٹے کی تیاری میں بھی کسی کا ہاتھ جانا لازمی تھا۔ روزانہ ان کا منہ پھول جاتا تھا اور اپنی زندگی کے اسے برسوں میں وہ ابھی تک اس بات کی عادی نہ ہو سکی تھی کہ کسی کا ہاتھ دھو کر دیکھے۔ کوئی اس سے ناراض ہو جائے۔ یہ بات اس کی برداشت سے باہر تھی۔ چاہے سامنے والے کو خوش کرنے کے لئے اسے اپنا کوئی نقصان ہی کیوں نہ کرنا پڑے، وہ ایسا کرتی ضرور تھی۔

پہلے کا لچ جانے کے لیے اس نے دین گواہی تھی۔ اس وقت تو اور بھی زیادہ پیش ہوتی تھی، اگر دین نکل گئی تو پھر رشک یاس سے جانا پڑے گا۔ یہ سوچ اسے پریشان کر دیتی تھی۔ جب اس نے اپنی ذاتی گاڑی خریدی تھی۔ اس فینٹس سے جان چھوٹ گئی تھی۔ گاڑی خریدنے سے جہاں اسے آنے جانے کی سہولت ہوتی تھی، وہیں کچھ پریشانیوں کا پھیل ہوا بھی تھا۔ وقت بے وقت باہمی کو شاپنگ یا کسی بھی کام سے باہر جانا ہوتا تو اسے ڈرائیور کے فرائض انتظام دینے پڑتے۔ بیماریاں گاڑی آگس لے جاتے تھے۔ انہیں یوں بھی بھائی کی شاپنگ دینے سے سخت الجھن ہوتی تھی۔ عاشری یا سمیرا کو اپنی فریڈز کے گھر جانا ہو تو اس کی شیں شروع ہو جاتی تھیں۔ وہ دونوں علی اس سے بہت باتوں تھے۔ ایسا اور جواد پڑتی۔ اربب اور عاشری تو اسکول بھی اسی کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ وہ دونوں علی اس سے بہت باتوں تھے۔ ایسا اور جواد بھائی ریاض میں رہتے تھے۔ جواد بھائی وہاں ایک امریکن فرم میں بڑی اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔ شروع شروع میں تو دونوں بچے وہاں لپکا کے پاس ہی رہے۔ مگر جیسے جیسے بڑے ہوئے گئے۔ ایسا اور جواد بھائی دونوں ہی کوچوں کی تعلیم

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت

اسنے گھر کی بیک پر بے اس گھر کو وہ اس کی تعمیر کے ابتدائی مرحلے سے ہی بخور دیکھ رہی تھی۔ بنیادوں سے لے کر تزئین و آرائش کے اختتامی مرحلوں تک اسے اس گھر کے طرز تعمیر نے نہایت حشر کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہاں کے مکین نہایت ہی بااوق تھے۔ ہزار گز پر بنا وہ ایک بڑی کھلا ہوا دار اور دلکش عمارت تھا۔ رمیو کا تو پورا یچین ہی اسی گھر میں گزرا تھا اور یہ اس کا مخصوص کمرہ یچین سے اس کے زیر استعمال رہا تھا۔ اسے شروع سے ہی شورش رہا ہے۔ انہیں ہوتی تھی۔ اس لیے اس کا بیڑہ سب سے الگ تھک تھا۔ اسے کمرے میں کھلنے والی بالکونی میں بیٹھ کر اگلے روز کے نیچرز کی تیاری کرتا اس کا سن پندرہ کام تھا۔ تقریباً سال بھر پہلے شمس صاحب کی فیملی یہ مکان فروخت کر کے کینیڈا کیسٹل ہوئی تھی۔ اسے بس اتنا ہی پتا تھا کہ شمس صاحب نے یہ مکان کسی امریکہ سے پاکستان منتقل ہونے والی فیملی کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ اس سے زیادہ اسے معلوم تھا اور نہ ہی اس سے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اسے حال میں سن رہے والے لوگوں میں سے تھی۔ اسے اسے اتنا فرق پڑا تھا کہ پہلے جب وہ شام میں بالکونی میں بیٹھی نیچرز تیار کر رہی ہوتی تو بھی موٹا اور بھی اتنی سے آسنا سامنا ہو جاتا تھا اور پھر ان لوگوں کے ساتھ تھوڑی بہت کسب شب بھی ہو جاتی تھی۔ ان لوگوں کے جاننے سے وہ جگہ ایک دم دیران کتنے کی تھی۔ نئے خریدار نے پورا مکان لڑا کر نئے سرے سے بنوایا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ گھر کی ڈیزائننگ اور پلاننگ کسی بہت بڑا آرکیٹیکٹ سے کروائی گئی تھی۔ وہ اکثر کام کرتے کرتے بے خیالی میں بیٹھی کالی وریک اس گھر کو کتنی دیتی تھی۔ جب گھر کی بیک سائیز اتنی شاندار تھی تو فزٹ تو پتا نہیں کتنا ایشیاں ہوگا۔ رمیو اکثر سوچا کرتی تھی۔ کچھلی گلی میں کیونکہ شمس صاحب کے علاوہ اور کسی فیملی کے ساتھ اسے گھر سے مرام نہیں تھی اس لیے وہاں اتنا آنا جانا بھی نہیں ہوتا تھا۔ آٹھ نوہ کے عرصے میں وہ گھر مکمل ہو گیا تھا۔ نئے مالک کو شاید پودوں سے بھر لگاؤ تھا ہی لیے وہاں ایک عمدہ اور خوبصورت پودے نظر آتے تھے۔ کیاریوں میں لگے وہ چھوٹے چھوٹے پودے جنہیں گل تیار درخت بن جاتا تھا۔ وہ دلا جہی وہاں کی ایک ایک چیز کو دیکھیں سے دیکھتی اور وہاں مستقبل قریب میں بیٹنے والے لوگوں کے ذوق کو اس پر۔ پھر ایک روز جب وہ اربب اور عاشری کے ساتھ رات میں واک کے لیے نکلی تو خاص طور پر اپنی کچھلی گلی میں بھی گئی اور اس گھر کو سامنے سے دیکھ کر بے اختیار اس کے منہ سے واہ نکل گیا۔ ابھی تک وہ گھر خالی ہی

دیگرہ کی طرف سے پریشانی ہونے لگی۔ جواد بھائی کو خاص طور پر حسودی عرب کا مسیحا تسلیم اپنے بچوں کے لیے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ اسی لیے آخر کار یہی فیصلہ کیا گیا کہ دونوں کو کراچی بھیج دیا جائے۔ جواد بھائی کے والدین تو تھے تھیں۔ لیکن بھائی بھی سب پاکستان سے باہر منتقل تھے اس لیے یہی کیا گیا کہ بچوں کو ان کے فضیلا میں چھوڑ دیا جائے۔

شروع شروع میں دونوں عی نے اپنے باپ باپ کو بہت سہ کیا۔ مگر پھر رفتہ رفتہ وہ دونوں یہاں سیٹ ہوئے چلے گئے۔ انہیں یہاں مانوس کرنے میں ریویو کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ جب وہ لوگ یہاں آئے تھے۔ ریویو تازہ و تازہ ہونے لگی تھی۔ اسے زلزل کا انتظار تھا اس کے بعد اس کا کچھ شہ کارادہ تھا۔ فراغت کے ان دنوں میں اس نے بچوں کو کمر پور ورت دیا تھا۔ یہی آٹھ سالہ عاشری اور چھ سالہ اربیب کی اپنی اکلوتی خالہ سے آئی تھی۔ انڈرا اسٹینڈنگ ہو گئی تھی کہ پھر انہیں چھینوں میں بھی حسودی عرب جانے میں مزہ نہیں آتا تھا۔ ان سات برسوں میں اس نے ان دونوں کا بہت خیال رکھا تھا۔

عاشی کا یہ اسکول کا آخری سال تھا جبکہ اربیب اچھے اسٹینڈنگ میں تھا۔ صرف عاشری اور اربیب ہی نہیں بلکہ سمیعہ یعنی اور عبداللہ بھی وہ پسندیدہ تھی۔ انہیں بھی اپنی یہ پارٹنگ اور فٹ کچھ پھول و جان سے عزیز تھی۔ سمیعہ سب بچوں میں بڑی تھی۔ اسی حساب سے سب پر بڑی بہنوں والا رعب بھائی نے کیوشش کر لی تھی۔ جس سے سب ہی پڑا کرتے تھے۔ وہ ہم آکاسک کالج میں فرسٹ انٹیر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ جبکہ اربیب اور عبداللہ اربیب ہی کے کلاس لیو تھے۔

☆☆☆

اربیب کی دی ہوئی اطلاع کی تصدیق یوں ہوئی کہ اسی روز رات میں اس نے اپنے کمرے کے سامنے والے کمرے کی لائٹ جلی دیکھتی تھی۔ بند پر دونوں کے پیچھے اس کوئی بندہ بشرق کوئی نظر آتا بس روشنی دیکھ کر یہ اطمینان ہو گیا کہ وہاں نئے لوگ شفٹ ہو گئے ہیں۔ وہ وہاں کی خاموشی اور پرانی دیکھ کر بھیسی بھی اسے درگتے لگتا تھا۔ امی، بیبا، بھائی، عاشری اور سمیعہ کے بیڑہ میں تھے۔ جبکہ عبداللہ، سنی، اربیب اور اس کا کمرہ فرسٹ فلور پر تھا۔ بھیسی سوتے سے آگے نکل جاتی اور اربیب کی نظر سامنے پڑتی تو وہاں گھب اندر چراگدیا کمرے ایک دم ہی کوئی نہ کوئی بارہمودی یاد آجاتی۔ بچوں کے کمرے میں یوں نہیں جاسکتی تھی کہ سب کا خیال تھا کہ ان کی خالہ اور چچا پچھو بڑی ہی بہادر خاتون ہیں، اب وہ بچوں کو بتاتی تھیں کہ اسے سامنے والے گھر کی دیواری دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔

نئے لوگوں کے آجانے پر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ دن پندرہ دن ہو گئے تھے اس کی ابھی تک نئے کیوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ صبح کے وقت وہ خود بھی گھر نہیں ہوتی تھی۔ ڈھائی تین بجے اس کی کالج سے واپس ہوئی تھی۔ اسی وقت سے لے کر اور رات تک اسے وہاں سوائے خاموشی اور اندھیرے کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ رات 9 بجے کے قریب سامنے والے کمرے کی لائٹ آن ہوئی تھی۔ باقی کمرے اس کے بعد بھی اندھیرے میں ڈوبے رہتے تھے۔ اسی گتہ تھا کہ وہاں ایک یاد ہی افراد پر ہیں۔ یہ بھی تھے تو باقاعدہ حیرت کا اظہار کیا تھا۔

”پانچس لوگوں کے پاس اتنا فالتو چیز کھان سے آتا ہے۔ رہنے والے نہیں ہیں اور اتنا مایان مکان تیار کر لیا۔ یہاں یہ حال ہے کہ تین سال ہو گئے ہیں مگر میں واپس دانت نہیں ہوا فریج بھی پانچ چھ سال سے وہی چل رہا ہے۔“

بھائی کے ایسے ٹکڑوں پر بھیما ایمان نہیں دیتے تھے۔ اسی لیے وہ ہنوز ہی دی پر نظر نہ جمائے بیٹھے رہے تو

وہ منہ بٹا کر کھڑی ہو گئیں۔

☆☆☆

”اس روز اتوار کا دن تھا۔ اپنے بھتیجے بھرتے جمع شہد کا بھائی میں پند چوہ پٹھی کل کے پچھڑ تیار کر رہی تھی۔ سب کو بات تھا اس وقت وہ اپنا لگتے پڑے کا کام کرتی ہے۔ اس لیے اسی وقت اس کوئی ڈسٹرپ نہیں کرتا تھا۔ سائیڈ میں رکھا جائے گا کپ اٹھانے کے لیے اسے جیسے ہی ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کی فائل کے اوپر رکھے ہوئے تین چار منٹے ایک دم ہوا کے زور سے اڑ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ انہیں پکڑتی انہوں نے اپنی پرواز کا سلسلہ جاری رکھا اور سامنے والے گھر کی بالکونی میں جا کر لیٹ گیا۔ سامنے ہی پڑے سکون سے آرام فرما ان صفحات کو صرف دیکھ سکتی تھی۔ اچھا خاصا کام کا نمونہ جو کہ یہاں تھا۔ خود بھی اچھا خاصا کتابت کا فن تھا۔ وہی تو احتیاد کرنا چاہیے تھی۔ ابھی وہ کف افسوس مل رہی تھی کہ سامنے والے کمرے کی سلائیڈنگ کھول کر ایک بندہ باہر بالکونی میں نکلا۔ تو لیے سے ہال خشک کرتا وہ اپنی دس منٹن شاید کچھ شکتا بھی رہا تھا۔ ریویو نے اس بندے کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ ”ایکسکس دی“ وہ کرسی پر سے اٹھ کر ریلنگ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ جو بیٹے بھکا ریلنگ پر بازو ٹکائے اپنے پردوں کی نشوونما پر غور کر رہا تھا ایک دم چمک کر سیدھا ہوا۔

”وہیکس۔ یہ میرے صفحات اڈر کر آپ کی بالکونی میں آ گئے ہیں۔ چیلر ڈرایہ یہاں پھینک دیں۔“ زبردستی کی منکر اچھٹ چرے پر جا کر یہی جملے بولے ہوئے اس کو اپنا آپ اچھا خاصا فضول لگا۔ ریویو کی بات سنتے ہی اس نے اپنے پردوں کے پاس پڑے ان کا خدا کو دیکھا اور فوراً ہی جنگ کر انہیں اٹھایا۔ اگلے لمبے اس نے انہیں فولڈ کر کے اس کی طرف اچھا لیا تھا۔

”جھپک۔“ زمین پر سے صفحات اٹھا کر اس نے شرے یہ ادا کیا۔ جولاہہ بندہ پر طعنے انداز میں سسکا کر بولا تھا۔ ”اس پر شرے کی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ فوراً ہی اپنی چڑی میں سیٹ کر اندر کمرے میں چلی آئی تھی۔ اپنی یہ ٹین انجرو والی حرکت اسے بالکل بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔

”پانچس اس نے میرے ہارے میں کیا سوچا ہوگا ہو سکتا ہے وہ سوچ رہا ہو کہ میں نے جان بوجھ کر اس سے بات کرنے کے لیے یہ چیپ حرکت کی تھی۔“ جو بھی تھا اس روز اسے خود پر سخت فخر آتا تھا۔ اسے بیوی سب کی نظر میں اچھا بننے کا شوق رہا تھا۔ کوئی اس کے بارے میں کسی قسم کے غلط اندازے نہ لگائے یا اسے غلط سمجھے یہ بات وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے اس نئے پردے سے ریویو کی دور دور ملاقات کھل دور دور بعد ہی ہو گئی۔

اس روز وہ نماز دھیرے سے فارغ ہو کر جلدی سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ اچانک لائٹ چلے جانے پر گری اور جس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ پچھو دیو وہ یوں ہی بیٹے پر لپٹی کر لپٹی کی گری اور ٹوڈیڈنگ کو کھڑی رہی مگر پھر جب ٹھنک اور کمری حد سے زیادہ ہو گئی تو آخر کار ہمز پر سے کھڑا ہوتا ہی پڑا۔ ساری کھڑکیاں کھولنے کے بعد اس نے بالکونی کا دروازہ بھی کھول دیا۔ کمرے کے قتلے میں باہر کا موسم قدرے شہیت محسوس ہوا تو وہ بالکونی میں لپٹی آئی۔ باہر نکلنے ہی اس کی نظر سامنے والی بالکونی میں پڑی تھی۔ کرسی پر بائیس بجائے آسمانگ کرتا ہوا وہ آسمان پر نظریں جمائے پانچس کس سوچ میں غلطان تھا۔ اس پر نظر پڑے ہی ریویو نے واپس اندر کمرے میں جانے کی ٹھانی۔ ابھی وہ

خترے ہی والی تھی کہ چاکہ وہ اس طرف متوجہ ہوا۔

”کیونکی ہیں آپ؟“ وہ کرسی پر اٹھتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟“ جب وہ حق مساکن بنگلے جانے کے لیے خیر و معایت دریافت کر سکا تھا تو ریویو بھی آخر اس سے معذرت کر سکی تھی۔

”اس وقت تو بالکل بھی ٹھیک نہیں ہوں۔ سارے دن کی تھکا دینے والی مصروفیت کے بعد اب گھر آکر لمبی تان کر سونے کا پرکار اس کو اؤڈیشننگ کی وجہ سے برباد ہو گیا ہے۔“ وہ بڑی ناگواری سے بولا تھا۔

”آپ بھی اسی اؤڈیشننگ کی سستی کوٹنی معلوم ہو رہی ہیں۔“ وہ دونوں ہاتھ رینگ پر جمائے بغور اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا تو ریویو نے سر ہلا دیا تھا۔

”بانی داوے میں شریار احمد ہوں۔ آپ کا نیا بڑی تقریباً مینڈ بھر پہلے ہی یہاں شفت ہوا ہوں۔“ وہ پیچھے مڑ کر میز پر رکھی اینٹن فرسے میں سرگرم ملتے ہوئے بولا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ دایں اپنی ساجت پوزیشن میں کھڑا ہو گیا تھا۔

”میری فیملی شروع سے امریکہ میں رہتی ہے۔ پیدائش ویسے میری سیکن کی ہے۔ بعد میں ہم لوگ امریکہ اینڈیگ رینٹ کر گئے تھے۔ لیکن وہ جو کچا ہوتا ہے کہ ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹی ہے تو ہم لوگ بھی اپنے اصلی وطن اپنے وطن دایں آ گئے ہیں۔ ابھی صرف میں آیا ہوں۔ فیملی دو تین مہینوں میں یہاں شفت ہو جائے گی۔“ وہ بڑی فرصت سے اپنا تعارف کر وار ہا تھا۔

”آپ نے اپنے گھر کی ڈیزائننگ کسی بہت ہی ماہر آرکیٹیکٹ سے کروائی ہے۔ آپ کا گھر بالمشافہ ہر زاویے سے ہی بڑا خوبصورت اور منفرد لگتا ہے۔“ ریویو نے بے ساختہ اس کے گھر کی تعریف کی تھی اور اس میں مبالغہ آرائی کا ہرگز کوئی دخل نہ تھا، اس گھر نے اسے شروع دن سے حیرا کیا تھا۔

”بہت بہت شکریہ۔ ویسے یہ تمام کام میں میرے دوست احسان صدیقی کی ہیں۔ شاید آپ نے نام سنا ہو وہ یہاں کراچی میں بڑا مشہور آرکیٹیکٹ ہے۔ میں نے تو بس اس کی چابکدہ پسند کرنے کا کام کیا تھا۔ بانی تمام مراحل سے وہ خود ہی گزارا ہے۔ شیخ صاحب سے یہ مکان خریدنے کے بعد میں تو دایں چلا گیا تھا میرا تمام ذمہ داری اسی نے نبھائی۔“ وہ دھڑکتے ہوئے بولا تھا اور ریویو اس کے اتنی روانی سے اور صبح شفق کے ساتھ اردو بولنے پر حیران تھی۔

”کیا ہوا؟ کیا سوچے لگیں؟“ وہ اس کی خاموشی محسوس کر کے بولا تھا۔

”کچھ نہیں، میں بس آپ کے اتنی روانی سے اردو بولنے پر حیران ہو رہی تھی۔“ ریویو نے صاف گوئی سے اصل بات بتا دی تھی اور جو اداوتہ قبیلہ لگا کر بس بڑا تھا۔

”ابھی اگر میں آپ کو یہ بتا دوں کہ مجھے علامہ اقبال کی شاعری اور شفیق الرحمان کا مزاج بہت پسند ہے تو پھر تو آپ شاید حیرت سے بے ہوش ہو جائیں گی۔“ اس کے بے ساختہ اعزاز پر ریویو اپنے لبوں پر چمکنے والی مسکراہٹ کو

روک نہیں پائی تھی۔

”ویسے میں سوچ رہا تھا کہ جب گھر والے آئیں گے جب ہی اہل خاندان سے ہائے پہلو ہوگی مگر اس لائٹ کی مرہائی سے اپنے ایک محدود پردے سے تو میں نے مل ہی لیا۔ بانی داوے۔ آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ اس کے سوا یہ اعزاز پر وہ بولی۔

”میں ریویو ہوں، ہم لوگ تو شروع ہی سے سیکھ رہے ہیں آپ اس بات سے اعزاز و کلامیں کہ ہماری اسی شادی کے بعد رخصت ہو کر اسی گھر میں آئی تھیں۔ ہم تین بھائی بہن ہیں۔ سب سے بڑے بھائی کچھ بھنگل انجینئر ہیں اور شکیل میں جاب کرتے ہی۔ ان کے بعد میری بڑی بہن ہیں۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ سوڈی عرب میں مقیم ہیں۔ جس وقت میں نیکڑ گئی تھی۔ ہمارے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ اب گھر میں، میں، اُمی، بیبا، بھائی ان کے بچے اور میری بہن کے بچے چڑھ چکی ہیں۔ یہاں آئے ہوئے ہیں جڑے ہیں۔“

ابھی اس کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ لائٹ آگئی۔

”اوہ جھپک گاڈ، لائٹ آگئی۔ ریویو نے فوراً شرار ادا کیا تھا۔ وہ سامنے کھڑا بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

”اچھا شریار صاحب، شب بخیر۔“ وہ کمرے میں جانے کے لیے پر توڑتے ہوئے بولی تھی۔ جہاں وہ بھی شب بخیر کہتا ہے کمرے میں چلا گیا تھا سونے سے پہلے کچھ وہ اسی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ گوشتی کے بھی بارے میں فوراً ہی کوئی رائے قائم کر لینا درست نہیں ہے مگر اس بندے کے بارے میں اس نے پھر بھی رائے قائم کر لی تھی اسے وہ اچھا لگتا تھا۔ پڑھا لکھا، مہذب اور فطرتاً ہی وہ خود اچھا ہے تو یقیناً اس کی فیملی بھی اچھی ہوگی۔ چلو بس سکتا ہے میری اس کی سسر سے ابھی دوستی ہو جائے۔

سوچتے سوچتے چنانچہ اب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ اپنے معمول کے مطابق شام میں بیٹھی کچھ تیار کر رہی تھی۔ جب اس نے شریار کی آواز سنی۔

”السلام علیکم۔“ چونکہ کمرہ اس کا تھا تو وہ سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے سلام کا جواب دیتی وہ بھی جواب میں مسکراتی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں بس ریکل کے کچھ تیار کر رہی تھی۔“ وہ سامنے سے تیار کر رہی تھی۔

”آپ آج جو جلدی لگے۔“ اچانک اس کے منہ سے نکل جانے والے اس جملے پر شرارتی اعزاز میں گویا ہوا تھا۔

”آپ نے میرے آنے جانے کا نام بہت یاد رکھا ہوا ہے۔“ وہ ایک دم بری طرح شرمندہ ہو گئی تھی۔ مگر اب وضاحت کرنی ضروری تھی ورنہ وہ پتا نہیں کیا سمجھا۔

”یہ بات نہیں ہے۔ دراصل میں روز یہاں بیٹھ کر اپنا کام کرتی ہوں، تو آپ کا پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ اس سے اعزاز ہوتا ہے کہ اندھ کوئی نہیں ہے۔“

اس کے وضاحتی اعزاز پر وہ دوبارہ بس پڑا تھا اور یہ فیملی ریویو کو بہت ہی گلی تھی۔ وہ اسے کیا سمجھ رہا تھا۔ وہ

تو صرف پردہ ہونے کی خاطر مروت میں اس سے بات کر رہی تھی اور موصوف ضرورت سے زیادہ ہی خوش فہمی کا فکار ہو رہے تھے۔

”آپ پرستی ہیں یا پڑھانی ہیں؟“ وہ اس کی نگاہیں محسوس کر گیا تھا اسی لیے فوراً سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا تھا۔

”پڑھانی ہوں۔ صاف کہیں گے دیر کا کچھ کام ہے“ وہ بڑی بے مروتی سے کہہ کر ہاتھ پیر سیٹ کر اندر چلی آئی تھی۔ جبکہ وہ ابھی بھی وہیں کھڑا نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

ارباب کا فریٹل انگریز کا زلزل بہت خراب آیا تھا۔ تمام مضامین میں مشکل پانچ مارکس آئے تھے۔ جب سے ارباب عوامی یہاں آئے تھے انہیں پڑھانے لکھانے کی ذمہ داری از خود رمیو کے سر بھی۔ پھر جب اس کے آئی صحت سے پڑھانے کی وجہ سے دونوں اسکول میں اچھے کرپڈز کے ساتھ پاس ہونے لگے تو وہاں بھی نے سنی اور عبداللہ کو بھی نیوش سے اٹھا کر اسی کے حوالے کر دیا تھا۔ یوں اب تمام بچوں کو پڑھانا اس کی ذمہ داری تھا۔ اس کام میں اس نے کبھی کوتاہی بھی نہیں کی تھی۔ چاہے وہ کتنی بھی تھکی ہوئی نہ ہو کر بچوں کو پڑھانے کا نادمہ بھی نہیں کرتی تھی۔

ایسا اور جاد کا بس نہیں چلتا تھا کہ بچوں کو آج ہی اپنی ایچ ڈی کرادیں۔ ہر فون میں پہلے اس سے دونوں کی تعلیمی کارکردگی معلوم کی جاتی، اس کے بعد بچوں سے بھی پڑھانی ہی کے حلقہ بات ہوتی۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ اس کے اتنی محنت کروانے کے باوجود بھی ارباب اچھے مارکس نہیں لے پاتا تھا۔ اس کی رپورٹ کا ڈیڑھ کر رمیو نے ارباب سے ابھی غاصی غنی کے ساتھ باز پرس بھی کی تھی۔ بچوں سے دوستی اور پیارا جیڑا کچھ پڑھانی لکھانی کے معاملے میں وہ ایک سخت گیر استاد تھی۔

آج جب وہ کالج سے واپس آئی تو اسی فون پر اپنا سے باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے تین بج رہے تھے ہجوک سے برا حال تھا۔ وہ ای کو سلام کر کے اپنے کمرے میں جانے لگی تو اسی نے ریسپوسر اس کے ساتھ میں پکڑا دیا۔ وہ بھی کبھی کس کی آواز سن کر اپنا غم بے غرور پر چھٹا جا رہی ہیں۔ مگر دوسری طرف ایسا تو دوسرے ہی موڈ میں تھیں۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں رمیو! ارباب کا زلزل دیکھا تے؟ میں تو ابھی تک اس کے مارکس سن کر سیکھنے میں ہوں۔ لگتا ہے اب کی بات تم نے کچھ سے محنت نہیں کرائی تھی۔ جوا کو پلے گا تو وہ تو میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔“

اس کے سلام کا جواب دیتے ہی وہ نائن اسٹاپ شروع ہو چکی تھیں۔ عام طور پر وہ کسی بھی بات کا اتنی جلدی برا نہیں کرتی تھی مگر اس وقت اسے ایسا کی بات بہت بری لگتی تھی۔ شاید وہ بھی ہوئی ابھی اسی آئی تھی۔ گری اور ہجوک سے پریشان ایسے میں ایسا کی بات اسے ضرورت سے زیادہ ہی بری لگی۔ اپنی ناگواری کو لپی کر وہ چپ چاپ ہی کھڑی رہی وہ دھڑ بڑھیں۔

”اچھا دیکھو، اب فلاں انگریز کے لیے اسے ابھی طرح چٹاری کرنا۔ اگر تینص انگلش اور سائنس میں اس کا رے کر لیں تو کیا تو جوا تو زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ تم ڈرو اسے الگ سے زیادہ غم دیا کرو۔ سو کایک ہی وقت میں پڑھانی ہو۔ زیادہ وقت تو سب بچے ابھی میں شراعتیں کرتے رہتے ہوں گے۔“

”کیا کجاہت نامہ سن کر وہ ریسور ای کو دے کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ اچھا خاصا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ نماز پڑھ کر وہ کھانا کھانے بغیر ہی سوئے کے لیے لیٹ گئی۔ اگر پہلی مرتبہ ارباب کا زلزل خراب آیا تھا تو کیا اس کی قصور وار وہ تھی۔ اس سے پہلے جب ہر سال ارباب عوامی شاندار مارکس لے کر پاس ہوتے تھے تو ایسا نے کبھی کر لیا اسے نہیں یاد تھا۔ ابھی اسے سراہا نہیں تھا۔ ابھی یہ نہیں کہا تھا کہ ایسا اس کی محنت کی وجہ سے ہوا ہے۔ بلکہ ہر بار بچوں کے اچھے رزلٹ پر وہ دھڑ بڑھ کر کھینچ کر لے گئی تھیں۔

”کیوں نہ ہو! آخر کو جن ماں باپ کے بچے ہیں۔ میرے بچوں کو ذہانت وراثت میں ملی ہے۔“

اور ان کی اس بات کا اس نے کبھی برا نہیں کیا تھا۔ ایسا اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا۔ وہ دونوں ہی وہیں بیٹھے تھے۔ اس کی توجہ نہ صرف ان کی ذہانت کو لکھانے کا کام کیا تھا۔ اسے ایسا کے بات کرنے کا انداز بہت برا لگتا تھا۔ ایسا لگا تھا جیسے وہ کوئی ننھا اور دماغ مز سے اور اسے ننھا وہی کام کی تھی ہے۔ وہ تو اپنے انتہائی غامض ڈل میں سے وقت نکال کر بچوں کو پڑھانی کرتی تھی اور اپنا نے سنی آسانی سے اس کی محنت کو دھوکے کا کر دیا تھا۔

شام میں سو کر بھی تو اسے یاد بھی نہیں تھا کہ وہ کتنے آف موڈ کے ساتھ سوئی تھی۔ یاد تھا تو صرف اتنا کہ اسے شدید ہجوک لگ رہی تھی۔ وہ ابھی سو کر بھی صاف دل کی مالک۔ زیادہ دیر تو کئی سے ناراض نہیں رہتی تھی۔ کئی کے خلاف دل میں کینہ یا بغض تو رکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ حسب معمول فرخوار موڈ کے ساتھ سب گھر والوں کے ساتھ بیٹنے اور باتیں کرنے لگی تھی۔ مگر موڈ کی بے فطواری زیادہ ہی قائم نہ رہ سکی تھی۔

رات میں سوئے سے پہلے ای کی کر اور باتیں دہانا اس کے معمول میں شامل تھا۔ وہ ای کی باتیں دہا رہی تھی جب انہوں نے دوبارہ اسی وقت بعد چمیر دیا۔

”وہ بہت بدتمیز اور بڑی تھی کہ یہی صحت رمیو بچوں کو ابھی طرح توجہ نہیں دے رہی۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کچھ تو بین کی پریشانی کا خیال کرو۔“

ای کے منہ سے یہ بات نہ کر وہ بہت بددل ہوئی تھی۔

”ای! آپ کے سامنے ہی تو ہے سب۔ میں رزلٹ پڑھانی ہوں۔“ وہ اپنی ناگواری چھپا کر ہنستی ہے بولی تھی۔

”رزلٹ پڑھانی تو مگر اتنی توجہ سے نہیں پڑھا رہا ہیں۔ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ارباب کا زلزل ہی ہے۔ جو پہلے کلاس میں پڑھائیں لیتا تھا، اب ایک ایک اتنا ڈر کرے ہو سکتا ہے۔“ ای نے اس کا اعتراض ٹھکر دیا تھا۔

”تو اس کی کیا صرف یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ میں نے کچھ توجہ نہیں دی۔ ہو سکتا ہے کوئی اور وجہ ہو۔ ارباب اب بڑا ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے ماں باپ کو کس کرتا ہو۔ میں نے ویسے بھی کئی بار نوٹ کیا ہے۔ جب بھلا سنی اور عبداللہ کے ساتھ گیمز کھیلتے ہیں یا باتیں کر رہے ہوتے ہیں اس وقت ارباب کے چہرے پر بڑے ہی عجیب سے تاثرات ہوتے ہیں۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے بولی تھی۔

”تو کیا جوا کو دیکھو چھوڑ چھا دواں آجائے کیسی بے وقوف والی باتیں کرتی ہو تم۔“ ای نے برا سا منہ بنایا۔

”تو وہ بچوں کو اپنے پاس بلا لیں اور اگر ایسا نہیں کرتا چاہے تو کم سے کم اپنا کو تو اپنے بچوں کے پاس رہنا چاہیے۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کیسی ماں ہیں وہ، انہیں اپنے بچوں کی کسی محسوس نہیں ہوتی؟ سال میں دو تین مرتبہ مل

لینے سے کیا ان کے دل کی تسلی ہو جاتی ہے۔

اب جب بات ہو رہی تھی تو وہ اپنے دل کا یہ خیال اسی کے سامنے ظاہر کر گئی تھی اور اس کی یہ بات اسی کو بہت بری لگی۔

”یہ بات تمہاری بھابھ کو کتنی تو مجھے کوئی دے نہیں ہوتا کہ کندہ بھابھ کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ چاہے، جو اس کی بہنیں، دوریہ کے خلاف اس کے کان بھرتی رہتی ہیں، اگر وہ وہاں سے آگئی تو یہ میدان خالی چھوڑ دینے والی بات ہوگی بجائے بہن کی پریشانی کا خیال کرنے کے کہ انہیں کو سودا ازم شہر ادرام ہو۔ ٹھیک ہے مت پر حاذق، میں خود ہی بچوں کے لیے کوئی نہ کوئی انتظام کروں گی، بیٹھن پر حاذقے والوں کی یہ نہیں ہے۔“

اس نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے ہنسنے لگا تھا۔ کچھ کھینچی ہی دیر وہ اسی سے سواری کرتی رہی، اپنی بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ انہیں بتانا چاہا کہ وہ ایسا کبھی بری نہیں ہے نہیں کہہ رہی تھی مگر ان کا ہنسنی جگہ پر قرار رہا۔ حلق بارگروہ اندھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے بیٹھ محسوس کیا تھا۔ اسی ایسا کو اس کے اور بھیا کے مقابلے میں زیادہ جانتی ہیں۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے جب یہ بات اس نے بہت شدت سے محسوس کی تھی۔ بہت دفعہ اسے برا بھی لگا تھا مگر پھر ہر بار اپنی حادث کے چیز نظر وہ اس بات کو نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔ وہ دن رات ایک کرے کی ایک خدمت کرتی تھی اور یقیناً ایسا کرے کے در پر کوئی احسان نہیں کر رہی تھی۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی اس کا دل چاہتا۔ اسی کو کوئی ستانی جملہ اور شاباشی اسے دے دیں۔ اس کی پیٹھ ٹھیک کر رہی تھی کہو دیں۔

”رمدیہ میری سب سے پیاری بیٹی ہے۔“ یہ کلمہ ”رمدیہ“ تو خود ارم بھی کر لیا کہ وہ تنہا تنہا جاتی ہوگی تم۔“ عمر اس کی حسرت، حسرت انعام ہی رہی تھی۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنے فون پر صرف یہی سن لیتیں کہ آج رات ان کے تھر کمانے پر مہمان آ رہے ہیں تو وہ بری طرح سے چین ہو جاتی تھیں۔ ان کا نہیں نہیں چلنا تھا کہ خود اس کا رپا کے گھر پہنچ جائیں اور ان کا ہاتھ غائب نہیں۔ عید وغیرہ پر اپنا پاکستان آتیں اور ان دو چار دنوں کے قیام میں اسی کی خدمت کرتیں تو وہی پریشان ہو جاتیں۔

”نہیں کرو تب سے بڑا دہاری ہو۔ ٹھیک ہو گئی۔“

اور وہ حسرت سے اسی کا منہ دیکھتے ہو جاتی تھی۔ اس طرح انہوں نے آسے کبھی نہیں کہا تھا۔ اس کے برعکس اگر کسی اس سے کہیں کوئی معمولی سے چوک بھی ہو جاتی تو وہ جواب ملی کے لیے کھڑی ہو جاتی تھیں۔ اگر وہ ناشتہ دیر سے لے کر جاتی تو وہ ناراض ہو جاتی تھیں اسے غصہ نہ جیتی تھیں۔

”ہاں اپنا پیار ماناں سے ٹھگ آگئی ہو۔ میرا وجود وہاں وہاں جا لگتا ہے جیسے۔“

اور وہ انہیں منامنا کر ہار جاتی تھی۔ جب تک باہر اندھوہ سے اس نے کبھی اسی کی اپنا سے اجنبی صحت کو اتنا محسوس نہیں کیا تھا۔ کیونکہ بابا کی تو وہ دل کی تھی مگر بابا کی اس طرح بچوں میں شری نہیں رکھتے تھے۔ اگر وہ ان کی آنکھوں کا تار تھی تو اپنا اور بھیا بھی انہیں کم عزیز نہ تھے۔ اسی کی بات نے اسے بہت بری طرح ہرٹ کیا تھا۔ اس کے غلط اور نیت پر شبہ کیا جائے۔ یہ بات اس کی برداشت سے باہر تھی۔ بالکل نئی کمزری آسمان پر پھٹنے اسے ہمارے کو بخورد کہتے وہ اس وقت بڑی دل گرفتہ اور اداس تھی۔ اس وقت اسے بابا کی بڑی شدت سے یاد آ رہے تھے۔ ”ہاں! ہاں! اتنی جلدی کیوں چلے گئے؟“

”آپ شاید اپنے والد کو کس کر رہی ہیں۔“ شہر ادرام اس بات پر وہ بری طرح چونک گئی تھی۔

”حیران مت ہو۔ ابھی جب آپ خود کھائی کر رہی تھیں تو میں نے آپ کی بات سن لی تھی۔“ اس کی حسرت کے جواب میں وہ فوراً بولا تھا۔ وہ بلند آواز میں خود کھائی کر رہی تھی۔

”اور اسی بات نے مجھے یہاں کھڑا رہنے پر مجبور کیا تھا۔ میرے باپا کسی میرے بچپن ہی میں نہیں چھوڑ گئے تھے۔ میں بھی انہیں اسی ہی کی طرح کس کرتا ہوں۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن آپ اس طرح کیوں سوچتی ہیں۔ آپ اکیلی تو نہیں ہیں۔ آپ کی والدہ، بہن، بھائی اور یقیناً بہت سے فریڈ تو آپ کے پاس ہیں اور ان فریڈ میں تازہ ترین اضافہ میں ہیں۔“

رمدیہ بڑی حسرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی

”کیا تم فریڈ نہیں ہیں؟“ اس کی حسرت کے جواب میں وہ سوالیہ انداز میں بولا تھا اور اسے محض حسرت میں گردن ہلاتی پڑی۔

”چلیں شہر، آپ نے یہ بات تو تسلیم کی۔ اب یہ بتائیں کس بات نے آپ کو اتنا ڈر پس کیا ہے۔“ وہ دوستانہ مسکراہٹ سمیت بولا تھا۔

”مجھ کی نہیں ہوں۔ بس ویسے ہی بابا یاد آنے لگے تھے۔“ وہ وضاحتی انداز میں بولی تو پھر پار گردن ہلا کر بولا۔ ”کوئی بات نہیں تھی تو پھر تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ ابھی اس ڈر کو چھوڑ دیں، یہ بتائیں آپ کیا پڑھاتی ہیں اور کس کو پڑھاتی ہیں۔ اس دن تو آپ رمدیہ کو چلی گئیں اور تعارف اور حارہ یاد کیا تھا۔“

وہ مسکراہٹ چہرے پر کھائے اسے دیکھ رہا تھا اور اپنا اس روز کا رد عمل اب رمدیہ کو بڑا ہی پکڑا محسوس ہو رہا تھا۔ اس لیے شرمندہ سے لہجے میں بولی۔

”میں ناراض تو نہیں ہوں تھی۔ آپ کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔“ اور جواب میں وہ اپنے مخصوص انداز میں بے لکڑی سے تجتبیہ لگا کر سن پڑا تھا۔

”چلیں مان لیا۔ آپ ناراض نہیں ہوئی تھیں۔ اب میرے سوال کا جواب بھی دے دیں۔“ وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے جھگڑ میں ماسٹر کرنے کے بعد رسوں کی کھین کا انگریزیم یاد کیا۔ دراصل مجھے شروع ہی سے ٹیچنگ پر پیش بہت پسند ہے۔ لیکن شپ پر اخواب تھا جو اللہ تعالیٰ نے پورا کر دیا۔ میں گورنمنٹ کالج میں تھوڑا تیر اور فورٹھ ایر کی اسٹوڈنٹس کو پونی اور زور زور پڑھاتی ہوں۔“ اس کے جواب میں وہ ستانی انداز میں بولا۔

”زبردست بھی، اس کا مطلب ہے اب پاکستان میں بھی لڑکیاں اپنے کیریئر اور پروفیشن کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے لگی ہیں۔ میں یہ تو بہت ہی پریزینٹیشن ہے۔“

”میں نے اپنا تو اپنا پورا پورا خیال کر دیا۔ آپ نے اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا۔“ کچھ دیر پہلے کا سوڈ ایک دم بدل گیا تھا وہ بڑے آرام سے کھڑی اس سے یوں باتیں کر رہی تھی جیسے یہاں آ کر کھڑی ہی اسی لیے ہوئی تھی۔

”میں نے یہی اسے کیا ہے۔ وہاں ڈلاس میں ابھی مناسب قسم کی چاب کر رہا تھا۔ پھر اچانک ہی مجھے

پاکستان سے بہت اچھی جاب ہوئے مقتول معاہدے اور دیگر ملکوں کے ساتھ آخر ہوئی تو میں نے انکار ہی نہیں کیا کہ ایک تو کلچر ہی بہت اچھا تھا۔ فرم کی اپنی رپورٹیں بھی بہت اچھی تھیں اور دوسرے یہ کہ میری کو بھی اب اپنا ملک بڑی شدتوں سے یاد آئے گا تھا۔ میں چار سال سے دو مہینے بیٹھے پاکستان کی میڈیاں، رمضان اور دیگر تہوارے تمام شایاد کرنے لگی تھیں۔ اب میں اتنا محبت و ملن تو ہوں نہیں کہ فوراً پاکستان آ جا تا اور یہاں آ کر نوکری کی تلاش کرتا مگر جب اتنی اچھی جاب آفر ہوئی وہ بھی اپنے ملک میں اور اتنی ساری ملکوں کے ساتھ تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہاں پر جس جگہ جاب کرتا تھا وہاں کا ٹنر کٹ کی مدت چھپے ہی فتم ہوئی، میں نے وہاں کی راہ لی۔ اس دوران یہ مگر وغیرہ میری کمی کی فراہم کر رہا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی کا فائل مسٹر ہو جانے تو وہ لوگ بھی یہاں آ جائیں گے۔ وہ بڑی تفصیل سے اپنے بارے میں بتا کر خاموش ہوا تو میوہ بے ساختہ ہوئی۔

”اور آپ کی سزا اور بیچے وغیرہ“

”دعا کریں، وہ بھی آ جائیں۔“ وہ ہنسی سے بولا۔

”کیوں کیا وہ پاکستان آنے پر رضی نہیں ہیں؟“ میوہ نے سوالیہ انداز میں کہا، پھر اس کے جواب دینے سے پہلے خود ہی بولی۔ ”یہی نہیں ایسا کرتا نہیں جاتے۔ آپ لوگوں کے پاس تو یقیناً امریکن شیشیلی ہوگی۔ اگر کسی جہ سے یہاں ایلی جہت نہ ہو سکے تو واپس جانے کا آپشن تو بہر حال موجود ہے ہی۔ انہیں آپ کے پاس آ کر رہنا چاہئے۔“ اس کے ان ہمدردانہ جملوں پر وہ اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بولا۔

”آپ کے بارے میں میری پہلی رائے بالکل ٹھیک تھی، آپ ایک بہت ہی اور دھڑلے دل خاتون ہیں۔“ اور اپنی اس تعریف پر وہ ایک دم مسکرا دی۔

”میرا خیال ہے رات کافی ہو گئی ہے اور ہم دونوں ہی صبح سویرے اٹھنا ہے۔“ شہریار کے کہنے پر اسے بھی دقت کا احساس ہوا تو شب بخیر کہتی اندر کمرے میں آ گئی۔

سونے کے لیے لیٹی تو اس کے دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ اس وقت شہریار کا لمٹا اور باتیں کرتا رہا یقیناً ہوا تھا۔ ”اس کے باتیں کرنے کا انداز لکھا اچھا ہے۔“ وہ سوچتی اپنا ہاتھ اوڑھ لے کر بولی۔ ”ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بہت اٹنا ہو۔“ اجنبیت یا غیریت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ”دوسرے سے پہلے تک اسی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔“

☆☆☆

اگلے روز ای کو کتنے جتن کو کہ سنایا یہ ایک اگلی داستان تھی۔ ای کو خوش کرنے کے لیے بچوں کو بھی روزانہ سے زیادہ دیکھ کر دھاتی رہی۔ کمرے میں آ کر بچی وقت گزارنے کے لیے کمپیوٹر ڈان کرنے بیٹھ گئی۔ کئی کمپیوٹر میں ماضی تھا۔ وہی اٹلٹ جیز پر کھماتا رہتا تھا۔ خود اسے اس بارے میں بس بنیادی باتیں ہی معلوم تھیں۔ اپنے مطلب کے Softwares وغیرہ سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ وہ اپنے کام میں مگن تھی، جب کوئی چیز آ کر کمپوز کی کھینچے سے کھنکھاتی تھی۔ میوہ نے فوراً مڑ کر دیکھا تو کمپوز کے کھلے پردوں سے اسے بالکونی میں کھڑا شہر یار نظر آیا۔ وہ اٹھ کر باہر بالکونی میں آئی۔ جھل پر پردہ اٹھتا ہوا سچرا لگی ہی نظر آ رہا تھا۔

”یہ آپ نے پھینکا ہے؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”ہاں میں نے پھینکا ہے۔ آپ کو مستحق کرنے کا اور کوئی مہذب طریقہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“ وہ صاف گوئی سے اقرار کر گیا۔

”بڑی فضول حرکت کی ہے آپ نے، اگر کیش نوٹ جاتا تو کتنا نقصان ہوتا۔“ وہ ہکا بوری سے بولی۔

”بے فکر رہیں۔“ وہاں تو نہیں۔۔۔ ویسے میں نے چھوٹ کا نشانہ لیا تھا۔ افسوس میرا نشانہ چوک کئی۔“

نقصان ہوا تو نہیں۔“ وہ بڑے آرام سے بولا تو میوہ کو دھیان آیا کہ اسے کام کیا تھا۔

”آپ کو مجھ سے کیا کام تھا؟“

”کام کوئی نہیں تھا۔ میں یوں رہ رہا تھا۔ آپ پر نظر پڑی تو میں نے کہا چلو آپ ہی کے کان کھائے جائیں۔ ویسے کمپیوٹر پر کیا کام ہوتا تھا۔“ وہ بالکونی کے کھلے دروازے سے نظر آتے مائیز پر نظر میں مرکوز ہو گیا۔

”کچھ نہیں۔“ یوں ہی غامض پاس کر رہی تھی۔ دراصل مجھے کمپیوٹر کے بارے میں اتنا پتا نہیں آج کل اپنے بیچے سے دیکھ رہی ہوں۔“ وہ جواب میں بولی۔

”ٹیک دم بے خوف ہے آپ کا بھتیجا۔ 2010ء میں آپ سے window-97 پر کام کر رہا ہے۔ میڈم وقت کے ساتھ چلتا کھینچیں۔ دیکھ رہی ہیں تو windows کے نئے ورژن پر کھینچیں۔ اچھا ایک منٹ غم نہ کریں۔ میں آتی آتا ہوں۔“

اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ اندر کمرے میں چلا گیا تھا۔ میوہ وہیں کھڑی اس کا انتظار کرتی سوچ رہی تھی کہ کہہ کیا کرنے گیا ہے۔ پانچ منٹ بعد اس کی واپس ہوئی تھی۔

”یہ میں سی ڈی میں آپ کی طرف اچھا رہا ہوں۔ براہ مہربانی اسے پاکستانی لٹیلرز کی طرح ڈراپ مت کر دیجئے گا۔ جیسے اس دن آپ اپنے بچے کو کچھ نہیں پڑھ کر گئی تھیں۔ جلیں، وہ تو کاغذ سے بچت ہو گئی تھی۔ آج مشکل ہو جائے گی۔“

”کیوں میں اس کا کیا کروں گی؟“ وہ فوراً بولی۔

”کرنا کیا ہے اس کا اپنا ڈال کر کھائے گا۔“ بھی اسی سی ڈی میں windows کا نیا ورژن ہے۔ اسے install کریں اور مجھے دو عین دیں۔ اچھا یہ پکڑیں۔“

اگلے لمبے وہ مشکل سی ڈی پکڑ پائی تھی۔

”شباباش، آپ میں ایک اچھا لٹلر بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔“ وہ اسے سراہ رہا تھا۔

”آپ کو یہ جلدی واپس تو نہیں جاتے، ابھی تو سی اپنے دوستوں کے ساتھ کرک کھینچنے گیا ہے۔ جب آئے گا تب اس سے install کراؤں گی۔“ اس کی بات پر شہر یار براہ راست ہٹا کر بولا۔

”اتنا بڑھکھ کر آپ اتنا کام ہی خود نہیں کر سکتیں، افسوس ہو رہا ہے مجھے۔ جو کام آپ کو بھتیجا کر سکتا ہے، وہ آپ کیوں نہیں، جلیں اسے خود install کریں میں آپ کا گائیڈ کر رہا ہوں۔“

اس کی بات پر میوہ اندر کمرے میں آ گئی اور سی ڈی لگا کر اس کے اگلے احکامات سننے واپس باہر آئی تھی۔ پھر اسے اچھی طرح سب سمجھا کر وہ یہ کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”اوکے، اب رات میں ملاقات ہوگی۔ پھر میں آپ سے پوچھوں گا۔ کیا ہوا یا کیا نہیں ہوا۔“ خود کرنے بیٹھی تو پتا چلا یہ کوئی اتنا بڑا اونگھا کام نہیں تھا۔ جو وہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ بڑے آرام سے اس نے یہ کام کر لیا تھا اور یہی بات رات اس نے شہر پار سے کہی۔

”یہی تو میں آپ سے کہہ رہا تھا۔ بلاوجہ اسنے سے کام کو آپ بھرا دیا تھا۔“

وہ خود کچھ کم منہ میں ڈالنے ہوئے بولا۔ بھرکھ خیال آنے پر اس سے بولا۔

”لیں ابھی کما نہیں۔“ وہ انکار کرنے والی تھی کہ اس نے خود کچھ اس کی طرف اچھال دی۔

”شکر ہے۔“ خود کچھ ہاتھ میں لے کر اس نے شہر پار ادا کیا تھا۔

☆☆☆

اس کی کوئی سزا سزا ہی کی بیٹی کی شادی تھی۔ عام طور پر وہ نکلتی وغیرہ میں جانے کی بہت چڑھی۔ مگر سمر عہاسی کی عہت بھرے اسرار کے سامنے اسے حاشی بھرنی ہی پڑی تھی۔ مہاراجہ کی صحت ساجت کر کے اسے ساتھ چلنے کے لیے آئے تھے اور کیا تھا۔ وہاں پہنچ کر سمر عہاسی کو مبارک باد دینے کے بعد وہ اپنی دیگر کوئیکز کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔ اسی بیٹھے بکھی ہوئی دیکر سمر عہاسی کی کسی نہ کی بڑی بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ بارکرا اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ ریشم نے مڑ کر دیکھا تو سامنے کھڑی فردا کو فوراً ہی پہچان گئی تھی۔ وہ چلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور اگلے ہی دونوں ایک دوسرے کو گلے لگے خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ فردا اور وہ کالج تک ایک ساتھ رہی تھیں۔ پھر بی ایس سی کے بعد جب فردا کے پایا کا اسلام آباد پڑنا سفر ہو گیا تو ان دونوں کا آپس میں رابطہ بھی ختم ہو گیا۔ شروع شروع میں خط و کتابت وغیرہ ہوئی، مگر پھر آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور دونوں ایک دوسرے سے دوبارہ بھی میل نہیں ملے۔

”فردا صوفی بالکل ویسی کی ویسی ہو۔ مجھے پچھانے میں بالکل بھی دیر نہیں لگی۔“ ریشم اس کے ہاتھ قلم کر رہی تھی۔

”تم بھی بالکل نہیں بدلیں۔ وہی شاندار انداز، وہی چہرے پر مستحضر دور کی شہزادوں والی محنت۔ میں نے دوری سے پہچان لیا تھا کہ یہ ہماری پرنس کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔“

فردا کے ان الفاظ پر وہ ایک دم جیسٹ گئی تھی اور وہ اس کی شکل دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

”ابھی تک ویسی کی ویسی ہو۔“ اس کی تمام کوئیکز بڑی دہچکی سے ان لوگوں کی طرف دیکھ رہی تھیں ریشم کو اس بات کا خیال آیا تو ان لوگوں کا فردا سے تعارف کروایا۔ سب سے دعا سلام کرنے کے بعد فردا بھی وہیں ان لوگوں کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”فرزٹ انیر سے لے کر بی ایس سی فائل تک ہم لوگ ایک ساتھ رہے۔ ریشم ہمارے کالج کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ دینے تو اور بھی بہت ہی لڑائیں تھیں جو کافی خوبصورت تھیں مگر اس کی بات ہی اور تھی۔ اس کا تو انداز ہی شاندار تھا۔ آپ لوگ یقین کریں میں نے اس سے دوستی بھی صرف اس کی خوبصورتی کی وجہ سے کی تھی۔“

فردا نے مخصوص انداز میں بولی تو وہ شرمندہ سے لہجے میں سے نکلے گی۔

”کیا فضول باتیں کر رہی ہو تم۔“

”کوئی فضول بات نہیں ہے۔ میں تمہاری کوئیکز کو تمہاری سنجیدگی سے ہمارے میں بتا رہی ہوں۔ ہمارے کالج کے سالانہ فنکشن میں جیپینر Play (پلے) اسٹیج کیا گیا تھا۔ اس میں تلو طبرہ کے بدلے کے لیے کئی ساری لڑکیاں نے ہاتھ پاؤں مارے۔ منجھڑ کی خوشامد کی مگر ہماری ڈرامے کی منجھڑ کے صاف صاف کھدیا کھو بیٹھ، ریشم کے علاوہ اور کوئی نہیں بنے گی۔ ریشم ہمارے پاس کبھی جس اس فنکشن کی تصویریں۔ میں نے تو اب تک سنبھال کر رکھی ہیں۔“

فردا ان اسٹاپ ہوئے میں سے صرف دو تھی اور اس کی تمام کوئیکز ہی دیکھی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

”اچھا ریشم نے تمہیں یہ سب بھی نہیں بتایا۔“ سمر انصاری نے بے ساختہ کہا تو فردا بولی۔

”ابھی تو میں آپ کو اور بھی بہت سی باتیں بتاؤں گی جو اس نے یقیناً آپ کو نہیں سہی۔ سوئی۔ ای فنکشن کی تصویریں دیکھ کر میرا کزن دل دہان سے شرمندہ پڑا ہو گیا تھا۔ وہ تو ہندو پنڈل پیچنے کے لیے ہماری طرح تیار تھا مگر یہ اڑھیس کلا بھی تو مجھے تھمتے پڑتا ہے۔“

فردا کی ان باتوں پر وہ درحقیقت شرمندہ ہو رہی تھی۔ مگر پچھانیں کچھ ایسی تھیں کہ اسے کوئی بھی نہیں سکتی تھی۔

”ارے تمہارے کیاں کیاں ہیں۔ مجھے ملو آؤ میں بھی تو دیکھوں پرنسز کے پرش آخر یہ کیسے؟“ فردا کی اس بات پر وہ ایک لمحے کے لیے بالکل چپ رہ گئی تھی۔ وہ جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”بھئی پرش ایسی تک ہماری زندگی میں آئے ہی نہیں ہیں۔ اس لیے آپ کو ان سے نہیں ملوایا جا سکتا۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ خود کو دیکر نڈر کر پڑا۔ فردا اس سے بولی اور فردا حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی ایک دو منٹ کی حیرت کے بعد وہ اس سے بولی۔

”اچھا آؤ میں تمہیں اپنے شوہر اور بچوں سے ملو آؤ۔“ وہ فردا کے ساتھ اس کے شوہر سے ملنے کے لیے اپنی کوئیکز سے اٹھ کر نڈر کر پڑی تھی تو وہ اس کا ہاتھ قلم کر کے بڑھی۔

”ریشم! کیا واقعی تمہاری شادی نہیں ہوئی؟“ فردا اس طرح بولی جیسے یہ بی بی کا قائل یقین بات تھی۔

”ہاں۔“ اس کا جواب بڑھ کر تھا۔

”مگر کیوں تمہارے لیے تو اس وقت کالج کے دنوں ہی میں سکتے پر ہارل آیا کرتے تھے۔ کالج کی کتنی لڑکیاں اپنے بھائیوں کے لئے تمہارے گھر آتی تھیں، پھر ایسی کیا بات ہوئی کرتے تھے ابھی تک شادی نہیں کی۔ کیا ان سب میں سے کوئی ایک بھی تمہارے معیار کا نہیں تھا۔“ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس بات سے بہت صدمہ پہنچا ہے۔

”میں سبھی سمجھ لو۔“ وہ گھر گول حوالہ دے کر خاموش ہو گئی تھی۔ فردا نے اس کا اپنے شوہر سے تعارف کر دیا تو وہ بڑی خوش اخلاقی سے ریشم سے ملا۔ اسے کھر آنے کی دعوت دی جو اس نے قبول کر لی۔

فردا کے دو بیٹے تھے۔ جی بی جی چار سال کی تھی اور بیٹا دو دو سال کا۔ اس کے بیٹے بھی اسی کی طرح صحت مند اور سرخ و سفید تھے۔ باقی وقت ریشم فردا سے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہی تھی۔ ریشم نے محسوس کیا کہ فردا اس سے کچھ پوچھنا چاہتی ہے مگر شاید اپنے شوہر کی وجہ سے پوچھ نہیں پا رہی۔ وہ کیا پوچھنا چاہتی تھی یہ بات اسے ابھی طرح معلوم تھی۔

اس روز فردا وغیرہ سے رخصت ہو کر جب وہ گھر واپس آئی تو ایسا لگ رہا تھا جیسے دل پر کوئی بوجھ ہوا۔ اپنا آپ

بڑا خالی خالی اور ایلا لگا تھا۔ فردا کے بچوں کو دیکھ کر اسے عجیب سی کی کا احساس ہوا تھا۔ ایک ایسا بات جسے آپ لامبھوری بلور پر محسوس کرتے ہوں، مگر خود سے بھی اس کا اظہار نہ کریں۔ وہی بات کسی اور کے منہ سے سن کر وہ چیز زیادہ ہی محسوس ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ سختی ہی دیر تک کھڑی خود کو آئینے میں دیکھتی رہی تھی۔ فردا کے یاد دلانے پر اسے کالج اور پھر یونیورسٹی کی کتنی ہی باتیں یاد آئے تھیں۔ اس کی فریڈ زاس کے پیچھے گرا رہا کرتی تھیں۔
”تم ہاں کس چیز سے دھوٹی ہو؟ میں بھی بتاؤ۔ تمہاری اسکن اتنی اچھی اور فریش کیسے ہے۔ تم کون سا ماسک لگاتی ہو؟“

اور وہ انھیں لاکھ لاکھ دلاتی کہ وہ کسی قسم کی کوئی کھیر نہیں کرتی مگر انھیں کبھی بھی یقین نہیں آتا تھا۔ پھر جب فردا کے کزن نے اسے پسند کر کے پروپاز کرنے کی بات کی تو اس کی فریڈ زاس پر رنگ کر دی تھیں اور میوہ نے بھانے خوش ہونے کے نامواری کا اظہار کیا تھا۔

”مجھے ابھی بہت پرہیز ہے۔ اپنے کزن سے کہو میرا چھپا چھوڑ دے۔“ بعد میں جب فردا کا کزن واپس لندن چلا گیا تو سب فریڈ زاس نے بڑا افسوس کیا تھا۔ پھر اس کا وطن اور پر سکون اعزاز دیکھ کر سب ہی کو یقین کر پڑا تھا کہ وہ کبھی نہیں رہی تھی اسے اور حقیقت فردا کے کزن سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کلثوم، اس کی بیٹھ فریڈ جس نے ماسٹرز اس کے ساتھ ہی کیا تھا اس کو کہا کرتی تھی۔

”دیکھ لیتا، وہ کوئی بہت ہی منفرد و پابند ہو گا جسے اللہ تعالیٰ نے آکھٹلی تمہارے ہی لیے بنایا ہو گا۔ جب وہ آئے گا تو میرے انکار و تکار اور یہ اثرات سب بھول جاؤ گی۔ وہ یونانی دیوتاؤں کی سی ہی بان والا آئے گا اور آکر تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔“

اور وہ اس کی ان بیٹھان گوئیوں پر فخر دیا کرتی تھی۔ پھر ایک ایک کر کے اس کی تمام فریڈ ز کی شادیوں ہوتی چلی گئیں اور شادی کے بعد کی مصروفیات میں لگ کر آپس میں مل ملاپ بھی بہت کم رہ گیا تو وہ یہ تمام باتیں بھی وقت کے ساتھ ساتھ بھولتی چلی گئی۔ آج باقی کے اوراق کلمے لکھتی ہوئی تو کزن سے وقت کی ایک بات یاد آتی چلی گئی۔
اپنے اہم ایس کی مکمل کرنے تک تو وہ کسی بھی قیمت پر شادی کے لیے تیار نہ تھی۔ اپنا کیر بے تانے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ ان دنوں اس کے لیے بے تھا شام شمع آئی کرے جنھیں اس کی رنجش کر دیا کرتیں۔ اڑتی اڑتی اس کی قسم کی خبریں اسے پہنچا جاتی تھیں۔ وہ کسی کے گھر یا محلے کے سلاخ دھیرہ میں بھی جاتی تو آکر بعد میں وہاں سے اس کے لیے کوئی نہ کوئی رشٹ آجاتا۔ ان دنوں عاشر اور ارباب سے بنے ان لوگوں کے پاس آئے تھے۔ میوہ کا زیادہ وقت باتو بچوں کے ساتھ گزارتا یا پھر کمر کی مضافی اور کھانا دھیرہ پکانے میں۔ پھر جب اس کا ایس کی کا زارت نکلا اور وہ فرسٹ ڈویژن کے ساتھ کامیاب بھی ہو گئی تو اس نے پبلک سروس کمیشن کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ انجیا کے بیچے، ہمایا کے بیچے، اکی کی دیکھ بھال اور کمر کا تمام کام کاغذ جودہ پہلے تو بخیر سنی کے ہوں میں بھی بڑی ذمہ داری سے کرتی تھی اب اور زیادہ لگن سے تمام کام کرنے لگی تھی۔ اکی کو اس وقت کمر فریڈ کی تو کوئی تکلیف نہ تھی مگر ان کا ہلڈ پریش اور کلچرنگ حد تک بیک رہتا تھا اس لیے وہ زیادہ کام دھیرہ دیکھ کر کتنی تھیں۔ آہستہ آہستہ ہما بھی نے تمام ذمہ داریاں اس کے کندھوں پر ڈال دیں اور خود کو کھر کے پیشتر کاموں سے بری الذمہ ہو گئیں۔ وہ خوش خوشی ہر ذمہ داری قبول کرتی چلی گئی۔ وقت گزارتا رہا۔ بے تھا شام

آئے والے رشتوں میں بھرتی نہ کی آئے گی۔ مگر ان کبھی بھار کے آنے والوں کو بھی مجھ سے کچھ کہہ کر اسی رنجش کر دیا کرتیں۔ ایک دو بار ایسا ہوا کہ اسی رشتی ہو گئی اور ایسے میں اپنا کافون آگیا اور انہوں نے تمام تعلقات جان کر کہا۔
”امی! کیا ہو گیا ہے آپ کو کیا ہماری نازوں میں حسین بہن کے لیے اسے فضول قسم کے رشتے ہی رہ گئے ہیں۔ ایسی کبھی کسی اس کی عمر نہیں گزری جا رہی۔ سن کر میں ان لوگوں کو۔“
اور اسی جھٹ ان لوگوں کو انکار کر دیا کرتیں۔ کبھی بھی یہ معاملہ اس حد تک بڑھا ہی نہیں کہ اس کی رائے معلوم کرنے کی نوبت آتی۔ پہلے ہی سرطے پر انکار ہو جاتا اور بات وہیں ختم۔

شروع شروع میں ریوہ نے اس بات کو زیادہ محسوس نہیں بھی کیا۔ مگر زرتے وقت کے ساتھ ساتھ اسے احساس ہوا کہ کبھی نہیں دیکھیں مجھ سے کچھ نظر ضرور ہے۔ وہ صاف دل کی لڑکی تھی۔ اسے لوگوں کی چالاکیاں، دکھایاں اور چھل فریب والی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر اتنا تو اس نے محسوس کر ہی اٹھا کہ ہر بار انکار کر دینے میں سب سے اہم کردار اپنا کا ہوتا ہے۔ وہ ایسا کیوں کرتی تھیں یہ بات سمجھے سے وہ قاصر تھی۔

شروع میں ایک دو بار ہمایا نے اکی کو کھانے کی کوشش کی مگر اسی الٹا ان ہی پر چڑھ دھڑکی۔
”ہاں ہاں بہن کا دودھ بوجھ لیتے لگا ہے۔ سب چاہے مجھے۔ یہ کسی کی زبان بول رہے ہو تم۔“

اور اسی کے اس طعنے پر ہمایا بے چارے فوراً بچے ہو گئے تھے۔ پھر اس کے بعد انہوں نے اس معاملے میں کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ ہما بھی اس معاملے میں خاموش تماشائی تھیں۔

اب تو وہ کبھی بھار کے بولے پھیلنے آنے والے بھی تقریباً غائب ہو گئے تھے۔ گھر میں کسی کے بھی منہ سے اس نے کبھی اپنی شادی کی باتیں نہیں کہیں۔ اس کی ایک دو کلیر جن کی شادیاں لیٹ ہو گئی تھیں اسے بتاتی تھیں کہ ان کی مائیں ان کی شادیوں کے لیے سخت پریشان ہیں۔

”بھیری امی تو میرے لیے ”یا لطیف“ کا فائدہ پا رہی ہیں۔“ تاکہ بات تو دوسری کہتی۔
”بھیری امی سورہ قادر و عشار کی نماز کے بعد پڑھ کر میرے رشتے کے لیے دعا کرتی ہیں۔“

اور وہ حیرت سے انھیں ذکر پڑھ کر دھاتی۔ یہاں تک کہ ایک دو بار ہما بھی نے سمجھ کی کٹھن دھیرہ کی بات کی تھی مگر اس کا کہیں ذکر نہیں ہوا تھا۔ اس کے سامنے کی بچی کا رشٹ اس کے ماں باپ طے کرنے والے تھے اور وہ خود؟ یہ کیسی زندگی تھی، ایسی کتنی خاموش۔ اس کی دو دھیں بھار کی تھیں۔

”تمہارے ماما کو تو کبھی تم پر غصہ ہی نہیں آیا کرے گا۔ ہم جب نکلیاں ہو کر تو پر دل و جان سے عاشق رہتی ہیں تو وہ تو بس تمہارا دھیان نہ ہو گا۔ تم اسے اپنے انھیں نہ چننا یا کرنا۔“

اور وہ ان لوگوں کی باتوں پر مسکرا کر دھ گیا کرتی تھیں۔ آج فردا کے طعنے پر اسے کتنی ہی گزری باتیں یاد آتی تھیں۔ وہ باہر جنھیں وہ اپنی زندگی کی مصروفیات میں کو کھ بھول جاتی تھی۔ وہ بھول جاتی تھی کہ وہ بھی ایک زندہ وجود ہے جس کے اپنے جذبات اور احساسات ہیں۔ جو زندگی میں اپنے لیے بہت کچھ چاہتا ہے۔ وہ اپنی اس سوچوں سے گھبرا کر ایک دم آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

"یہ بات صبح صبح کسی کا منہ دیکھتے پر کہی جاتی ہے۔ جبکہ اس وقت تو شام ہو چکی ہے۔" رمیو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اوسے یہ محاورے اور اس قسم کی دیگر باتیں کوئی آسمان سے توخوڑی اتری ہیں کہ ان میں ترمیم نہ کی جائے۔" وہ لاپرواہی سے بولا۔ "خیر آپ سنا ہیے کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں وہی روٹیں کا کام کل کے پچھڑے تیار کر رہی تھی۔" وہ کچھ بیزاری سے بولی تو شیر یار کہنے لگا۔

"گنتا ہے آپ روٹیں لائف سے تنگ آگئی ہیں۔ ایسا کہیں کچھ دنوں کے لیے کہیں ملی اسٹیشن پر آؤ گنگ کے لیے جلی جائیں، فریش ہو جائیں گی۔" اس کے پرطنس انداز پر رمیو مسکرا دی۔

"یہ بات سوچی تو جا سکتی ہے۔ عطا ایسا کہنہ تقریباً ناممکن ہی ہے۔"

"کیوں، اس میں ناممکن کیا ہے؟" وہ حیران ہوا تھا۔

"میں نے آپ کو بتایا تو تھا میری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، مجھے یہ ان کی دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے۔ میں انہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔" رمیو نے وضاحت کی تو وہ اسے ٹوکنے ہوئے بولا۔

"لیکن اس طرح تو آپ انجسٹ ہو جائیں گی، توخوڑی بہت تفریح تو ضرور کرنی چاہئے۔ آپ کے گھر میں اور بھی تو لوگ ہیں۔ ساری ذمہ داری آپ نے اکیلے اٹھانی ہوئی ہے۔ سب مل جل کر ذمہ داری اٹھائیں تو کسی پر بھی بوجھ نہیں پڑتا اور اس سے آپس میں محبت بھی بڑھتی ہے۔"

وہ صاف کوئی سے دھوکہ انداز میں بولا تو رمیو اس کا ٹپک توخم کرنے کے خیال سے بولی۔

"پلیس میں کوشش کروں گی کہ آپ کے مشورے پر عمل کروں اور میری ابا بھت آباد وغیرہ تک ہواؤں۔"

شیر یار اس کا انداز محسوس کر کے ہنس دیا۔ صاف لگ رہا تھا وہ صرف بات ختم کرنے کے لیے اس طرح بولی تھی۔ کچھ دیر وہ دونوں یوں ہی باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے اچانک رمیو ہی اس بات کا خیال آیا کہ وہ ابھی تمکا ہارا آؤس سے آیا ہے۔ اس نے ابھی پکڑنے نہیں بھی بھیجے تھے تو اس سے بولی۔

"آپ ابھی ابھی آؤس سے آئے ہیں اور میں نے آپ کو باتوں میں لگایا۔ پلیز آپ فریش ہوں جا کر۔"

پھر وہ خود بھی اندر آگئی۔ رات میں سونے کے لیے لیٹتی ہی تھی کہ کمر کی پر کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ آج وہ حیران نہیں ہوئی تھی جتنا تھا یہ شہر یار کی حرکت ہے وہ اندھ کر باہر آئی تو وہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"آج میرا نائٹ نہیں چوکا دیکھ لیں، آپ کا شیشہ بالکل سلاست ہے۔"

"شیشہ تو سلاست ہے۔ آپ یہ بتائیں مجھے بلایا کیوں ہے؟" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اسکالہ کی پینچنگ کی تازہ ترین صورت حال معلوم کرنی تھی۔ علاوہ ازیں پاکستان میں آنے والے وزٹرز اور اس کے اثرات پر کنٹرول کرنی تھی اس کے علاوہ۔" وہ بڑا جمل کر بول رہا تھا جب رمیو کے بے ساختہ قہقیرے نے اسے اپنی ادھوری بات چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔

"بھئی ایسے ہیں جیسے ہادی مصروف غصیت تھوڑا کیا آپ سے بات کرنے کے لیے کسی کا قاعدہ ایجنڈے کی ضرورت ہوا کہہ کرے گی۔ کہا بندہ بوجھنی شب نہیں کر سکتا۔" اس کے اس شکوے پر وہ فوراً مصطفیٰ انداز میں بولی۔

"آئی ایم سوری۔" مجھ سے غلطی ہوئی۔ آئندہ یہ بات بھی نہیں کہوں گی۔" اس کی محضت پر وہ مسکراتا ہوا چپ ہو گیا۔

"کہہ دو دیا سوری۔" اب کے وہ چڑکی تھی۔ اس سے پہلے کہ شیر یار جواب میں کچھ کہتا رمیو کے کمرے کا دروازہ کھولتی سمیعہ اندر آئی تھی وہ فوراً کمرے میں واپس آگئی۔ "میں حیران ہو رہی تھی کہ آپ کمرے سے کہاں گئیں۔" واٹس روم کا دروازہ بھی کھلا ہے۔" وہ صوبے پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں میں بس بیٹھیں تھی۔" پتائیں کیوں اسے ایسا لگا جیسے وہ کوئی چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے جبکہ سمیعہ اس کے اثرات سے بے خبر آرام سے بیٹھی تھی۔

"اچھا یہ ہیں ہمارے نئے پردی۔" سمیعہ نے اندر کمرے میں جاتے ہوئے شیر یار کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ وضاحتی انداز میں بولی۔

"میری بھی آج فرسٹ ٹائم ملاقات ہوئی ہے۔ بظاہر تو اچھے لوگ لگ رہے ہیں، خیر ہمیں کیا چھبے بھی ہوں۔ ہمارے دل ہی تو بے کسی بلک سا بیٹھ رہا ہے۔" وہ اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے بولی تو سمیعہ بھی گردن ہلا کر کہنے لگی۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، ویسے بھی سب سے زیادہ آپ کو ہی ان لوگوں سے فرق پڑے گا۔ ہم سب کے پیڑ و موٹو پیچے ہیں اور میں وغیرہ کے بھی سامنے ہیں اور آپ کی بھی کسی سے لڑائی ہوئی نہیں کسی اس لیے لگ رہی کوئی بات نہیں۔ وہ میری فرینڈ ہے ناز بگل، بتا ہے کیا کہہ رہی تھی؟"

سمیعہ اپنی بات کوئی عادت کے مطابق شروع ہو چکی تھی اور رمیو نے سکون کا سانس لیتے ہوئے اس کی باتوں میں دلچسپی لیٹی شروع کر دی تھی۔ سمیعہ یوں ہی باتیں کرنے کے لیے آئی تھی۔ کانی بید بعد جب وہ اندھ کر گئی اور وہ لائٹ آف کر کے سونے لگی تو خود سے تخت نامہ قاضی۔

"سب کیا تھا، کیا اسے ایسی حرکتیں کرنا زیب دیتا تھا۔ اسے اور کچھ نہ کہی، اپنے سر پیے ہی کا خیال کر لیتا چاہے تھا۔" لیکن اگرچہ تھا جب اسے کسی سے جھوٹ پوچھنا پڑا تھا۔ اپنی کسی حرکت کی پر وہ پوچی کرنا بڑی تھی اور یہ سب اسے بہت بُرا لگ رہا تھا۔ ایسی حرکتیں تو اس نے اس وقت نہیں کی تھیں جب اس کی عمر میں اس عمر میں وہ یہ سب اسے بہت بُرا لگ رہا تھا۔ اگلے مہینے وہ پورے تیس سال کی ہوئے تھی۔ اور اس اوج میں تو بڑے سے بڑے شروع اور لاپرواہی لوگ بھی تنبیہ ہو جاتے ہیں اور وہ انہی فضول حرکتیں کر رہی تھیں۔ وہ خود سے تنہا ہوئی تھی۔ وہ اپنی اسٹوڈنٹس کو کس منہ سے کوئی نصیحت کر سکتی تھی، اگر وہ خواہی چپ کر سکتیں کرے گی۔

اسے شہر یار سے ملے پر آپرکاب ہفتہ ہو گیا تھا۔ اس نے شام کے وقت بالکلٹی میں بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ اپنے کمرے کی کھڑکیاں اور پردے وہ ہر وقت بند کر کے تھی، اور جو بات اسے سمجھنا ہٹ میں جھلا کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ ایسا وہ خود پر کر کے کر رہی تھی۔ وہ جوں جوں ہر وقت گنتا نے چاہنے لگا تھا۔ خود بخود وہ خود ہوش رہنے لگی تھی وہ ساری کیفیات بکھر کر ہو گئی تھیں۔ اب ہر وقت دل پر ابدی ذرا بھائے رہتی تھی۔ اس دوران وہ تین مرتبہ رات کے وقت اسے کمرے پر کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز بھی سنائی دی تھی، مگر وہ منہ سر پیٹے سہز میں دبی رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود کو کوئی سزا دے رہی ہے۔ کچھ صبح میں بھی اس پر عجیب سی کوفت سوار رہی۔ خواہ مخواہ ہر کسی سے لڑنے کو دل

چاہے لگا تھا اس کی کوئٹہ اور اسٹیشن اس کے بڑا راز اعجاز پر حیران تھیں۔ اس کی خوش مزاجی اور دھما اعجاز پر جگہ متبادل تھا۔ وہ خود سے لڑے لڑے تھک گئی تھی۔ خواہے آپ کو کوئی بات سمجھنا سنا مشکل کام ہے۔ یہ بات اس نے اپن جانی تھی۔ اس رات وہ خود کو بھلا رہی تھی، سمجھا رہی تھی۔ اپنے آپ کو بار بار دہرائی تھی۔

"یہ کوئی محبت و محبت نہیں ہے۔ صرف اور صرف یہ ہے کہ میں ان دونوں کی فریڈ کی کی بہت زیادہ محسوس کرنے لگی ہوں۔ مجھے اکیلا پن سنا ہے۔ اے میں اس سے باتیں کر لیتی ہوں اور اس سے باتیں کر کے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جیسے پر سوار کیا جائے۔" اس نے خود کو دانا تھا۔

اچانک وہ کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور پردہ ذرا سنا کر باہر جھانک اس کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھیں۔ وہ رات گئے جینز پر جھونک کر کتاب پڑھنے میں مگن تھا۔ کتنی ہی دیر تک کھڑی وہ اسے دیکھتی رہی۔ اپنی اس بے اعتدالی کیفیت کا احساس ہوا تو وہ فوراً پردہ چھوڑ کر بیٹھ گئی۔ اسی وقت اس نے شہر یاری کی آواز سنی۔ وہ اپنی نظریں کتاب پر سے ہٹا کر اسے گردن گھما کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"رمیو!" وہ ایک دم چیخے گا تاہم باہر سے کوئی نہ سنے گی۔ مگر کوئی طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ بڑے تھکے تھکے قدموں سے چلتی اور دائرہ کھول کر باہر نکل آئی تھی۔ اس کا دل عجیب متضاد کیفیات کا شکار تھا۔ وہ بیک وقت خوش تھی مگر اور اس کا بھی۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی گہری سوچ کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ رمیو سر جھکا کر خاموش کھڑی تھی۔

"کیا ہوا ہے۔ کیا میری کوئی بات بری لگی ہے۔ پلیز جیسی بات ہے مجھے متاؤد میرے ساتھ اس طرح مت کرو۔"

رمیو نے اسے اس سے پہلے کبھی بھی اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر دم بیٹھے بیٹھے والا انسان اس وقت بے حد الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کی کوشش کی تو بجائے الفاظ کے انکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اس وقت شاید خود پر دھکا لگا کر اتنی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس کے سامنے روکنے سے روکنا چاہتی تھی مگر ایسا کرنے سے قاصر تھی۔ دوسرے جھگڑے الٹک بھاری تھی اور اسے روتا دیکھ کر یہی طرح پریشان ہو گیا تھا۔

"خدا کے لیے مجھے متاؤد تو کسی، ہوا کیا ہے؟" وہ چیخ اٹھا اور اس کے چیخنے پر وہ ایک دم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا۔ بس آپ میرا چھوڑ چھوڑ دیں۔ آپ یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔ میں آپ سے کبھی بھی بات نہیں چاہتی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں چلائی۔

"کیوں چلا جاؤں، کیا کیا ہے میں نے؟ کیا ہوا کیا ہے میں نے تمہارے ساتھ؟" وہ ایک دم غصے میں آ گیا۔ "آپ میری بے بسکون زندگی کو اضطراب کر رہے ہیں۔ میں بہت سکون سے رہتی تھی۔ مجھے دینے ہی رہے۔ میں آپ اس طرح کیوں مٹے ہیں جیسے میں آپ کے لیے بہت اہم ہوں۔ مجھے سمجھو، میں نا اور باتیں کرنا آپ کے لیے بہت ہی غصہ ہے۔" وہ آپ کیوں کرتے ہیں ایسا؟" وہ اپنے آنسو بے دردی سے صاف کرتے ہوئے

"میں اس لیے اس طرح ملتا ہوں کیونکہ تم واقعی میرے لیے بہت اہم ہو۔ باتیں سے ملنا اور تم سے باتیں کرنا مجھے خوش دیتا ہے اور اگر میں ایسا کرنا ہوں تو اس سب میں برائی کیا ہے۔ میں نے اپنی عمر کے تینتیس سال اپنے کیریر پر اور پرورش کی محنت میں گزار دیے۔ شادی کے بارے میں میرا نظریہ تھا کہ جب تک مجھے کوئی اس حد تک اچھا نہ لگے کہ مجھے اپنی زندگی میں اس کی محسوس ہونے لگے میں شادی نہیں کروں گا۔ میری شادی کی شدہ خواہش رکھنے کے باوجود مجھے مجھے اس بات کے لیے قائل نہ کر سکیں کہ میں ان کی پسند کی لڑکی سے شادی کر لوں۔ شیخ صاحب سے یہ مکان خریدنے کے سلسلے میں یہاں آیا اور جب میں نے انہیں یہیں اسی بالکونی میں بیٹھے دیکھا تھا۔ تم خود میں گھس اپنا کام کر رہی تھیں اور اسی وقت مجھے خود میں گھس وکٹس وجود نے اپنی پلٹ میں لے لیا تھا۔ تم نے کبھی سوچا کہ پورا کچھ چھوڑ کر میں نے اپنے لیے فرسٹ فلور پر بے ایس کر کے انتخاب کیا۔ صرف تمہاری وجہ سے۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ تمہارے بارے میں جانا چاہتا تھا۔ تمہیں تو پتا نہیں ہو گیا یہاں شفت ہونے کے بعد کتنی میرے صرف تمہیں دیکھنے کے لیے میں بالکونی میں آیا کرتا تھا۔ پھر ایک روز تمہارے پیچھے اڑ کر یہاں آ گئے اور مجھے تم سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ مجھے جیسے تم سے ملنا کی تمہاری دل اور غریباں مجھے پتا چلتی تھی کہ میں اور میں نے جانا کہ میرا انتخاب بالکل درست تھا۔ میں تم سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہیں ایک دم پتا نہیں کیا ہو گیا۔ میں نے تمہیں بلانے کی کتنی کوشش کی مگر تم نے ہر بار مجھے ہٹا دیا۔ کیونکہ رمیو! اس طرح کیوں کر رہی ہو کی کوئی نہ کرنا اتنا بڑا گناہ ہے۔ کیا میں نے کوئی برا کام کیا ہے؟ اس روز جب تم بالکونی میں بیٹھی میرا انتظار کرتی میرے کمرے میں دیکھ رہی تھیں تو میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ مجھے اس بات کا اطمینان ہو گیا تھا کہ تمہارے دل میں بھی میرے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔ پھر اب ایسا کیا ہوا ہے جو تمہیں پریشان کر رہا ہے۔"

اس نے بڑے جوشے انداز میں اپنی بات شروع کی تھی، مگر آخر میں ایک مرتبہ پھر اس کا لہجہ وہی دوستانہ سا ہو گیا تھا۔ وہ مختصر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے پوری اس بات کی دیکھ رہا تھا۔ وہ جواب میں کچھ نہ کہی۔

"رمیو! میری بات کا جواب دو۔" وہ انتظار سے عک آ کر بولا۔

"مجھے کچھ نہیں پتا۔ میں بس اس بات جانتی ہوں کہ میں نے انجڑ والی کر سکیں کرنا مجھے زیب نہیں دیتا۔" وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے بولی۔

"کیسا کیا ہے شادی کرنا میں انجڑ والی حرکت ہے۔ میں تمہارے ساتھ کوئی ایٹھ نہیں چلا رہا۔ میں نے کبھی کو تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔ کل ہی امی اور ملو پاکستان آئے ہیں۔ امی تو فوراً تمہارے گھر آنے کے لیے تیار تھیں۔ میں نے انہیں روک دیا۔ میں تم سے اس بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ تم سے تمہارے اس گریز کی وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ پلیز رمیو! اس طرح مجھے انکورت کر دو۔ ایسا کر کے تم صرف مجھے ہی نہیں خود کو بھی دکھ پہنچا رہی ہو۔ تمہارے آنسو اس بات کی سب سے بڑی گواہی ہیں۔ خود سے جھوٹ بولو۔"

وہ بڑی آس سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رمیو نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگا۔

"میں کی کو تمہارے گھر پہنچ دوں؟" وہ اس کی آنکھوں کا اپنی نظروں کی گرفت میں لینے ہوئے بولا اور وہ خود سے کیے تمام عہد بھلائے گردن ہلانے کی طرف وہ خوشی سے دھپانہ ہو گیا تھا۔

”جھٹک گاؤں میں نے یہ معرکہ تو سر کیا۔ اس سے آسان تو ایسا رستہ کرنا ہوگا۔ لڑائی اچھی تھی۔ مشکل کیوں ہو؟“
 اور وہ ایک ہل سے زیادہ اس کے سامنے غریب نہیں نکلی تھی۔ ان متناطسی لگا ہوں سے اس وقت وہ سخت کٹھنیز
 ہو رہی تھی۔ پیچھے سے وہ اسے آواز دینا دیکھ کر وہاں سے ہٹ کر بھاگ گیا۔ دل ابھی تک تیز تیز
 دھڑک رہا تھا۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ سب اتنا چٹک کیسے ہو گیا۔ وہ اتنی آسانی سے کیسے بار بار نکلی اور وہ شہر بار
 اور قینا دلوں کو دل کرنے کے تمام کر جاتا تھا۔ اس نے اسے جیت لیا تھا۔ وہ کہہ لیتا وہ کوئی بہت ہی مشہور سامانہ ہوگا۔
 جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی شہر کے لیے بنایا ہوگا۔ جب آئے گا تو تم یہ انکار دو گار سب بھول جاؤ گی۔ وہ یونانی
 ڈیوٹوں کی سی آن بان والا آئے گا اور اگر تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔“
 حکوم کے برسوں پہلے کچھ مجھے جہلوں کی بازگشت آج بھی اس کی کانوں میں گونج رہی تھی۔ کتنے دنوں بعد
 وہ برسوں کو سوسنے لگتی تھی۔ آج اسے خواب دیکھتے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ بند آنکھوں کے پیچھے نظر آ رہا تھا کہ
 قصور سے وہ پیچھا چھڑانے کی شعوری کوشش نہیں کر رہی تھی۔

☆☆☆

صبح ہال سلطانی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ شہر ایک دیکھ کر وہ ایک دم بٹنے لگی تو وہ فوراً بولا۔
 ”مجھ سے بات نہیں کرنی تو مت کرو۔ مجھے صرف یہ پیغام دینا تھا کہ آج شام کی تمہارے کھر آئیں گی۔“
 اس کے بٹنے سے پہلے وہ خود اکر بس میں چلا گیا تھا۔
 اس روز شام کا انتظار کرتا ہے اسے ہوا سی لگن لگن ایسا لگ رہا جیسے وقت رک گیا ہو۔ کالج سے آنے کے بعد
 ہی وہ سخت کانفیس تھی۔ وہ تین بار اس نے کوشش کی کہ یہ بات اسی کو بتا دے مگر ہر بار ایک جھجک سی آئے آگئی۔ وہ
 پتا نہیں اس کے بارے میں کیا سوچیں گی یہی سوچ کر وہ ہچکا کر رہ گئی۔ شام میں گیت پر تیل کی آواز سن کر وہ ایک دم
 فردوس ہو گئی۔

سنی نے گیت پر دیکھا تھا۔ مہمان کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ ڈرائنگ میں آ گیا۔ ریڈیو اور ای دیں ڈرائنگ
 میں بیٹھے تھے۔

”وادی کوئی آتی آتی ہیں انہیں آپ سے ملنا ہے۔“ سنی کا بیٹا دم نہ کرا ہی انہیں اور آہستہ قدموں سے چلتی
 ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔ سنی جیسے ہی ادھر ادھر ہوا وہ جلدی سے اٹھ کر ڈرائنگ روم کے برابر والے کمرے میں آ گئی۔
 اور کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر بائیں سننے کی کوشش کرنے لگی۔ ایسی اس کی حرکت پر اسے خود ہی ہنسی آ رہی تھی۔ ایسی حرکتیں
 قلموں وغیرہ میں دیکھ کر وہ کتنا مذاق اڑاتا کرتی تھی۔ ای اور شہر پار کی کسی درمیان رکی سے بائیں ہو رہی تھیں۔
 اس گفتگو کے دوران عائشہ کو کھڑے ڈنگ وغیرہ سرور کے چاچا کی تھی تھوڑی بہت دیر کی پر مختلف گفتگو کے بعد
 جب وہ اسے مطلب کی بات پر آئیں تو دیکھ کر بیٹا ہی ہو گئی۔ پتا نہیں وہ کیا باتیں کی اور ای کیا کہیں گی۔
 اسے لگتا کہ کوئی۔ مگر جب انہوں نے ای سے کہا۔

”آپ کی بیٹی ریڈیو، ماشاء اللہ بڑی پیاری بچی ہے۔ آتے جاتے کئی بار اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ بہت
 سلجھی ہوئی اور اچھے اخلاق و اطوار کی مالک ہے۔“

تو اس کا دل احساس شک سے لبریز ہو گیا۔ وہ ساری زندگی باہر گزار آتی تھیں۔ ان کے نزدیک پسند کی
 شادی کوئی بری چیز نہیں ہو سکتی تھی۔ انہیں ایسا کہنے کے لیے قینا شہر بار لے گیا ہوگا، ریڈیو کو پورا یقین تھا اور وہ شخص
 اسے اور بھی زیادہ چھانگنے لگا تھا۔

”آپ کی عزت افزائی کا بہت شکر ہے۔ آپ نے میری بیٹی کو اپنے بیٹے کے لیے پسند کیا آپ سے مل کر
 اعزازہ ہو رہا ہے کہ آپ کا بیٹا قینا بہت اچھا ہوگا۔ مجھے آپ کو انکار کرتے ہوں تو ہو رہا ہے، مگر مجبوری ہے کہ کم
 لوگ خاندان سے باہر رشتہ نہیں کرتے۔“

ای کی دل چیر دینے والی یہ باتیں سن کر وہ کہنے کے عالم میں کھڑی تھی۔ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی
 خوشی اس نے کتنی آسانی سے جیت لیں کی تھی۔ اس کے بعد ای کی اور ان کی کیا کیا باتیں ہوئیں اسے کچھ بھی نہیں
 آ رہا تھا۔ وہ وہیں دیوار سے ٹک لگنے فرش پر بیٹھ گئی تھی۔

”ایسا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا اس کا خیال تھا کہ وہ رشتہ لے کر آئیں گی ای ہاں باتیں کہے بغیر انہیں
 رخصت کر دیں گی اور بعد میں وہ اسی سے اس رشتے کے لیے اقرار کرنے کا کہے گی۔ مگر کچھ بھی اس کی سوچ جیسا نہیں
 ہوا تھا۔ وہ درنا پا جاتی تھی مگر کھانے سے ایک آنسو بھی نہیں پکا تھا۔

”ہمارے پیچھے والے مکان میں جو لوگ رہتے ہیں ان کی والدہ آتی تھیں۔ اپنے بیٹے کے لیے ریڈیو کا
 رشتہ مانگتے۔“

کھانے کی میز پر ای نے یہ بات سمیٹ کر گوشہ گزاری، بھابھی ایک دم سب مصروفیت چھوڑ چھاڑی کی
 طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ وہ صرف سب کے سوالوں سے بچنے کے لیے کھانے کی میز پر بیٹھی تھی۔

”آپ نے کیا جواب دیا؟“ بھابی نے سنی کو متوجہ دینے بغیر جلدی سے پوچھا۔

”جواب کیا دیا تھا۔ میں نے جانا کہ ریڈیو کا ہمارے ہاں ابھوں میں شادی کرتے ہیں۔ اسے ایسے کیسے کسی
 اچانک آدمی کے حوالے کر دوں میں اپنی بیٹی، وہ بتا رہی تھیں ان کا بیٹا امریکہ میں نہیں ہے۔ اور یہ امریکہ پلٹ بڑے
 خطرناک ہوتے ہیں پہلے ہی وہاں شادی کر رکھی ہوتی ہے۔ پاکستان آ کر وہ بارہ دواہنا کر جاتے ہیں۔“

ای نے غریب انداز میں دو اطلب نظروں سے سب کی طرف دیکھا، بھابھی تو خاموشی سے کھانا کھاتے رہے
 تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کی ذکر سے زیادہ وہ کھانے میں حذر رہا تھا۔

بھابی نے البتہ فوراً ہی ای کی ہاں سے ہاں ملائی تھی۔ ”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔“
 اور وہ جس کے بارے میں یہ ساری بات ہو رہی تھی خاموش بیٹھی اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

ماؤں کو تو اپنی بیٹیوں کی شادی کی بہت جھگڑ ہوتی ہے پھر اس کی ای ایسی کہیں ہیں، انہیں کیوں اس کے دل کی خوشی کا
 خیال نہیں۔ بائیں تو بچوں کے چہرے پر دھکا کرتی ہیں۔ اور ای نے کیا اس کا چہرہ نہیں پر حاد۔ اس نے اپنے پر پو پو
 آتے اور درجنگ ہوتے بہت دیکھے تھے، مگر یہ پہلا موقع تھا کہ کسی آنے والے کو اسی وقت انکار دیا گیا تھا۔ ورنہ ای
 غامض طور پر اچھی ملاقات میں انکار کرتی تھیں۔ اس بار انہیں انکار کرنے کی اتنی جلدی کیوں تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر
 وہ مسلسل اسی قسم کی باتیں سوچ رہی تھی۔

”جرج بات ہے میں وہی کہوں گا۔ تمہارے گھروالوں کے نزدیک تم صرف ایک مشین ہو اور بس۔ اور سب سے افسوس کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں میں تمہاری امی بھی شامل ہیں۔ تمہیں سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے کی کو بھیج دیا تو پتا چکر تمہارے گھروالوں کے بارے میں، میں نے اسے دس دنوں میں جو رائے کاغذ کی تھی، اس حساب سے بنی جواب صحیح تھا۔ وہ کیوں تمہاری شادی کریں، ایسی اچھی تو کوئی، ڈارلن، نرس، گورس، ڈرائیور، منچر انہیں کہیں اور ملے گی بھی تو نہیں۔“

آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ میرے گھروالوں کو کچھ کہیں۔“ وہ بھی اب کے غصے میں آگئی تھی۔
 ”ہاں مجھے کوئی بھی حق نہیں ہے۔ وہ جرتہاری زندگی چاہ کر رہے ہیں۔ انہیں سب حقوق حاصل ہیں۔
 رمیو! تم لاکھ حقیقت سے انکھیں دھڑکاؤ گرجا کو یہی ہے کہ تمہارے گھر میں کوئی بھی حق سے محبت نہیں کرتا۔ وہ سب تم سے اپنا مطلب پورا کرتے ہیں تم نے کسی مجھ سے اس بارے میں زیادہ نہیں کہا مگر پھر بھی مجھے پتا ہے، تم خود بھی ان تمام باتوں کو محسوس کرتی ہو۔ کیا کوئی ماں اپنی خالہ ہو سکتی ہے کہ شخص اس سچے سے اپنی بیٹی کی شادی نہ کرے کہ اس کی شادی ہوگئی تو میری خدمت کرنے سے گوارا کیا کوئی بہن ایسی ہو سکتی ہے کہ اس لیے اپنی بہن کی شادی نہ ہوئے دے کہ اس کی شادی ہوگئی تو میرے بچوں کی دیکھ بھال ان کو نہ کرے گا۔ اور کیا کوئی بھائی بھائی ایسے ہو سکتے ہیں کہ اس لیے اپنی بہن کی شادی نہ کریں کہ اگر اس کی شادی ہوگئی تو پیارا اور معذور ماں کی ساری ذمہ داری ہم پر آجائے گی۔“
 وہ بڑی جلدی سے وہ تمام باتیں کر رہا تھا جو اس نے اس سے پہلے صرف محسوس کی تھیں، کبھی ان کا کبھی سے اظہار نہیں کیا تھا۔

”رمیو! زندگی میں صرف ایک بار ملی ہے۔ تمہاری زندگی پر دوسروں سے زیادہ تمہارا حق ہے۔ تم اپنی زندگی خود چھوڑا لیا۔ کیا بچوں کے تمہاری زندگی دوسرے لوگ کر رہے ہیں۔ ان مطلب پرستوں کے چنگل سے نکل آؤ۔“
 شہریار کی آنکھوں میں آنسو تھیں۔ وہ بھی بات اسے بری طرح خمد لگائی تھی۔
 ”جبرائیل! آپ مجھ سے دکھ رہے ہیں افسوس میں وہ کبھی نہیں پوری نہیں کر سکتی۔ میرے لیے دنیا میں ہر چیز کے بڑھ کر میری ماں اور بہن بھائی ہیں۔ آپ مجھے کسی غلط بات کے لیے مت اکسا نہیں۔“
 ”اس کا مطلب ہے تم اپنے گھروالوں کے سامنے اسٹیج نہیں لگائی۔“

وہ ایک دم بڑیک لگا کر ہوا تھا، گاڑی سڑک کے کنارے روک کر وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
 ”تمی ماں جو میری امی کا فیصلہ ہے، وہی میرا بھی ہے۔ میں اپنے گھروالوں کے خلاف نہیں جا سکتی۔“
 اس کی بات سنتے ہی اس نے طوفانی انداز میں گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیور کرتے ہوئے شہریار نے اس کے کالج کے سامنے گاڑی روکی تھی وہ سامنے دنگ اسکرین پر نظر پڑ جائے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ دروازہ کھولے ہوئے بولی۔

”پلیز آؤ مجھے اس انڈر اسٹیج منت بھیجے گا۔ آپ؟“ ”شہریار کے خمد و خیز لچکے لے اے اپنی ماں مکمل نہیں کرنے دی تھی۔“

”رمیو! تمہارا مجھے ظلم کرنے والے سے زیادہ نفرت ہے تمہارے والے سے ہے۔ اور آج سے تم بھی ان ہی قابل

”خوشیوں کی عمر اتنی مختصر کیوں ہوتی ہے۔ ابھی تو میں نے دھنگ سے خواب دیکھے بھی نہیں تھے کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔“ تمام زہر و جہنم کے بندھنوں سے چپکے تھے۔ وہ اپنے خوابوں کی اس پامالی پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ”اور وہ شہریار میرے بارے میں کیا سوچے گا کہ میں بھڑکی ہوں۔ میں نے اس سے کی کنٹنٹ نہیں بھائی۔“
 وہ خود کو کسی صورت سمجھا نہیں پا رہی تھی۔ اس کے اندر کوئی جھج جھج کر اعلان عبادت کر رہا تھا۔ اپنی خوشی پانے کی طلب کر رہا تھا۔ ساری رات روئے روئے گزرتی تھی۔ صبح اس کا کالج جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، مگر پھر بھی اسے امی کے کام کرنے کے لیے تولاڑی پانے لگتا ہی تھا امی کے لیے ناشائے کر بھیجی تو وہ اسے دیکھ کر کہنے لگیں۔
 ”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ روئے روئے دیکھنا ناشائے کوئی اور بنا دیا۔ تم آرام کرتیں۔“

ادرا می کے اس تشویش بھرے انداز پر اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ کبھی کبھی اس دور سوچ پر انہوں نے یہ بات کی ہوتی تو وہ خوشی سے نہال ہو جاتی، مگر آج اسے اس بات سے کوئی خوشی نہ ہوئی تھی۔
 ناشائے کی تیاری میں بھی کبھی امی مدد کرنے کے خیال سے بچان بھی گئی تو انہوں نے بڑی سختی خیر نکالوں سے اس کے روئے روئے چہرے کو دیکھا۔ ان کی نگاہوں کی سختی خیر ہی اسے کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔ صرف بھیجی کے سوال جواب سے بچنے کے لیے وہ کالج کے لیے تیار ہوگئی۔ جب دل اس بات کو بھیجی سمجھا نہیں لگتا، یہی حال اس کا تھا۔ کالج کا کراس کے دل کی اداسی اور دیوانی ہنوز برقرار تھی۔ پچھلی کے وقت پارک کی طرف آئے وہ بے حد ابھی ہوئی تھی۔ اپنے گھر جانے کا تصور اسے زندگی میں پہلی مرتبہ سوہان روح لگتا تھا۔ گاڑی کا لاک کھولنے سامنے سے آتے شہریار کو دیکھ کر بے ساختہ اس کے ہاتھ سے چابی گر گئی تھی۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے، میرا خیال ہے اس بات کے لیے کالج مناسب جگہ نہیں ہے۔“
 وہ دونوں انداز میں غم و دہانہیں کیٹ کی طرف چلا گیا تھا اس نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ وہ اس کے پیچھے آگئی رہی ہے یا نہیں۔ اور وہ چپ چاپ محسوس کی طرف اس کے پیچھے چلنا شروع ہوگئی تھی۔
 گیٹ سے باہر نکلے تو وہ گاڑی میں اس کا منتظر بیٹھا تھا رمیو جیسے ہی اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ وہ دھار سٹ کی خاموشی کے بعد شہریار نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا وہ سر جھکا کر بھیسی اپنے پاؤں کو گھور رہی تھی۔

”تم کوئی نہیں؟“ اس کی طرف بھور دیکھا وہ بولا تھا۔ وہ بغیر کوئی جواب دیے پوئی بھی رہی تو وہ چڑ کر بولا۔
 ”ہر سٹے کا کلر روٹا نہیں ہوتا، میں نے تمہیں ہی کے آنے کا بتایا تھا پھر تم نے اپنی امی کو پہلے سے اس بارے میں کچھ کیوں نہیں بتایا۔ اس کی سلسل چپ سے ٹھک کر وہ مزید غصے میں آ گیا۔

”اور تمہارے گھر والے اس قسم کے ہیں۔ تمہاری امی نے تم سے پوچھے بغیر فوراً ہی منع کر دیا۔ پتا ہے امی گھر آکر مجھے کیا بتا رہی تھیں، وہ کہہ رہی تھیں کہ رمیو کی امی کا سر سے اس کی شادی کرنے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔ اسے خود غرض لوگوں کی تم دن رات ایک کر کے خدشہ نہیں کرتی ہو؟“ شہریار کی یہ بات اسے تیر کی طرح جا کر گئی تھی۔
 ”پلیز شہریار! آپ اس قسم کی باتیں مت کریں۔“ اس کی ناکواری کا دباؤ کوئی اثر نہ تھا۔ وہ بڑے فیصلے انداز میں بولا۔

نفرت لوگوں میں شامل ہو گئی ہو۔ میں نہیں کوئی جبر و انہیں دے رہا۔ مگر آج سے دس پندرہ سال بعد جب تم باہل اکیلے رہ جاؤ گی، سب ایک ایک کر کے تمہیں اپنا پتلا پورا ہونے پر چھوڑ جائیں گے، جب جاے ایک لمحے کے لئے کسی گھر میں نہیں یا دوسرے آؤں گا۔ مگر جب سوائے بچے تھانوں کے زندگی میں کچھ بھی نہیں بچا ہو گا۔ گاڑی آگے جا چکی تھی۔ اور وہ ابھی تک وہیں کھڑی چپ چاپ اس جانی ہوئی گاڑی کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ایسا لگتا تھا زندگی بھر کی تھی۔ یوں جیسے کرتے کر کچھ تو اب بھی نہیں ہے۔ وہی تمام معمولات زندگی جنہیں پہلے وہ بڑی خوش اسلوبی سے نبھاتا کرتی تھی اب اسے صرف ایک ذمہ داری محسوس ہوتے تھے۔ اسے ایسا لگنے لگا جیسے وہ واقعی ایک عیشین بنتی جا رہی ہے۔ شاید یہ اسے شاید اپنا کہہ کر ہی بدل گیا تھا اس کے کمرے کی اب ہر وقت لائٹ بند رہتی تھی۔ اس شخص کا دل تو ذکر خوش تو وہ بھی نہیں تھی۔

”کیا اب ساری زندگی یونی گزرتے گی۔ کیا یہ احساس زیاں مجھے ہمیشہ یونی تک کرتا رہے گا۔ کیا اب زندگی میں میں، کبھی بچے دل سے منہ پاؤں کی۔ کیا اسے کچھ سے منی لیا جائے گا۔“

اپنے اندر سے اٹھنے ان سوالوں کو وہ دانستہ نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔

☆☆☆

ایسا پاکستان آتی ہوئی تھیں۔ ان کی آمد پورے گھر کو بلایا کرتی۔ امی کا بس نہیں چننا تھا تو وہ سب کو ہر وقت اپنا کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہنے پر مجبور کر دیتیں۔

اس کی طبیعت کافی بڑوں سے خراب تھی۔ پہلے وہ دن تو اس نے اس بھار کا زیادہ نوش نہیں لیا اور خود ہی دوا وغیرہ کھا کر دوبارہ کام میں لگ گئی۔ ایک ایسے آنے کی وجہ سے کام کو باوجود بھی بڑھ گیا تھا۔ گھر میں کھانا پکانے کے لیے نوکر جا کر تو کھتے تھیں۔ اور ای جینی اور دادا کے لیے ہر وقت دھونی اہتمام جاتی تھیں۔ خود ایسا کبھی ایک سے ایک مشکل ڈش کھانے کا دل چاہتا رہتا تھا۔

”بارش ہو رہی ہے، آلو کے پرائے بنالو۔“ اور اگر آلو کے پرائے صرف کھہر دینے سے فوراً بن گیا کرتے تو بات ہی کیا تھی۔

اتوار، سارے ہی افراد گھر پر موجود تھے۔ بھائی تو ایسے موقعوں پر بڑی خوبصورتی سے ہری چٹنڈی دکھایا کرتی تھیں۔ صرف آلو اٹھنے کے لیے انہیں نے رکھے تھے اس کے بعد چائے ان کے سر میں شدید قسم کا درد شروع ہو گیا تھا۔ نتیجہ وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئیں۔ یہ اور بات ہے کہ جب کھانا لگ رہا تھا ان کا درد چائے خود بخود ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔

”چلو اب تم بیٹو، کب سے لگی ہوئی ہو کھانا میں لگا لوں گی۔“

انہیں کسی سے بھی تعلقات نہ بگاڑنے کا گرا تھا۔ سمجھ اور عاشقی تو تھیں ہی کام چور اس لیے آرام سے بیٹھی

دی دی دیکھ رہی تھیں۔

طبیعت خراب میں اتنی دیر تک بستر سے رہ کر کام کرنے سے اس کی طبیعت مزید بگڑ گئی تھی۔ پورا جسم ٹوٹا ہوا

محسوس ہو رہا تھا، وہ کھانا کھانے بھرتا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ ہاتھ کا کر خود کو دیکھا تو اٹھارہ ہوا کہ اسے کتنا تیز بخار ہو رہا تھا۔ وہ کھانا کھا کر ایسے ہی کمرے میں آ کر لیٹ گئی تھی۔ اس لیے اب تو بھر کر ہی تھی کوئی زندگی اسیے ہاتھ ضرور ملے گا۔ اس کے اندر اتنی ہمت تھی کہ کھانا کھانے لگا۔ وہ انتظار کر رہی تھی کہ کوئی آئے اور وہ کھل خود پڑا کر کوئی دوا بھی اپنے لیے منگوائے۔ کافی دیر گزر گئی تھی اور کوئی بھی اس کے پاس نہیں آیا تھا۔

وہ اکیلی بڑی کرا رہی تھی۔ سر درد سے بھٹ رہا تھا۔

”کیا ہوا بچھوڑا آپ کھانے پر کیوں نہیں آئیں۔“ عبداللہ کی آواز سن کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

”عبداللہ! مجھے یہ کھل آواہا دو، اور دسیرین یا کوئی بھی نہیں کھلے لا دو۔“ اس کی طاقت بھری آواز سن کر

وہ ایک دم چلا۔

”بچھوڑا آپ کو تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔ جلدی ڈاکٹر کے پاس چلے ہیں۔“ عبداللہ نے اس کے ہاتھ پر

ہاتھ رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی۔

پھر عبداللہ نے اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو وہ کھڑی ہوئی، اس سے ایک قدم بھی نہیں اٹھ رہا تھا۔ پانچس اسی

دیر وہ کیسے کچن میں کھڑی رہی تھی۔ شاید اس میں عام لوگوں سے زیادہ دل پاد تھی۔ ڈاکٹر نے اس کی حالت کے پیش

نظر اور مریضوں سے پہلے اسے دیکھا تھا۔ ڈاکٹر نے چھانچا کھانا کھانے کا مشورہ کیا تھا۔

وہ چپک چپ کرا کر دوا میں لے کر گھر واپس آ گئی تھی۔ لاؤنج میں کوئی بھی نہیں تھا۔ جاتے وقت بخار بہت

تیز تھا۔ اس لیے وہ اس طرف دھیان نہ دے سکتی تھی۔

”سب لوگ کہاں ہیں؟“ عموما گھر والے لاؤنج ہی میں بیٹھا کرتے تھے۔ خصوصاً اتوار کو سب لاؤنج ہی

میں پائے جاتے تھے۔

”موسم اچھا ہو رہا تھا اس لیے بڑی چھچھو سب کھانے لگے تھیں۔ صرف میں، ماما، بابا اور آپ گھر پر ہیں۔“

عبداللہ کی بات پر اسے شک لگا تھا۔

”دادی بھی کی ہیں؟“ اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر لیٹنے ہوئے اس نے تصدیق چاہی تھی۔

”ہاں دوسرے دو چائیں رہی تھیں، بڑی چھچھو انہیں زبردستی لے کر گئی ہیں۔ میں اس لیے نہیں گیا کیونکہ آج ہمارا

تیج ہے۔ میں تو آپ کو بیٹھے آٹھا کر آپ کر لیا رہی ہیں۔ آپ نے کسی کو بتایا بھی نہیں کہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔

کھانے کی سیر پر آپ کی غیر حاضری کی وجہ سے ماما کا سو بڑی طرح آف ہو گیا تھا، وہ کبہر ہی تھیں۔“ بابا بھائیوں کے

لیے وہ کچا کر اپنے کمرے میں چلی گئی ہیں۔ ایک دن اکیلے کھانا کرا لیا تو اتنا برا لگا ہے۔ ہمیشہ بھل کر ہی کام کرتے ہیں۔

کیا بندے کی کبھی طبیعت خراب نہیں ہو سکتی۔ اب وہ فحشے میں کھانا بھی نہیں کھا سکتی گی۔ مگر ماما راض ہو کر بیٹل پر اسے اتنے

گئی تھیں۔ اسی لیے وہ بڑی چھچھو کے ساتھ بھی نہیں گئیں اور بابا نے چارے اب ماما کو کھانے میں مصروف ہیں۔“

عبداللہ خود ہی اپنی بات کو انجوائے کرتا ہوا بیٹھا تھا۔ جب وہ چپ چاپ بتی اس کی بات سن رہی تھی۔

عبداللہ نے اسے دوا کی کھلائی اور خدا حافظ بتا کر باہر چلا گیا۔

”اچھا بچھوڑا میں کھلے کھلے مارا ہوں، دیر سے آؤں گا۔“

دو اکھا کرکب اس کی آنکھ کی اسے پتا ہی نہیں چلا۔ آنکھ کھلی تو چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لیب آن کیا اور گھڑی کی طرف دیکھا تو چلا چلا کر گیارہ بج رہے ہیں۔

دوای کی وجہ سے بخاری اٹھ اٹھ گیا تھا۔ وہ بہت کر کے بسز پرے آگئی۔ دوای اگلی خوراک سے پہلے کچھ نہ کچھ کھانا بے حد ضروری تھا، وہ نیچے آئی تو ای، ایلا اور عاشی لاؤنٹ میں بیٹھے ہاتھیں کر رہے تھے۔ ای اس کی طرف دیکھنے ہی فوراً بولیں۔

”کیا ہو گیا ہے جنہیں رسید۔ کوئی گھر آئے؟“ اس کے ساتھ اس طرح بھی کرتا ہے۔ کبھی، کبھی تو بہن، بہنوئی آتے ہیں اور ان کے لیے اگر تم کچھ پکائی تو کیا اس طرح روکھا کرو گی۔“

”بھئی میں نے تو ایک بات بھی کہی تھی۔ اگر تمہارا دل نہیں چاہا تو صبح کر دیتیں۔ اس طرح سب کا مول تو خراب مت کرو۔ میں۔ بلا وجہ بھی مجھی سب سے داخل ہو گئیں۔ بس ای اب جب تک میں یہاں ہوں خود کھانا پکائوں گی۔ تاکہ بھڑے کی جڑی ختم ہو۔ کام پر اتنی کل کھانا پکائیں گی کوئی کام ہے۔ میں چالیس چالیس لوگوں کی دوشیں وہاں اکیلے اسی طرح کرتی ہوں۔“

ایچانے بغیر کسی مرد کے حسب عادت اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ یہ نہیں کیوں دل ایک دم اکٹھا ہوا یا کر وہ بھانے کوئی جواب دینے کے واہیں اپنے کمرے میں آگئی۔ کمرے میں آکر ہلک ہلک کر دے دو مزہ بڑھال ہو گئی تھی۔ عبداللہ بہت لاہور تھا کھیل سے آکر اسے کسی کو اس کی بیماری کی بابت بتانا یا دیکھ نہیں رہا ہو گا مگر کیا اس کی شکل سے نہیں پتا چلا رہا تھا کہ وہ بیمار ہے۔

”تمہارے گھر والوں کے نزدیک تم صرف ایک مشین ہیں۔ یہ بات یاد آنے کی دیر تھی اس کے رونے میں اور شدت آگئی تھی۔“

”ہاں میں مشین ہوں، اور مشین صرف کام کرتی ہوگی گئی ہے جب تک مشینری صبح کام کرتی ہے ہم استمال کرتے ہیں اور جب وہ کام درست طریقے سے نہ کریں تو انہیں یا تو صدمت کرایا جاتا ہے یا پھر کہیں استنود مجرہ میں فالتو سامان کی طرح ڈال دیا جاتا ہے۔“

مسلسل دہنی دباؤ، رات بھر درد اور پھر دوای نے کھانے سے صبح اس کی طبیعت مزید خراب ہو گئی تھی۔ مگر میں اس کے بغیر بیچ ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ ای کو جب وقت پر ناشہ نہیں ملا تو اسے دیکھنے آئی تھیں۔ پھر انہوں نے ہی اسے دودھ پلایا اور دھلائی۔

”خود پر ترس کھانے کا یہ کیوں ساعداز ہے طبیعت خراب تھی تو تانا چاہیے تھا کہ کسی کو الہام تو ہونے سے رہا۔“ وہ اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولیں تو وہ چپ چاپ لپٹی رہی۔ پھر اس پرانی مہربانی ضرور ہو گئی تھی کہ دوہر میں صبح اس کے کھانے کا کمرے میں آئی تھی۔

”سمعیہ! میرے پاس تھوڑی دیر اور بیٹھ جاؤ۔ اکیلے میرا دل گھمرا رہا ہے۔“ وہ کھانا رکھ کر جانے لگی تو مرید نے کہا تھا۔

”سوری پچھو! میں بیٹھ جاتی مگر مجھے اپنی فریڈ نہ کھر جاتا ہے۔ آکر آپ کے پاس بیٹھوں گی۔“ اور وہ

اسے جانا دیکھتی رہ گئی۔

وہ گھر والوں کی صحت سے متعلق بہت ناخوش رہا کرتی تھی کوئی بھی بیمار ہوتا تو وہ خدمت میں دن رات ایک کر دیتی تھی۔ اور آج اس کے پاس دو گھڑی بیٹھنے کی کسی کے پاس فرصت نہیں تھی۔ ایلا اور ای ایک ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”کبھی طبیعت ہے اب؟“ ایچانے اس کے برابر میں بیٹھے ہوئے پا چھال ان کے لہجے میں کسی قسم کی شرمندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ مختصر جواب دے کر چپ ہو گئی۔

”صرف ٹھیک نہیں، جلدی سے بالکل پہلے کی طرح ہو جاؤ۔ کسی کی ہر جھڑے کرنے کا سوچ رہے ہیں ہم لوگ۔ سارا انتظام جنہیں ہی کرتا ہے۔“ وہ اس کے ہاتھ تھام کر پیار سے بولیں تو اسے اس پیار میں غرض کی بو آئی۔

”میں اور جواد شاپک کے لیے جا رہے ہیں یہ بتاؤ تمہارے لیے کیا لاؤں۔“ وہ مزید بولیں۔

”ٹھیک ہو، ایلا میرے پاس سب کچھ ہے۔“ اس کا جواب سن کر وہ اٹھ کھڑی ہو گئی۔

”بس اب جلدی سے یہ ستر چھوڑ دو تم لپٹی ہوئی بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہیں۔“ وہ اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولیں۔

”آپ ای بھی چلیں۔“ ایچانے ای سے کہا۔

”کبھی مجھ سے بازاروں میں مارے مارے نہیں پھرا جاتا تم لوگ جاؤ۔“

ای کے جواب پر وہ فوراً بولیں ”زیادہ نہیں پھرتا مجھے تو صرف جیولر کے پاس جانا ہے۔ سعودی گولڈ تو بہت جمع ہو گیا یہاں سے ایک آدھ جن لینے کا سوچ رہی ہوں۔ چلیں آپ؟“ اور ای ناچار کھڑی ہو گئیں۔

”مید۔ اگر طبیعت بھڑھوں گے تو کسی کو زور دیکھ لینا۔ ایک تو تمہارے علاوہ اب یہ بچے کسی اور سے پڑنے پر راضی بھی نہیں ہوتے۔ اس کے امتحان بالکل سر پر آگئے ہیں۔“ ایلا اور ای کمرے سے جا بیٹھے تھیں۔

رات کا کھانا بھی کمرے ہی میں اسیا تھا۔ کھانے کے بعد بھی اس کے لئے دودھ نہ کرائی تھیں۔ وہ ہی سکر اسکر کر باتیں کرنے کا انداز۔

”جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ، تمہارے بغیر گھرا اتنا سونا سا لگ رہا ہے۔ مجھے تو بالکل مزہ نہیں آ رہا۔“

بھابھی نے سکر کر کہا کہ اسے فالتو سمجھنا چاہیے۔ وہ دیکھنے آئے تھے۔

”میں نے تمہاری بھابھی سے کہا ہے جنہیں زیادہ سے زیادہ جوں کا نہیں۔ دیکھو کسی کمزور ہی ہو۔ اب کل سے پابندی کے ساتھ دو ناٹم اکیل جوں لینا ہے۔ بھابھی جوں لائیں تو صبح مت کرنا۔“

وہ اسے پیار کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے ”تو سب لوگ مل کر مشین کی مرمت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ اس نے خطرے انداز میں سوچا۔ ایچا اتنی ناگوار نہیں ہوئی کہ کڑاؤ میں ڈال دی جائے۔ ابھی وہ بہت سے لوگوں کے کام آسکتی تھی۔ اس لیے اس مشین کو درست حالت میں لانے کے جن سب کر رہے تھے۔ مگر کب جب یہ مشین مرمت ہونے کے قابل نہیں رہے گی تو اس کی حیثیت بھی گھر میں بڑے کسی فالتو سامان سے زیادہ نہیں ہوگی۔ وہ

جتنا سوچ رہی تھی اتنا ہی الجھ رہی تھی۔

”یا اللہ! مجھے درست فیصلہ کرنے کی ہمت عطا فرما۔“ اس نے صدقِ دل سے اپنے رب کو پکارا۔

”آج سے دس پندرہ سال بعد جب تم بالکل اکیلی رہ جاؤ گی سب ایک ایک کر کے تمہیں اپنا مطلب پورا ہونے پر چھوڑ جائیں گے تب چاہے ایک لمحے ہی کے لیے ہی کسی مگر میں تمہیں یاد ضرور آؤں گا۔ مگر تب سوائے پچھتاؤں کے زندگی میں کچھ بھی نہیں بچا ہوگا۔“

شہر یار کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

”کیا میری زندگی واقعی ایک پچھتاوا بن کر گزرے گی۔“ وہ خود سے پوچھ رہی تھی۔ خوشیاں اور محبتیں اس کے در پر دستک دے رہی تھیں اور وہ انہیں نظر انداز کر رہی تھی۔

محبتیں اور خوشیاں سب کے دروازے پر دستک دیتی ہیں جو عقل مند ہوتے ہیں فوراً آگے بڑھ کر انہیں خوش آمدید کہتے ہیں اور کچھ بے وقوف ساری عمر تقدیر کو روٹے رہتے ہیں یہ بھول جاتے ہیں کہ کبھی خوشی نے ان کا در بھی کھٹکھٹایا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ محبتیں مایوس لوٹ جائیں اسے یہ دروازہ دینا چاہیے۔ اس نے خود سے کہا ”ابھی دیر نہیں ہوئی۔ ابھی میں اس روٹھے ہوئے کونالوں کی۔ میں بیٹھ کر اس آنے والے وقت کا انتظار نہیں کروں گی۔ جب زندگی میرے لیے پچھتاوا بن جائے۔ میں دردل پر دستک دیتی ان خوشیوں کو خوش آمدید کہہ رہی ہوں۔ پتا نہیں میں صحیح ہوں یا غلط مگر میرا دل مطمئن ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے پہلی مرتبہ کوئی فیصلہ اپنے دل کی خوشی کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔“

وہ خود سے کہتی بستر پر سے اٹھ گئی تھی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ وہ اب مزید ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرنا چاہتی تھی اسے محبتوں کے کھوجانے کا خوف تھا، اس کی انگلیاں بڑی تیزی سے فون پر ایک ایک نمبر مل رہی تھیں۔

”ہیلو!“ شہر یار کی نیند سے بوجھل آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرانی تھی۔

”شہر یار! میں اپنی زندگی خود جینا چاہتی ہوں۔“

”رمیہ تم؟“ وہ صرف ایک لمحے کے لیے اس کی آواز سن کر حیران ہوا تھا، اس کی بات کا مطلب سمجھا تو خوشی سے چیخ کر بولا۔

”کیا کہہ رہی ہو۔ دو بارہ سے کہو، مجھے یقین نہیں آرہا۔“ اس کی خوشی سے کھٹکتی آواز سن کر رمیہ کے لب بھی مسکرا دیئے تھے۔

”میں زندگی میں کبھی پچھتاوا نہیں چاہتی۔“ اس نے آہستگی سے کہہ کر لائن کاٹ دی تھی۔ وہ خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

فون کی بیل بجنا شروع ہوئی تو وہ سمجھ گئی کہ شہر یار کا ہے۔ اس نے پہلی ہی بیل پر فون اٹھالیا تھا وہ خوشی سے پاگل ہوتا اس سے فیصلے کی تبدیلی کی وجہ پوچھ رہا تھا۔ اور وہ جواب میں اس سے اپنے دل کی ہر بات کہہ رہی تھی۔ اس نے خوشیوں کو روٹھنے نہیں دیا تھا۔ خوشیوں بھرے نئے موسم اس کے آگن میں اتر آئے تھے۔

اچھی تھی اور ان سب کو اچھا ہونا بھی چاہیے تھا۔ آخر ای اور ڈیڈی دونوں ہی بہت قابل اور ذہین افراد تھے تو ان کی جینیوں کو تو یہ ذہانت و راحت میں ملتی تھی۔

ڈیڈی بہت ہی لائق فائن ڈانکر تھے اور ای انڈیا میٹھس میں ایم ایس سی، ڈیڈی کا تو یہ نہیں کہ انہوں نے ہم جنہوں کے حوالے سے کیا کیا جگہ سوچ رکھا تھا کہ ان کی وفات ہمارے بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔ ہم لوگوں کو تو وہ بہت اچھی طرح یاد بھی نہیں تھے، بس ذہن پر ایک نکل سا تھا کہ ڈیڈی ایسے جتنے پڑے، ایسے پڑے تھے۔ ہمارے لئے وہ حقیقت سب کچھ ہماری ای ہی تھی انہوں نے ہی ہمیں پالا، ہماری پرورش کی اور تعلیم و تربیت کا انتظام کیا، ہمارے سب مشق پورے کئے۔ ہمیں ماں کے پیار کے ساتھ ساتھ باپ کا پیار بھی دیا اور ہماری ای کی سب سے بڑی خواہش اور سب سے بڑا خواب یہ تھا کہ ہم سب ہمیشہ ای تعلیم حاصل کریں۔ ایک تو مجھے پڑھنے کا کوئی خاص شوق ہی نہیں تھا، دوسرے میں کچھ خاص محنت بھی نہیں کرتی تھی۔

اب سوچی ہوں تو افسوس ہوتا ہے کہ کاش میں نے ای کی خاطر ہی مشق نہ ہونے کے باوجود بھی پڑھنے میں سنجیدگی اختیار کر لی ہوتی۔ اکثر لوگ وقت کرنے کے بعد ہی پچھتے ہیں اور ایسا ہی میں بھی کرتی ہوں۔ بہت مشکلوں سے روز بچپن ہی بے اس کرنے کے بعد میں نے اس خوف سے کہیں ای مجھے فراغت سے گھوٹا پھرتا دیکھ کر دو بارہ کہیں ایڈمیشن نہ ملوادیں۔ وقت گزاری کے لئے ایک بہت ہی اچھے یونیورسٹی پارلر سے میٹھن کا کورس کرنے کے لئے وہاں داخلہ لے لیا۔ جتنے ستورے کا مجھے بچپن ہی سے شوق ہے۔ باوجود اس کے کہ میں کوئی بہت حسین لڑکی نہیں ہوں، مگر مجھ میں اساتذہ بہت ہے۔ جب میں نے میٹھن کا کورس نہیں کیا تھا تب بھی مجھے پہنچنے اڑھنے اور میک اپ کا بہت سلیقہ تھا۔ کس موسم میں کونسا رنگ اور کون سا اسٹائل اچھا لگے گا اور کس تقریب میں کیسا ٹیک اپ لود کرنا بھلا اساتذہ، میں ان سب سے بخوبی آگاہ تھی۔

میری دوستیں میری بہت تعریفیں کرتی تھیں۔ اکثر کا خیال تھا کہ میں خوبصورت ہوں نہیں مگر خوبصورت لگتی ضرور ہوں۔ خوبصورتی کے بارے میں دیگر لوگوں کے کیا نظریات ہیں، میں نہیں جانتی مگر خود میرا اپنا ہمیشہ سے یہی نقطہ نظر رہا ہے کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں خوبصورت نظر آنا کوئی بہت مشکل اور ناممکن بات نہیں رہی۔ بس آپ کو پہنچنے اور اڑھنے اور میک اپ کا ڈھنگ آتا چاہئے۔

اس وقت جب میں وہاں سے کورس کر رہی تھی، میں نے یہ بات سوچی بھی نہیں تھی کہ آنے والے دنوں میں مجھے اس کام کو اپنا پروفیشن بنانا پڑ جائے گا۔ ای ایک بہت ہی اچھے اسکول میں میٹھس کی سینئر ٹیچر تھیں، جتنا اچھا وہ اسکول تھا وی لحاظ سے ای کی تنخواہ بھی بہت شاندار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ڈیڈی کی وفات کے بعد بھی ہم لوگ کسی شدید غم کے باوجود مسائل کا شکار نہیں ہوئے تھے۔ میٹھس کے ٹیچر کی تو دلچسپی بہت ہوتی ہے۔ اکثر بچے ای مضمون میں کمزور ہوتے ہیں، میں بھی وجہ تھی کہ شام میں گھر پر بھی ای کے پاس لوگوں اور لڑکے ٹیچر نہ پڑھنے آیا کرتے تھے۔

گھر پر تو وہ ڈگری لیول تک کے سٹوڈنٹس کو ٹیچر نہ چلایا کرتی تھیں اور ان دھڑلے سے تو انہیں اسکول سے بھی زیادہ رقم حاصل ہو جایا کرتی تھی۔ ای نے ہم لوگوں کا گزارا بہت اچھا ہو رہا تھا لیکن زندگی میں آزمائشوں کا دور جب آیا جب ای کو پہلی مرتبہ ہارٹ اٹک ہوا۔

وہ شاید اب جھٹکے لگی تھیں۔ انہیں ہم جنہوں کے مستقبل کی فکر رہنے لگی تھی۔ ہمارے سر پر نہ باب تھا نہ بھائی۔ انہوں نے کسی بیٹا نہ ہونے پر خدا سے شکوہ نہیں کیا تھا لیکن اب وہ اکثر شکوہ کرتی نظر آتیں کہ کاش خدا انہیں ایک بیٹا بھی دے دیتا۔ وہ ان کا سہارا بننا، گھر کے سارے مسائل اپنے ذمے لے لیتا۔

اب وہ مستقل بیمار رہنے لگی تھیں۔ ڈاکٹر دیکھتے تھے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کی ٹینشن لیتی ہیں، لہذا انہیں ہر قسم کی پریکٹیشن سے دور رکھو شی و خرم رکھنے کی ہر پرکوش کی جائے۔ میں ای سے کتنی شدید محبت کرتی ہوں، اس بات کا احساس مجھے ان کی بیماری سے پہلے بھی ہوا ہی نہیں تھا۔ جب میں نے رو رو کر اللہ سے دعا کی تاکھی تھیں۔ ”اللہ! میری ان کو مجھ سے جدا مت کرنا۔ ڈیڈی میرے پاس نہیں۔ صرف ایک ماں ہے۔ اگر وہ بھی نہیں رہی تو پھر میں زندہ کسی طرح رہوں گی۔“

یونیورسٹی چلتے میں نے اپنے گھر کو نظر ڈالی تو باقی چاروں جنہوں کی بھی اپنی ہی جیسی حالت دیکھی۔ وہ سب بھی میری طرح پریشان اور کبھی ہوتی تھیں۔ انہیں بساں کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی مجھے تھی۔

پھر ہم سب جنہوں نے ان رات ایک کر کے ای کی تنہا رہاری کی تھی۔ مجھ سے ایک سال بڑی سارہ جو ان دنوں کراچی پریوینٹو سے Genetics میں ماسٹر کر رہی تھی اس نے اور میں نے باقی جنہوں سے بڑے ہونے کے ناطے ایکلیس میں چہرے کس کس حالے سے کافی تفصیلی گفتگو کی تھی کس موضوعات میں اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ ایم ایس سی مکمل ہو جانے تک سارہ کہیں فل ٹائم جاب تو نہیں سکتی تھی ای لئے اس نے اپنی ایک ڈسٹ کے توسط سے ہمارے گھر کے قریب ہی موجود ایک کوچنگ سنٹر میں انٹر کے سٹوڈنٹ کو یونیورسٹی ڈیوٹی پر حاضری شروع کر دی۔ سارہ نے مجھ سے یونیورسٹی ڈیوٹی بات کہی کہ ”تمہارا تازہ روز کیا ہو یونیورسٹی کا کورس کن دن کام آئے گا، ہم ایسا کر دوں گی یونیورسٹی پارلر میں جاب کرلو۔“

اس کی مذاق میں بھی ہوتی ہے۔ مجھے بات کچھ اچھی لگ گئی تھی۔ میں جانتی تھی کہ میں ایک بہت اچھی یونیورسٹی ہوں۔ جہاں سے میں نے سیکھا وہاں کی مالک سزا رسٹران اکثر میری مہارت کی تعریف کیا کرتی تھیں بلکہ جب میرا کورس ختم ہوا اور میں وہاں سے ہٹا ڈیڈا اور سرٹیفیکیشن وغیرہ لینے لگی تو انہوں نے مجھے وہاں جاب کی بھی آفر کی تھی، جس پر میں نے ایک موقع ملنے کے بغیر انکار کر دیا تھا۔

سارہ کے مشورے کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے اس بارے میں سوچ بچار کی تو میرے ذہن میں اپنا ذاتی پارک رکھنے کا اختیار آیا۔ کسی کے پاس جاب تو ہم کسی کو نہیں سکتی تھی، کچھ تو ہم پر رحم چلائے۔ مجھ سے جواب ملتی کرے۔ یہ بات میں بھی برداشت نہیں نہیں تھی۔ اس لئے میں نے کسی پارلر میں جاب کرنے والے خیال کو فوراً ہی مسترد کر دیا تھا۔

جب میں نے اس کام کے تمام مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لے لیا تو پھر اسے گھر والوں کے سامنے رکھا۔ نتیجہ بہت ہی حوصلہ شکن تھا۔ اسی اور سارہ خاص طور پر مجھے مسلسل ڈرانے اور ہراساں کرنے میں لگی تھیں۔ ”جسے ہارنے کا ذہور، وہ ضرور ہارتا رہے۔ اگر کوئی کام شروع کرنے سے پہلے ہی ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم یہ کام ہی نہیں سکتے تو اس کا مطلب ہے پچاس فیصد شکست تو ہم نے خود ہی بڑی آسانی سے قبول کر لی ہے اور